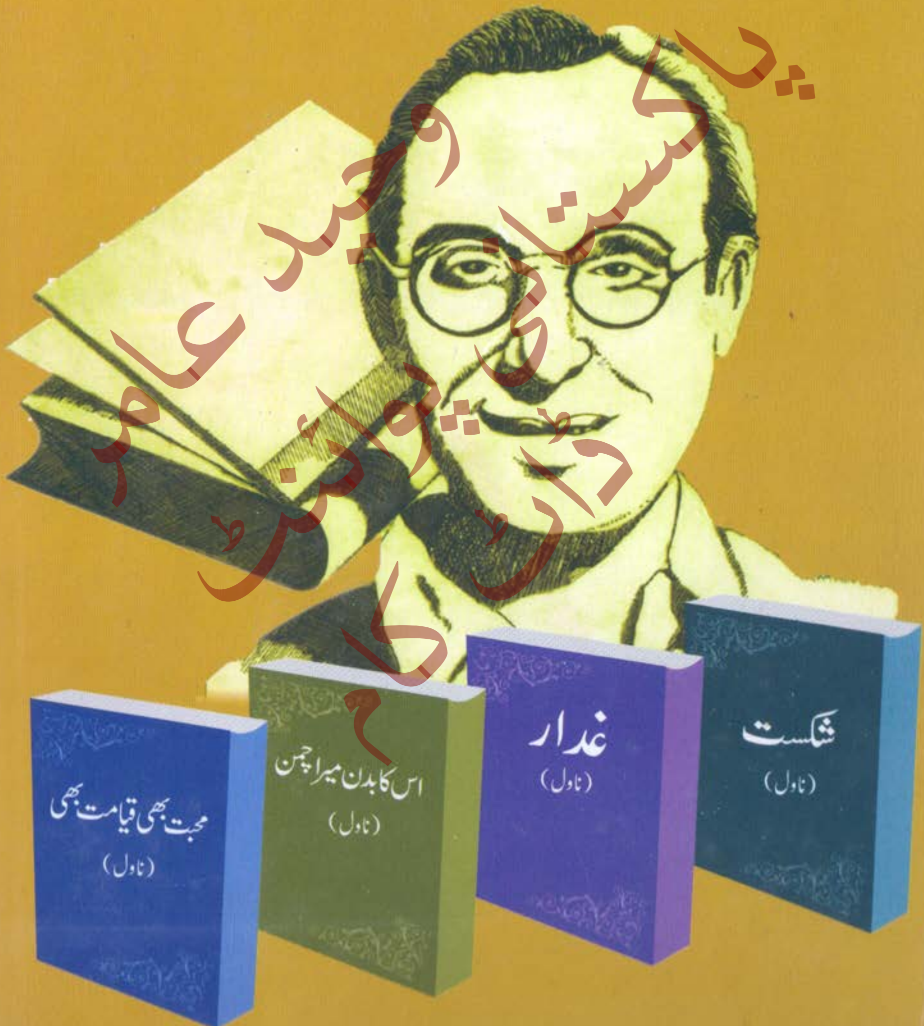
کرشن چندر

کے چار (۴) ناول



کرشن چندر کے چار (۴) ناول

ترتیب و انتخاب

طاہر منصور فاروقی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انارکلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

فہرست

غدار

(ناول)

پہلا باب

دو اگست ۱۹۴۷ء کو میں اپنے ننہال میں تھا۔ میرا ننہال لالے گاؤں میں ہے۔ لالہ گاؤں قلعہ سوبھا سنگھ سٹیشن کے قریب ہے۔ سٹیشن سے کوئی پون میل سوا میل کا فاصلہ ہوگا۔ لالے گاؤں میں ہم براہمنوں کی آبادی زیادہ ہے۔ اس کے بعد کھتریوں کے گھر ہیں۔ سب سے کم آبادی مسلمانوں کی ہے۔ میرا ننہال گورو گوسائیوں کا گھر کہلاتا ہے اور براہمنوں میں سب سے اونچا ہے۔ ہزاروں سال سے ہم لوگ اسی گاؤں میں آباد ہیں۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس سارے علاقے پر ہمارا راج تھا۔ اب بھی لالہ گاؤں کی سب سے اُونچی حویلی، محلاں، کہلاتی ہے۔ اُسے رمپال براہمنوں نے اپنے عروج کے زمانے میں تعمیر کیا تھا۔ حویلی کیا ہے، پرانے زمانے کا ایک قلعہ سا ہے: جس کے شمال مغرب میں ریتیلے ٹیلوں اور کلر کی ماری ہوئی بنجر زمینوں کا ایک سلسلہ چلا گیا ہے؛ جہاں صرف خاردار گھاس اُگتی ہے اور لمبے لمبے سرکنڈوں کے جھنڈ اپنی لانبی لانبی سفید خوشوں والی کلغیاں لہرائے زمین سے اُگتے ہیں اور جب ہوا سرسراتے ہوئے اُن میں سے گزرتی ہے تو وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں ڈولتے ہیں جیسے لق ودق صحرا میں شترمرغوں کے جھنڈ کے جھنڈ پر پھیلائے بھاگے جا رہے ہوں۔ مجھے سرکنڈوں کے جھنڈ بہت پسند ہیں۔ میں اور شاداں دوپہر میں، جب اُس کی اماں سو جاتی تھی، یہیں ملا کرتے تھے حالانکہ محلاں کی حویلی کے بڑے دروازے کے سامنے جو کچا پیہا جاتا تھا وہ کماد کے زرخیز کھیتوں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں اُن دنوں کماد کی فصل جوان اور قدآور ہو چکی تھی اور اُس کی سرسبز فصلیں بہت سے منچلے عاشقوں کو پناہ دیتی تھیں مگر مجھے اور

ٹاداں کو سرکنڈے کے جھنڈ ہی پسند تھے کیونکہ جب ہم باتیں کرتے کرتے خاموش
؛و جاتے تھے اور شاداں کے بھورے بالوں کی ایک لٹ اُس کے گورے ماتھے پر بکھر جاتی
تھی اور اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت اور اُداسی کے سائے الجھنے لگتے تھے تو اُس
وقت خاردار گھاس، کانوں اور سرکنڈوں میں گزرنے والی ہوا کچھ عجیب طریقے سے
ہمارے دلوں سے سرگوشیاں کرتی تھی اور اُس کی میٹھی مدہم صداؤں میں نادیدہ سپنوں کے
گھنگھرو بجنے لگتے تھے۔ اُس کی ریشمی سرسراہٹ میں اُن سندر کہانیوں کی بازگشت سنائی
دیتی تھی جب محبت ہر دیوار، ہر فصیل، ہر خلیج پھاند گئی تھی اور تاریک اُفق پر ایک رنگین دھنک
بن کر لہراتی تھی۔ سرکنڈوں میں تو ہوا باتیں کرتی ہے لیکن کماد کے کھیت میں تو یوں گھٹ کے
رہ جاتی ہے جیسے اُسے ہر لحظہ سماج کا اور مذہب کا اور پرانے اعتقادات کا ڈر ہو! اور جس جگہ
ہوا تک ڈرے ہواں عشق کیا پنپے گا؟ اس لیے ہم لوگوں نے سرکنڈوں کے جنگل میں پناہ لی
تھی جن کی سفید ریشمی کلغیاں پتلے لانبے نازک تنوں کے اوپر کھڑی ہمارے عشق کی طرح
مغرور نظر آتی تھیں۔

دو اگست کی دوپہر کا ذکر ہے۔ ہمارے پیچھے سرکنڈوں کا جنگل تھا اور جنگل کے
پیچھے ہمارا گاؤں تھا اور ہمارے سامنے دور تک پھیلی ہوئی میلوں بنجر زمین تھی جسے کلر نے مار
دیا تھا۔ صبح بارش ہو چکی تھی لیکن آسمان پر سفید بادل مرغوں کی طرح سینہ پھیلائے اپنے
پوٹے میں بارش کے دانے چھپائے اب بھی کہیں کہیں چل رہے تھے۔ ہوا میں پانی کی نمی
تھی اور مٹی کی سوندھی سوندھی مہک۔ اور دور مغربی اُفق پر روشنی کچھ ایسی ہلکی تھی، اتنی شفاف
تھی گویا ابھی پگھل کر کسی قوس قزح کو جنم دے گی۔

میرا ہاتھ شاداں کے ہاتھ میں تھا اور ہم دونوں اس اُفق کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے
اُمید ایک مسافر ہو اور اُسی شفاف راستے سے ادھر آنے والی ہو۔

میں نے شاداں کا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور اُس سے کہا: ”ایک دن تم مجھے بھول
جاؤں گی!“

شاداں کے سینے میں ایک آہ اُبھری مگر وہ خاموش رہی۔ اُس نے اس سوال کا کوئی
جواب نہ دیا، اور وہ اس سوال کا جواب بھی کیا دیتی جو ابتدائے آفرینش سے عورت مرد سے

اور مرد عورت سے پوچھتا چلا آیا ہے؟

کتنا پرانا سوال ہے لیکن ہر بار کتنا نیا معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے آج پہلی بار پوچھا گیا ہے۔

میں نے پھر کہا: ''ایک دن تمہاری شادی ہو جائے گی۔''

''ہاں۔ میری شادی ہو جائے گی۔ اور بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح تمہاری ہو چکی ہے۔''

اُس نے آہستہ سے، میری طرف دیکھے بغیر، کہا۔ اُس کی نگاہیں ابھی تک اسی اُفق پر گڑی تھیں۔

''میری شادی تو میرے ماں باپ نے بچپن ہی میں کر دی تھی۔'' میں نے احتجاجاً کہا۔

شاداں بولی: ''اور تم کیا سمجھتے ہو میں اپنی مرضی سے شادی کر سکوں گی؟''

میں نے سر جھکا لیا۔

شاداں نے اُفق سے نگاہیں ہٹا لیں۔ جیسے وہاں سے مایوس ہو چکی ہو۔ پھر اُس نے میرے جھکتے ہوئے اُداس چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کے اونچا کیا۔ پھر اُس نے اپنے گالبی رخسار میرے رخساروں سے لگا دیئے اور دھیمے دھیمے بڑے پیار اور مضبوطی سے بولی:

''یوں تو میری شادی بھی ہو جائے گی اور بچے بھی ہوں گے میرے اور میں اُن کے لیے ایک اچھی ماں، اپنے خاوند کے لیے ایک نیک اور اطاعت شعار بیوی بھی بن جاؤں گی اور میرا گھر ہوگا اور زندگی کی ساری خوشیاں جو ایک عورت چاہتی ہے وہ مجھے نصیب ہوں گی مگر کہیں پر میرے اندر، میرے بہت گہرے اندر اور میری کوکھ سے بھی بہت دور اندر، جہاں کہیں عورت کی روح رہتی ہے، وہاں تم ہمیشہ موجود رہو گے!''

''تم مجھے یاد کرو گی؟''

شاداں کچھ کہنے والی تھی کہ اتنے میں دور کہیں سرکنڈوں کے جھنڈ میں سرسراہٹ ہوئی اور وہ ایک دم خاموش ہو گئی، اور ہم دونوں اس سرسراہٹ کو سانس روک کر سننے لگے. فکر اور حیرت کے ساتھ۔ کیونکہ اس وقت اِدھر کوئی نہ آتا تھا۔

سرسراہٹ جب قریب آنے لگی تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دبے پاؤں چل کر جھنڈ کے دوسری طرف ہو گئے۔

یکا یک سرسراہٹ ایک خاص جگہ پر چل کر رک گئی، پھر کسی نے کہا:

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔''

شاداں نے دوسری آواز پہچان لی۔ وہ چیخ مارنے ہی والی تھی کہ میں جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسری آواز میں نے بھی پہچان لی تھی۔ یہ اُس کے بھائی طفیل کی آواز تھی۔ طفیل اور شاداں دونوں لاہور کالج میں پڑھتے تھے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں، اپنے گاؤں میں، آئے ہوئے تھے۔

پہلی آواز والے مرد نے کہا: ''مجھے چھت تارہ سے پیر قلندر شاہ نے بھیجا ہے۔''

''وہی زبر گنج والے پیر قلندر شاہ۔''

''کیا پیغام ہے؟''

''وہ پیغام نمبردار سربلند کے نام ہے۔''

''میں سربلند کا بیٹا طفیل ہوں۔''

نووارد کچھ دیر تک چپ رہا، پھر آہستہ سے بولا:

''پیر قلندر شاہ نے کہلوایا ہے آپ لوگوں نے ابھی تک لالہ گاؤں میں وہ سلسلہ شروع نہیں کیا ہے۔ یہ غلط بات ہے۔ پندرہ اگست کی رات تک سب فیصلہ ہو جانا چاہیے۔''

''کیسا فیصلہ۔''

''پیر قلندر شاہ نے کہا ہے پندرہ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو جوان ہیں اُن سب کو قتل کر دیا جائے۔ جتنی جوان عورتیں ہندوؤں کی یہاں پر اکٹھی ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں یا آس پاس کے علاقوں سے آ رہی ہیں اُن سب کو رکھ لیا جائے۔ البتہ بڈھے مردوں، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جائے۔''

شاداں میرے سینے سے زور سے لگ گئی۔ ہم دونوں کے دل دھک دھک کرنے

لگے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زور سے ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد طفیل بولا: ''ایک پیغام میرے باپ نے بھی تمہارے پیر قلندر شاہ کے نام دیا ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' نووارد بولا۔

''میرے باپ نے کہا ہے یہ کام ہم سے نہ ہوگا۔ صدیوں سے ہم لوگ اسی گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں، ہم سے یہ کام نہ ہوگا۔''

''اس صورت میں ہم چک تارہ والے خود آ کے یہ کام کریں گے۔'' نووارد نے طفیل کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ طفیل چپ رہا۔ بہت دیر تک سرکنڈوں کے جنگل میں خاموشی رہی۔ آخر نووارد نے سکوت توڑتے ہوئے کہا: ''اچھا تو میں جاتا ہوں۔''

دو انسانوں کے قدم سرکنڈوں کے جنگل میں الگ الگ سمت کو گھومے اور ہم سے دور ہوتے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جنگل میں سناٹا چھا گیا۔

میں نے جلدی سے شاداں کو اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا: ''اب تم فوراً گھر چلی جاؤ۔''

وہ زور سے میرے سینے سے چمٹ کر بولی:

''نہیں نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ جہاں تم جاؤ گے وہاں جاؤں گی!''

میں نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے مسکرا کر کہا: ''تم نے سب کچھ سن لیا ہے نا؟''

''نہیں نہیں۔'' وہ متوحش نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: ''وہ ایسا نہیں کر سکتے!...... سچ! وہ ایسا نہیں کر سکتے!! ہم سب لوگ تو اسی دھرتی کی اولاد ہیں۔''

''دھرتی تو کبھی زہر نہیں اُگلتی شاداں۔ دھرتی سے تو ہری ہری کونپلیں ہی پھوٹتی ہیں۔ لیکن تم نے دیکھا ہوگا کہ جب باہر کی مسموم ہوائیں چلنے لگتی ہیں تو آن کی آن میں ہری بھری کھیتیاں اجڑ جاتی ہیں! اس میں دھرتی کا کیا قصور؟''

شاداں نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُسے اپنے آپ سے الگ کرتے ہوئے کہا: ''تم جلدی سے گھر جاؤ ورنہ غضب ہو جائے گا۔ سینکڑوں بار ملنے پر بھی جس چیز کا فیصلہ نہ ہو سکا

اُس کا آج کیا راستہ نکلے گا۔ وہ لوگ بہت چالاک ہیں شاداں۔ وہ لوگ جو ہمارے ملک کے ٹکڑے کرنے جا رہے ہیں سب سے پہلے اُنہوں نے ہمارے دل کے ٹکڑے کیے تھے! تقسیم تو پہلے دلوں ہی سے شروع ہوئی ہے!''

''یہ بات تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟'' شاداں شکایتاً بولی۔

''تم سے نہیں، شاید یہ بات میں اب سرکنڈوں کے جنگل سے کہہ رہا ہوں۔ اُس راستے سے کہہ رہا ہوں جہاں اُمید کبھی میرے لیے مسافر بن کر نہ آئے گی! اب تم جلدی سے اپنے گھر جاؤ۔ میں محلاں میں جا کے خبر کرتا ہوں!''

شاداں روتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے محلاں میں جا کے سب کو خبر کر دی۔ کئی دنوں سے لالے گاؤں میں آس پاس کے گاؤں سے براہمنوں اور کھتریوں کی بیاہتا لڑکیاں جمع ہو رہی تھیں۔ یہ خبر سنتے ہی ایک کہرام مچ گیا۔ تھوڑی دیر میں نمبردار سربلند دوڑتا دوڑتا ہمارے گھر آیا۔ وہ میری نانی ماتا ایشر کور کی بڑی عزت کرتا تھا۔ میری نانی گاؤں کی سب سے بڑی بوڑھی تھیں اور گاؤں میں کیا ہندو، کیا مسلمان، کیا سکھ، کوئی اُنکا کہا نہ ٹال سکتا تھا۔ اُن کی عمر پچاسی برس کی تھی مگر وہ تقریباً سو برس کی نظر آتی تھیں۔ اُنہوں نے آتے ہی نمبردار کو آڑے ہاتھوں لیا:

''وے سربلند۔'' نانی نے نمبردار کو گالی دے کر کہا، ''تیرے سر میں خاک! یہ میں کیا سنتی ہوں؟''

سربلند نے آ کے ماتا ایشر کور کے پاؤں چھوئے، بولا: ''اماں! ہم تیرے بیٹے ہیں۔ چک تارہ والے ہمارے جیتے جی اس گاؤں کی بہو بیٹیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے! بستی کے سارے مسلمانوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے!''

سوکھتے ہوئے ہونٹوں پر خوشی کی مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔ ماتا ایشر کور جانتی تھیں کہ نمبردار سربلند کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اُنہیں اطمینان ہو گیا، اور جب اُنہیں اطمینان ہو گیا تو سب کو اطمینان ہو گیا۔ بندھے ہوئے بستر پھر کھول کر ڈالے گئے۔ پوٹلیوں کا سامان باہر نکالا گیا۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں چولہے چکی میں لگ گئیں اور جوان بہوئیں آئینہ دیکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگانے لگیں اور اپنی خوبصورتی پر خود ہی شرما کر گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپنے لگیں!

دو تین دن اطمینان سے گزرے۔ کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔ ہندو مسلمان مل کر گاؤں کے اِردگرد پہرہ دیتے تھے۔ پریشانی کی بات تھی تو یہی تھی کہ لالے گاؤں میں آس پاس کے علاقوں سے براہمنوں اور کھتریوں کے خاندان پناہ لینے کے لیے برابر چلے آرہے تھے۔ کہیں پر کوئی جھگڑا نہ ہوا تھا لیکن، جیسے طوفان کی آمد سے پہلے پرندے ہوا سونگھ کر اپنے گھونسلے چھوڑ کر مخالف سمت کو اُڑنے لگتے ہیں، اسی طرح سے چاروں طرف سے لالے گاؤں میں ہندوؤں کے قافلے اُمڈ چلے آرہے تھے۔

پانچ اگست کی شام کو گاؤں چک تارہ کی طرف سے ڈھول پیٹے جانے لگے۔ ڈھولوں کی آواز بلند تر اور قریب تر ہوتی گئی۔ محلاں کے اندر عورتیں چیخیں مار کر رونے لگیں۔ بہت سی عورتیں بیہوش ہوگئیں۔ بچوں بالوں نے رو رو کر کہرام مچا دیا۔ عین اسی وقت نمبردار سربلند نے آکر کہا: ''چک تارہ سے پانچ سو مسلمانوں کا جتھا آرہا ہے۔ ہم لوگ مداخلت کرنے والے کل پچاس مسلمان ہیں۔ میں اب آپ کو بچا نہیں سکتا۔ آپ لوگ اپنی اپنی فکر کیجیے۔''

سربلند کے جانے کے بعد وہ بھگدڑ مچی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ماں بیٹی کو بھول گئی اور بیٹی باپ کو اور باپ اپنی اولاد کو۔ جدھر جس کے سینگ سمائے محلاں سے بھاگ کر چل دیا۔ تھوڑی دیر میں محلاں کی عالی شان حویلی ویران تھی۔ صرف ایک اندھیرے کونے میں نانی پلنگ پر چپ چاپ لیٹی تھیں۔ جب میں اُن کی پائینتی کے قریب آکر کھڑا ہوا تو وہ بولیں:

''وے متھے سڑیا تو نئیں گیا؟''

''نانی ماں میں تمہیں لے کے جاؤں گا۔''

''کیسے لے کے جائے گا۔ میں تو چل نہیں سکتی۔''

''میں تمہیں اپنے کندھے پر بٹھا کر لے جاؤں گا۔''

''جب میرے اپنے بیٹے مجھے نہیں لے گئے تو تو کیا لے جائے گا!'' بوڑھی نانی آبدیدہ ہوکر بولیں۔

''میں لے جاؤں گا۔'' میں نانی کے قریب گیا تاکہ اُنہیں اپنے کندھے پر اُٹھالوں۔

''خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا! مجھے یہیں رہنے دے!''

ڈھولوں کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔

"مگر نانی ماں یہ آواز نہیں سنتی ہو۔ وہ لوگ قریب آ رہے ہیں۔"

"میں ذرا اونچا سنتی ہوں۔" نانی ماں بولیں۔

"اور بھگوان کرے جو میں سنتی ہوں وہ کبھی نہ سن سکوں۔ تم مجھے یہیں چھوڑ دو اور چلے جاؤ۔ وہ مجھے کچھ نہ کہیں گے۔ پیر قلندر شاہ! ہونہہ، پیر قلندر شاہ کا بچہ، وہ آئے تو ذرا میرے سامنے؟ جب وہ پیدا بھی نہ ہوا تھا، جب اُس کی ماں کا بیاہ ہوا تھا، میں خود چک تارہ گئی تھی اور اُس کی ماں کو شادی کا جوڑا شگن میں دیا تھا۔ وہ آئے تو سہی میرے سامنے؟"

"مگر نانی ماں!"

"تم چلے جاؤ۔ میں تم سے کہتی ہوں اپنا خون میرے سرمت چڑھاؤ۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکتی!"

نانی ماں نے پلٹ کر پلنگ پر کروٹ لے لی اور میری طرف پیٹھ کر لی، اور میں سر جھکا کر محلاں سے باہر نکل گیا......

بڑے دروازے سے باہر نکل کر میں پیپے پر ہولیا جو کماد وں کے بیچ میں جاتا تھا۔ یکا یک مجھے کچھ یاد آیا اور میں پیپے سے پلٹ کر محلاں کے دوسری طرف چلا گیا، جدھر سرکنڈوں کے جھنڈ تھے۔ اب ڈھولوں کی آواز کے ساتھ ساتھ اللہ اکبر کے نعروں کی آواز بھی صاف صاف سنائی دینے لگی تھی۔ اللہ اکبر یعنی خدا بہت بڑا ہے؛ اور انسان بہت چھوٹا ہے؛ تنگ نظر، کمینہ اور نفرت کا بندہ ہے اور تہذیب کے اُونچے سے اُونچے منارے پر چڑھ کر بھی وہ اپنی یہ فطرت کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا کیونکہ وہ محض ایک انسان ہے، خدا نہیں ہے۔ اس لیے میں نے ان نعروں کو کوئی اہمیت نہ دی اور آخری نظر ڈالنے کے لیے سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا جہاں میں اور شاداں دوپہر میں بیٹھا کرتے تھے لیکن اب وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے بڑی حسرت سے اس جگہ کو دیکھا۔ یوں تو اُس جگہ میں کوئی خاص بات نہ تھی؛ ایک ریتلا سا ٹیلا تھا جہاں ہم دونوں بیٹھا کرتے تھے۔ سامنے بنجر زمین تھی۔ افق مٹیالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں کچھ بھی تو نہ تھا۔ لہلہاتے ہوئے پیڑ، خوبصورت پھول، رنگین شفق، آبشار، پہاڑ، پانی، جھیل...... کچھ بھی نہ تھا جن سے اس زمین پر

شاعری ہوتی ہے۔ پھر بھی یہ جگہ جنت کا ٹکڑا کیوں معلوم ہوتی تھی؟

''شاداں! شاداں!!'' میں نے آہستہ سے آواز دے کر کہا، ہمارے ملنے کا یہی قاعدہ تھا۔ وہ آگے سرکنڈوں میں چھپ جاتی تھی اور جب میں آتا تھا تو اُسے آواز دیتا تھا اور وہ سرکنڈوں سے نکل کر میرے گلے سے لگ جاتی تھی! مجھے معلوم تھا وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، پھر بھی میرے ضدی دل نے پکارا:

''شاداں! شاداں!''

مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ جھنڈ خاموش کھڑا تھا۔ سرکنڈوں کی کلغیوں پر شام کی سیاہی بکھرتی جا رہی تھی۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور قلعہ سوبھا سنگھ کے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑنے لگا۔ اگر میں رات کے ساڑھے آٹھ بجے کی گاڑی پکڑ کر نارووال چلا جاؤں تو مجھے نارووال سے لاہور جانے والی Connecting ٹرین مل جائے گی! لاہور میں میرے پتا جی رہتے تھے!

کوئی پون گھنٹے کے بعد میں چکر کاٹ کے قلعہ سوبھا سنگھ کے اسٹیشن پر پہنچا تو تاریکی خاصی بڑھ چکی تھی۔ سٹیشن کے قریب بڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے درجنوں ڈال زمین پر لٹکے ہوئے تھے۔ یہاں پر بہت اندھیرا تھا اور اندھیرے میں عجیب طرح کے سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ہر قدم پر موت نظر آتی تھی۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھ گیا۔ یکا یک ایک سایہ بڑ کے ایک ڈال کے پیچھے سے مجھ پر لپکا۔ میں نے پلٹ کر مدافعت کے لیے اپنا ہاتھ اُٹھا لیا تو شاداں بھاگتی ہوئی میری بانہوں میں آ گئی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کی قمیص کی آستین پھٹی ہوئی تھی اور وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

اُس نے جلدی جلدی سے کہا: ''میں نے طفیل سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں لاہور حفاظت سے پہنچا دے گا۔''

''طفیل مجھے جان سے نہیں مار دے گا؟''

''نہیں۔ کیونکہ میں نے اُس سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں اُس کے دوست آفتاب سے شادی کر لوں گی جو ایک مدت سے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے!'' وہ جلدی جلدی

گھبرائی ہوئی کہہ رہی تھی اور اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

"مگر طفیل کہاں ہے؟"

"سامنے اسٹیشن پر تمہارا راستہ دیکھ رہا ہے۔ لاہور پہنچ کر وہ تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا خط میرے نام لائے گا۔ اگر وہ خط نہ لایا تو اپنی جان لے لوں گی!" یکا یک وہ رک گئی......

پھر ایک سرد آہ بھر کر بولی: "اب تم جاؤ!"

یکا یک جیسے زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی ہو۔ یکا یک میرے ٹانگوں نے جواب دے دیا اور میں وہیں زمین پر بیٹھ کر شمشاد کی ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگا۔

"میں کیسے جاؤں؟ تجھے چھوڑ کر کیسے جاؤں! شاداں! نہیں میں نہیں جاؤں گا۔"

وہ بولی: "اُٹھو، یاد کرو۔ تمہارے بیوی اور بچے ہیں، ماں اور باپ ہیں، بہنیں اور بھائی ہیں......اُن سب کی حفاظت تمہارے ذمے ہے!"

"جہنم میں جائیں سب لوگ!" میں نے روتے ہوئے کہا،

میں یہیں رہوں گا۔ میں مسلمان ہو جاؤں گا اور تم سے شادی کرلوں گا!"

"پھر میں تمہاری عزت نہیں کروں گی!" شمشاد نے آہستہ سے کہا۔ پھر وہ جھکی اور اُس نے بڑے پیار سے مجھے زمین سے اُٹھالیا اور ایک بچے کی طرح مجھے اپنے سینے سے لگالیا اور اپنی نرم ہتھیلیوں سے میرے آنسو پونچھنے لگی، اور اُس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نگاہیں مجھ سے کہہ رہی تھیں:

"آؤ! آج آخری بار میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے آنسو پونچھ دوں کیونکہ اس کے بعد تمہارے آنسوؤں سے میرے ہاتھ کبھی گیلے نہ ہوں گے۔ زندگی بھر تم میرے لیے روتے رہو گے اور زندگی بھر میں تمہارے لیے روتی رہوں گی، اور ہمارے بہتے ہوئے آنسو سات سمندر بن کر ہمیں ایک دوسرے سے دور کردیں گے مگر اس دوری کے باوجود مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس خوبصورت اداؤں والی زندگی میں تم خوبصورتی اور محبت اور شفقت کے ہر مہربان موڑ پر مجھے یاد آؤ گے۔ شام کے جھٹپٹے میں جب میں اپنے پیارے شوہر کو گرم گرم کھانا کھلاؤں گی تو تمہیں یاد کروں گی، اور رات کی تنہائی میں جب اپنے بچے کو سینے سے لگا کر اُسے لوری دوں گی تو تمہیں یاد کروں گی، اور جب سب ختم ہو جائے گا، جب زندگی

کے سارے فرض پورے ہو جائیں گے، جب موت میری پلکوں کو آخری بار چھونے کے لئے آئے گی اُس وقت بھی میں تمہیں یاد کروں گی، اور میرے آخری سانس میں، دل کی آخری دھڑکن میں اور ہونٹوں کی آخری جنبش میں تم دعا بن کر آجاؤ گے اور میری روح میں سما جاؤ گے!"

"یاد...... یاد...... یاد اگر دولت ہوتی اور آج دنیا میں کوئی غریب نہ ہوتا! محبت کے لیے کوئی ترستا نہ رہتا!" شمشاد نے خود ایک بار مجھ سے کہا تھا۔ مگر آج میں نے اُسے اپنے آنسو پونچھنے دیے۔ اُس کے گلے سے لگ کر اُسے پیار کر لیا اور پھر اپنا ہاتھ اُس سے چھڑا کر اسٹیشن کی طرف بھاگا کیونکہ گاڑی آؤٹر سگنل کے قریب آچکی تھی۔

اسٹیشن کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے میں نے مڑ کر دیکھا: بڑ کے سایوں میں شاداں چپ چاپ کھڑی تھی اور دور پرے محلاں کی حویلی میں ڈھول گونج رہے تھے اور محلاں سے پرے ہمارا سرکنڈوں کا جنگل جل رہا تھا!

دوسرا باب

لاہور اسٹیشن پر پہنچا کر طفیل نے مجھے کہا: ''سور دے پتر بد تخمے براہمن اگر شاداں نے مجھ سے قسم نہ لی ہوتی تو میں گاڑی ہی میں تجھے ختم کر دیتا۔ لے اس کاغذ دے پرزے تے خیریت دی خبر لکھ دے۔ ہور کچھ نہ لکھنا۔ نئیں تے گردن اُڑا دیوں گا!''

میں نے ڈرتے ڈرتے شاداں کو پنسل سے لکھا:

شاداں تیرے بھائی نے مجھے لاہور تک خیریت سے پہنچا دیا ہے۔ جب تک زندہ رہوں تیرا احسان مانوں گا!

بیج ناتھ

طفیل نے آخری فقرہ پنسل سے کاٹ دیا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر اُس نے کاغذ تہ کر کے جیب میں ڈالا اور میری طرف دیکھ کر شدید دھمکی آمیز لہجے میں بولا؛ ''لے، اب بھاگ جا، میری نظر سے دور ہو جا۔ تجھے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُترتا ہے۔ کتیا باہمنا!''

میں جلدی سے اُس سے الگ ہو گیا اور اسٹیشن سے باہر آ کر تانگے میں بیٹھ گیا اور تانگے میں بیٹھ کر شاہ عالمی آیا۔ شاہ عالمی کے دروازے پر تانگے والے نے مجھے اُتار دیا۔ وہ شاہ عالمی کے اندر جانے سے انکار کرتا تھا۔ چنانچہ میں پیدل ہی اندر کو ہولیا اور سرکی بنداں دی گلی سے ہو کر سوتر منڈی میں اپنے گھر کی طرف چلا۔ یہاں راستے میں ایک لڑکا کبھی میرے آگے کبھی میرے پیچھے چلنے لگا۔

میں نے اُس سے کہا؛ ''میں جو اکیلا یہاں گھوم رہا ہوں میں بھی تیار ہوں۔ بس اتنا سوچ لینا!''

میری یہ بات سن کر وہ لڑکا رفو چکر ہو گیا اور میں اپنے گھر کی جانب گھوم گیا۔ گھر جا کر دیکھا تو دروازے پر تالا پڑا ہے۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ ماں نہ باپ، بھائی نہ بہن۔ بیوی بچے سب غائب تھے، اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں کیونکہ آس پاس کے سب گھروں پر تالے پڑے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اب میں جاؤں تو کہاں جاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایسی مصیبت میں آنسو بھی نہیں آتے، بس حلق خشک سا ہونے لگتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے منہ کا لعاب اندر نگلا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر گلی کی ایک شکستہ موری کا ایک پتھر اُٹھا کے اس سے گھر کا تالہ توڑ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔

گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ سب قیمتی سامان غائب تھا۔ وہ لوگ کام کا سب سامان لے گئے تھے۔ میں نے کچن میں جا کے دیکھا۔ برتن تو تھے مگر کھانے کی کوئی شے نہ تھی۔ میں نے نل کھول کر پانی پیا اور پھر اُوپر کی منزل میں ایک چار پائی پر دراز ہو گیا۔ رات بھر میں اوپر کی منزل میں کبھی سوتا رہا کبھی جاگتا رہا۔ رات میں کبھی تو ایسا سناٹا ہو جاتا جیسے اس شہر کے سارے لوگ مر گئے ہوں، کبھی ایسی چیخیں سنائی دیتیں جیسے عالمِ نزع میں بکرے چیخا کرتے ہیں۔ کہیں پر گولیوں کی آواز سنائی دیتی۔ چاروں طرف پٹاخے سے چھوٹنے لگتے پھر یکا یک قبر کی سی خاموشی چھا جاتی۔

ایک دن اور ایک رات میں اپنے گھر میں چھپا رہا۔ آخر جب بھوک نے بہت زور مارا تو پھر باہر نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ چلتے چلتے میں سوتر منڈی سے لوہاری گیٹ، لوہاری گیٹ سے بھاٹی گیٹ، بھاٹی گیٹ سے بادشاہی مسجد کی طرف آ گیا۔ کیوں آ گیا؟ یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ وہاں سے ہیرا منڈی چلا گیا۔ ہیرا منڈی میں انور کباب والے سے کباب لے کے کھانے لگا۔ انور کباب والے نے مجھے پہچان لیا۔ اُس نے مجھے آنکھ ماری مگر کچھ کہا نہیں کیونکہ دو تین مشتبہ قسم کے مسلمان اُس کی دکان سے کباب لے رہے تھے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو اُس نے گھبرا کر مجھ سے کہا؛

''پنڈت جی! آپ یہاں کہاں؟ خدا کے لیے بھاگ جائیے!''

''کہاں جاؤں؟''میں نے بڑی مایوسی سے پوچھا۔

انور نے نا اُمیدی سے سر ہلایا۔ پھر یکایک اُس کی سمجھ میں کچھ آ گیا، بولا، ''ارے آپ کے دوست میاں، حاجی اور برک، تاجی کے ہاں گانا سن رہے ہیں۔ آپ وہاں چلے جایئے۔''

میں نے میاں کا نام سن کر انور سے زور کا مصافحہ کیا۔ ارے مجھے اس مصیبت میں میاں یاد ہی نہ رہا! میاں کی اور میری گاڑھی چھنتی تھی۔ میاں، حاجی، برک اور میں روز رات کو چوکڑی جماتے تھے۔

میں عقب کی سیڑھیاں اُوپر چڑھ کر دوسری منزل پر تاجی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اندر حاجی، برک اور میاں بیٹھے پی رہے تھے اور تاجی ہار سنگھار کیے، چودھویں کا چاند بنے، گا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ حاجی کا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا مگر کمال ہے اور شاباش ہے میاں کے کہ وہ اُٹھ کر میرے گلے سے لپٹ گیا اور برک نے بھی میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

میاں نے پوچھا: ''کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے اُسے ساری بپتا کہہ سنائی۔

تاجی بولی: ''آپ پنڈت جی کو یہاں سے لے جایئے۔ اگر کچھ ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوں۔''

میں نے تاجی کے بھائی سے تہمد مانگا اور ایک قراقلی مستعار لی اور مجھے پہنائی۔ پھر ہم سب لوگ تاجی سے رخصت ہو کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے اور اُترتے ہی میاں کی کار میں بیٹھ گئے۔ میاں نے تیزی سے اپنی گاڑی چلائی اور بھارت نگر میں مجھے اپنے گھر لے آیا۔ بھارت نگر میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی میاں کی دو منزلہ کوٹھی تھی۔

جب میں نے بھابھی کو آداب کیا تو وہ بھونچکی سی رہ گئی، کچھ بولی ہی نہیں، چپ چاپ مجھے دیکھنے لگی؛ جیسے کسی انسان کو نہیں کسی مردے کو دیکھ رہی ہو۔ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا کیونکہ دس برس تک میری اور میاں کی میٹل پینٹ کی کمپنی میں حصے داری رہی تھی اور گو اب میں نے اُس سے الگ ہو کر اپنی پبلشنگ کمپنی کھول لی تھی مگر ہم دونوں کے دل کبھی

الگ نہ ہوئے تھے اور دونوں گھروں میں سگے عزیزوں اور رشتے داروں کی طرح بیوپار ہوتا تھا اور شادی بیاہ میں، دکھ سکھ میں سگے عزیزوں کی طرح بھاجیاں تقسیم ہوتی تھیں۔ اس لیے اس وقت بھابھی کا اُترا ہوا چہرہ اور پھیکا، بے مزہ سلوک دیکھ کر میرا دل اندر سے بیٹھ گیا مگر میں نے اپنی مایوسی کو اپنی مسکراہٹ میں چھپا لیا۔ پھر میاں جلدی سے مجھے وہاں سے اوپر کی منزل کے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ حاجی اور برک بھی ہمارے ساتھ تھے۔

اوپر پہنچ کر میاں نے اطمینان کی سانس لی۔ میری قراقلی اُتار کر تپائی پر رکھ دی اور سر ہلا کر بولا:

"غضب کر دیا تم نے بیج۔ ایسے موقعوں پر لاہور آئے ہو جب محلے محلے میں آگ اور فساد سے خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ہندو مسلمان کی جان کا اور مسلمان ہندو کی جان کا پیاسا ہو رہا ہے۔"

میں نے میاں سے کہا: "ارے چھوڑو یار۔ ہمیں ہندو مسلمانوں سے کیا لینا۔ شراب منگاؤ۔"

میاں نے وہسکی کی بوتل کھولی۔ ہم چاروں بیٹھ کر پینے لگے۔ ہم چاروں کئی سالوں کے پینے والے تھے۔ اکٹھے پینے والے تھے۔ اکٹھے گانا سننے والے تھے، اکٹھے داد نشاط دینے والے تھے مگر آج رنگ ہی نہیں جما۔ کسی کی ہنسی میں وہ بات ہی نہ تھی۔ بیچ بیچ میں خاموشی کے ایسے لمبے وقفے آئے تھے کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ مجھے ہزاروں شعر شاعروں کے یاد تھے اور میرا گلا بھی اچھا تھا مگر آج کسی کو کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔ محفل اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ کبھی کبھی حاجی مجھے ایسی نگاہوں سے گھورتا کہ مجھے اپنے گلے پر چھری چلتی ہوئی معلوم ہوتی۔ حاجی میرا بھی بہت یار تھا مگر کبھی کھل کے طبیعت نہیں ملی اُس سے۔ بیچ میں ہمیشہ ایک دیوار سی تھی۔ میاں اور برک کے ساتھ میں نے کبھی اس طرح محسوس نہیں کیا۔ شراب کے دور جب چلتے تھے تو بیچ بیچ میں مجھے حاجی کی طنزیہ مسکراہٹ عجیب طریقے سے پریشان کر دیتی تھی۔

ہونہہ! ہو سکتا ہے میرا اوا ہمہ ہو۔ حاجی میرا برسوں کا دوست ہے! آج تک کوئی ناروا بات اُس نے مجھ سے نہیں کی۔ مجھے معلوم ہے در پردہ وہ میری اور میاں کی دوستی سے جلتا

ے کیونکہ حاجی بھی میاں کو بہت چاہتا تھا اور برک بھی۔ لیکن میاں کو تو ساری دنیا چاہتی تھی۔
اُس کا بے فکرا کھلنڈرا پن، اُس کی دولت، اُس کی فیاضی، اُس کی بے ریا محبت ہر ایک کو
یہاں سے محبت کرنے پر مجبور کرتی تھیں۔ لیکن میاں اپنے دوستوں میں صرف مجھے سب
سے زیادہ چاہتا تھا۔ میاں کے دوسرے دوستوں نے تو مجھے قبول کر لیا تھا مگر حاجی کے متعلق
مجھے ہمیشہ سے یہی خیال رہا کہ اُس نے دل سے کبھی اس حقیقت کو قبول نہیں کیا ہے۔

کوئی دس بجے کے قریب حاجی نے اجازت چاہی۔ میاں نے اُسے رکنے کے
لیے کہا مگر وہ اصرار کر کے اُٹھ گیا۔ برک بیٹھا رہا مگر حاجی کے جانے کے آدھے گھنٹے یا پون
گھنٹے کے بعد وہ بھی معذرت کر کے اُٹھ گیا۔

حاجی اور برک کے چلے جانے کے بعد میں نے، میاں نے، بھابھی نے اور اُن
کے دو بچوں طارق اور تسلیم نے کھانا کھایا۔ طارق کی عمر آٹھ سال کی ہے اور تسنیم کی چھ سال
کی۔ دونوں مجھے چاچا کہتے ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد میں دیر تک طارق اور تسنیم کو کہانیاں سناتا رہا۔ کوئی گیارہ
بجے کے قریب دونوں بچے وہیں کہانیاں سنتے سنتے صوفے پر سو گئے اور ہم لوگ اُنہیں
سوئے ہی میں اُٹھا کر اُن کے کمرے میں لے گئے اور اُنہیں سلا آئے۔

اس کے بعد میاں نے اپنی بیوی سے کہا: ''آج میں بیچ کے کمرے میں اُوپر کی
منزل میں سوؤں گا۔''

اُس کی بیوی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ہم لوگ اُٹھ کر اُوپر کی منزل کے بیڈ روم
میں آ گئے۔ میں جانے کتنی راتوں کا جاگا ہوا تھا، بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا
ہوا، کیا نہیں ہوا۔ کبھی کبھی خواب کے عالم میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لوگ میاں کا دروازہ
پیٹ رہے ہیں، جیسے لوگوں کا ہجوم میاں کے دروازے پر چلا رہا ہے، جیسے کوئی کھسر پھسر
کر رہا ہے...... پھر جیسے کوئی زور زور سے رو رہا ہے۔

پھر یکایک میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے دیکھا تو میاں اپنے بستر پر موجود نہ تھا۔ کمرے میں چاروں طرف خاموشی
تھی۔ کہیں سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ میں نے غسل خانہ کھول کے دیکھا، میاں اس میں بھی

نہ تھا۔ میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا تا کہ آہٹ نہ ہو اور ننگے قدموں چل کر کمرے سے
باہر کی سیڑھیوں پر پہنچا۔

یوں تو چاروں طرف خاموشی تھی مگر رات کے سناٹے میں نیچے کی منزل سے باتوں
کی آواز آ رہی تھی۔

میں دبے قدموں نیچے اُتر گیا۔

میاں اپنی بیوی کے کمرے میں تھا۔ کمرے کا پٹ تھوڑا سا کھلا تھا۔ میں دیوار سے
لگ کر اُن کی باتیں سننے لگا۔

میاں کی بیوی کہہ رہی تھی:

''تمہیں کوئی حق نہیں ہے اُسے یہاں رکھنے کا!''

''میں کیا اُسے بلانے گیا تھا؟''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تم اُسے غنڈوں کے حوالے کر دو۔''

''زندگی بھر کی دوستی پر خاک ڈال دوں! یہ انسانیت ہے؟''

''اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے......'' میاں کی بیوی نے چلا کر کہا، ''اور کوئی راستہ
نہیں ہے۔ تم نے اگر اُسے غنڈوں کے حوالے نہ کیا تو میں تمہارا اور اُس کا، دونوں کا خون
پی جاؤں گی!''

میاں کی بیوی نے اپنے لمبے لمبے ناخن ہوا میں لہرائے۔ وہ اُس وقت مجھے ایک
چڑیل اور ڈائن معلوم ہوئی۔ اُس نے میاں کو کالر سے پکڑ لیا: ''جاؤ اُسے غنڈوں کے
حوالے کر دو۔''

میاں اُس کے بستر سے اُٹھا۔ اُس نے قریب کی ایک دراز کھول کر ایک پستول نکالا
اور پستول نکال کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا کہ میں جلدی سے پلٹ کر
سیڑھیاں چڑھ کے اُوپری منزل میں اپنے کمرے میں آ کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ دل
دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میاں پستول لیے مجھے مارنے کے لیے
میرے سرہانے کھڑا ہے۔

یکا یک مجھے سیڑھیوں پر میاں کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

قدم میرے دروازے پر آ کر رک گئے۔

میری سانس حلق میں اٹکنے لگی۔

میاں نے ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھولنے کے بجائے کنجی گھما کر بند کر دیا۔ کمرے میں تاریکی تھی اور میں بجلی چلانا بھی نہ چاہتا تھا۔ میں آہستہ سے اپنے بستر سے اُٹھ کر اکڑوں چل کر دروازے کی طرف گیا اور پردے کے پیچھے سے ہینڈل گھما کے آہستہ سے دیکھا۔ ہینڈل ہلتا نہ تھا۔ میاں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

اتنے میں میاں نے باہر سے ایک سگریٹ سلگایا اور میں نے اُس کی روشنی میں دیکھا کہ میاں کا چہرہ زرد اور ستا ہوا ہے اور اس کے ہاتھ میں پستول کانپ رہا ہے۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کم بخت مجھے اندر بند کر کے خود باہر غنڈوں کا انتظار کر رہا ہے۔

رات بھر میاں کمرے کے باہر پستول لے کر ٹہلتا رہا۔ ایک پل نہیں سویا رات بھر میں بھی جاگتا رہا۔ اب آنکھوں میں نیند کیسے آتی۔ جب صبح کاذب ہوئی تو میاں نے کنجی گھما کے دھیرے سے میرا کمرہ کھولا۔ میں دبک کر اپنے بستر میں لیٹ گیا۔ میاں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔

میں نے کہا: ''کیا ہے میاں؟''

''اُٹھو، چلو۔''

''کہاں؟''

''تم چلو تو میں بتاتا ہوں۔''

''ٹھہرو، منہ ہاتھ تو دھولوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ میاں بولا۔'' دیر ہو جائے گی۔ فوراً چلو۔''

میں نے شب خوابی کے کپڑے اُتار کر دوسرے کپڑے پہن لیے اور میاں کے ساتھ ہو لیا۔

میاں کے ہاتھ میں ابھی تک پستول تھا۔

ہم دونوں نیچے اُترے تو بھابھی کو میں نے آداب کیا مگر اُنہوں نے میرے آداب

کا کوئی جواب تک نہ دیا۔ میں نے دیکھا بھابھی کی دونوں آنکھیں سوجی ہوئی ہیں!

گھر کے دروازے پر میاں کی ہڈسن کھڑی تھی۔ کانچ دونوں طرف چڑھے ہوئے تھے۔ میں اور میاں ساتھ ساتھ گاڑی میں بیٹھے۔ راستے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میاں کا چہرہ سخت اور خشونت آمیز تھا۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے کسی قسم کی بات کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوئی۔

میاں کی ہڈسن سیدھی ریلوے اسٹیشن کی طرف ہولی۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''لاہور ریلوے اسٹیشن۔''

''مگر میں لاہور ریلوے اسٹیشن جاکر کیا کروں گا؟ میں تو اس مصیبت میں تمہارے پاس رہنے کے لیے آیا تھا۔''

''مصیبت یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس رکھ نہیں سکتا!''

گاڑی اسٹیشن کی پورچ میں آکر رک گئی۔ میاں مجھے جلدی سے اندر لے گیا اور مجھے تین سو روپے دے کے کہنے لگا:

''تم فرسٹ کلاس کے مسافر خانے میں بیٹھو اور مجھے بتادو تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ٹکٹ لاکے دیتا ہوں۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے چلا کے کہا، ''میں لاہور میں رہوں گا۔ لاہور...... جو میرا وطن ہے۔''

''تم نہیں رہ سکتے۔ وہیں جاؤ جہاں تمہارے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے گئے ہیں۔''

''میرا سب کچھ لاہور ہی میں ہے۔'' میں نے تقریباً رندھے ہوئے گلے سے کہا، ''میاں، تمہیں معلوم ہے کہ میں لاہور کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے لاہور سے عشق ہے!''

''عشق سے جدائی بھی تو ہوتی ہے۔'' میاں کے چہرے پر ایک خشک مسکراہٹ سی آئی جسے دیکھ کر میں بالکل آگ بگولا ہوگیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا تم اس قدر کمینے اور رذیل نکلو گے۔'' میں نے میاں سے

غضبناک لہجے میں کہا، ''رات کو میں نے بھابھی کو کہتے سنا تھا کہ بیج ناتھ کو غنڈوں کے حوالے کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم لوگ اس قدر متعصب......''

میاں نے مایوسی سے سر ہلایا اور کہنے لگا: ''رات کو اگر میں تمہیں غنڈوں کے حوالے کر دیتا تو ایک احمق سے پیچھا چھوٹ جاتا!''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''تمہیں معلوم نہیں ہے۔ رات کو حاجی نے یہاں سے جانے کے بعد غنڈے میرے گھر پر بھیج دیے تھے اور انہوں نے آ کر بار بار ہمارا دروازہ پیٹا۔ وہ لوگ مصر تھے کہ میں تمہیں اُن کے حوالے کر دوں۔''

''تم نے پستول چلا دیا ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''اُن کے پاس بھی پستول تھے، اور میں اکیلا تھا اور وہ بیس تھے۔''

''پھر؟''

''پھر میں نے ایک چال چلی اور میں نے اُن سے کہا کہ میں صبح کو پنڈت کو تمہارے حوالے کر دوں گا......زندہ یا مردہ!''

''وہ مان گئے؟''

''ہاں۔ مگر چلتے وقت میرے دونوں بچے اپنے ساتھ لے گئے۔''

''طارق اور تسنیم؟'' میں نے چلا کر کہا۔

''ہاں! بطور یرغمال وہ انہیں ساتھ لے گئے ہیں۔ شاید یہ سوچ کر کہ اگر میں صبح کو تمہیں اُن کے حوالے نہ کروں تو......''

''نہیں، نہیں۔'' میں چلایا۔ اور میں نے میاں کے پاؤں پکڑ لیے، ''مجھے لے چلو۔'' میں نے چلا کر کہا، ''مجھے اُن غنڈوں کے حوالے کر دو!''

میاں کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی رو دے گا۔ تھوڑی دیر چپ رہا، پھر یکایک وہ اپنے پاؤں چھڑا کر پلٹا اور بھاگتا ہوا اسٹیشن کے باہر جا کر ہڈسن کو تیزی سے چلا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔

میں تھوڑی دور تک اُس کے پیچھے بھاگا مگر جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو

پلٹ کر اسٹیشن کے اندر آ گیا۔ کچھ دیر تک پتھر کا بت بنا ایک جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اب جاؤں تو کہاں جاؤں! اور اپنے آپ کو حوالے کروں تو کس کے حوالے کروں! آخر یہ سوچ سوچ کر ایک بزدل کی طرح اپنے دل کو ڈھارس دے دی کہ وہ غنڈے میاں کے بچوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کریں گے! ایسا ظلم تو نہ کریں گے کہ ایک ہندو کی جان کے بدلے دو معصوم مسلمان بچوں کی جان لے لیں! حالانکہ اس وحشت کے دور میں سبھی کچھ ممکن ہے، مگر......

میں یہی سوچتا ہوا فرسٹ کلاس کی کینٹین کی طرف مڑ رہا تھا کہ اُدھر سے ایک آدمی آتے ہی مجھ سے زور سے یہ کہتا ہوا لپٹ گیا:

''ارے پنڈت جی! تم کہاں؟''

میں نے دیکھا تو شاہد تھا۔ شاہد لاہور اسٹیشن پر ٹی۔ ٹی۔ تھا اور اپنا پرانا یار تھا۔ شاہد کی آنکھیں مجھے پہچان کر مسرت سے چمک اُٹھی تھیں مگر میں اس عالم میں اپنا نام سن کر چونک گیا۔

اس موقعے پر کسی کا کسی کو ہندو نام سے پکارنا گویا موت کو دعوت دینا تھا۔ میں نے اپنی انگلی اپنے ہونٹ پر رکھی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا: ''شش...... خدا کا شکر ہے کسی نے سنا نہیں!''

شاہد شرمندہ ہو گیا: ''ساری، مجھے خیال نہیں رہا، دوست!''

شاہد نے بہت بہت معافی چاہی۔ مجھے اپنے کیبن میں لے گیا۔ چائے پلائی۔ پھر اُس نے مجھ سے پوچھا: ''اب تم کہاں جاؤ گے؟''

میں نے شاہد سے کہا: ''میں آیا تھا اپنے گھر۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ سب لوگ یہاں سے بھی بھاگ چکے ہیں۔ کچھ دیر اپنے دوست کے ہاں ٹھہرا اور اُس کے لیے مصیبت کا باعث بنا۔ اب سوچتا ہوں گاؤں جاؤں شاید میری بیوی بچے وہیں پر ہوں گے۔''

''تمہارا گاؤں کہاں ہے؟'' شاہد نے مجھ سے پوچھا۔

''کوٹلی سودکاں!''

''کوٹلی سودکاں تحصیل شکرگڑھ میں ہے اور تحصیل شکرگڑھ ضلع گورداس پور میں ہے۔''

شاہد نے فوراً کہا: ''تو تم براستہ نارووال جاؤ گے۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ٹکٹ لائے دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں گاڑی جانے والی ہے۔'' اُس نے گھڑی دیکھ کر کہا اور ٹکٹ لینے چلا گیا۔

گاڑی نارووال کو چلنے لگی تو میرے ذہن میں پنجابی کے دو بول یوں چمک گئے جیسے اندھیری رات میں کسی کی آنسوؤں سے بھری ہوئی دو آنکھیں چمک جائیں:

گڈی آئی، گڈی آئی

نارووال دی۔

بڈھڑے دی داڑھی وچ

اگ بال دی!

اور یکا یک میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، اور یکا یک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پنجاب ایک بوڑھا ہے، ایک سفید ریش کسان ہے جس کی داڑھی میں تفرقہ پردازوں نے آگ لگا دی ہے۔ پنجاب جل رہا ہے اور اُس کی عزت اور حرمت چل رہی ہے اور وہ سفید ریش بڈھا بے بس اور مجبور ہو کر اپنی جھریوں کی پوٹ میں چھپی ہوئی آنکھوں سے آنسو نچوڑ رہا ہے اور سر ہلا ہلا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا ہے......

گڈی آئی، گڈی آئی

نارووال دی

بڈھڑے دی داڑھی وچ اگ بال دی!

تیسرا باب

نارووال سے ہوکر میں اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور پر اُتر گیا۔ اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور سے کوٹلی سودکاں ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سے میں پیدل اپنے گاؤں کو ہولیا۔ کمادوں کی فصل کا زمانہ تھا۔ چاروں طرف ہری بھری کھیتیاں نظر آتی تھیں۔ ٹاہلیوں کے جھنڈ میں مویشی سر جھکائے بیٹھے تھے یا گھاس چر رہے تھے۔ دور اُفق کے جھلملاتے ہوئے دھندلکوں میں سورج غروب ہو رہا تھا اور دور کسی جاٹ کا گیت فضا میں گونج رہا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے یہ سب کچھ بہت بھلا معلوم ہوتا۔ مگر میرے کپڑے گندے اور میلے کچیلے تھے اور پھٹے ہوئے تھے۔ میری داڑھی بڑی ہوئی تھی اور میرے ذہن میں اک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ یہ سرسبز کھیتیاں ہر موڑ پر مجھے حملہ آوروں کی کمین گاہیں معلوم ہوئیں۔ مویشیوں کی جھکی جھکی گردنیں مجھے حیران اور اُداس معلوم ہوئیں۔ جاٹ کے بے فکر نغمے کی تان مجھے دکھ اور درد میں ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی، اور جب میرے سر سے یکا یک راج ہنسوں کی ایک ڈار اپنے سپید پر جھلاتے ہوئے گزر گئی تو یکا یک میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تم کدھر جا رہے ہو سفید پروں والے راج ہنسو!...... مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو...... کسی اجنبی جھیل کے کنارے، آدمی کی دنیا سے بہت دور، جہاں نرم نرم پروا چلتی ہے اور اٹھکیلیاں کرتی ہوئی لہریں نیلوفر کی پنکھڑیوں کو چومتی ہیں اور برف کے سپید گالوں کی طرح نازک، مصفا اور حسین راج ہنس اپنی لانبی لانبی مغرور گردنیں اُٹھائے، اپنی محبوباؤں کے ساتھ، جھیل کی سطح پر، پھولوں کے درمیان، تیرتے ہوئے ہیں۔ مجھے وہاں لے چلو جہاں شفتالو کی جھکی ہوئی شاخیں سطحِ آب پر اپنے پھول

کراتی ہیں اور پانچ رنگوں والے ماہی مار اور سات رنگوں والے سنہو لے فضا میں قوس قزح
ے رنگ بکھیرتے ہیں۔ مجھے وہاں لے چلو، میرے دوستو! میں تمہارے بچوں سے کھیلوں
گا۔ لمبی لمبی دریائی گھاس میں لیٹ کر اُن اُونچی اُونچی سرکنڈوں کی سفید کلغیوں کو دیکھا
کروں گا جو فضا میں امن کے جھنڈے کی طرح لہراتی ہیں، اور اُن خوابوں کو یاد کروں گا جو
انہی سرکنڈوں کے سائے میں کبھی میں نے اور شاداں نے دیکھے تھے!...... مجھے یہاں مت
چھوڑ جاؤ، میرے رفیقو!...... آج انسان کی دنیا میں بہت زیادہ اندھیرا ہے۔ بہت زیادہ ظلم
ہے۔ بہت زیادہ تنگ نظری ہے...... تھوڑا سا اندھیرا تو مجھے بھی گوارا ہے اور تھوڑی سی تنگ
نظری تو میری روح میں بھی ہوگی اور تھوڑا سا ظلم تو میں نے بھی کسی کی ذات پر کیا ہوگا مگر اتنا
بڑا اندھیرا، اتنا بڑا ظلم، اتنی گہری تنگ نظری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی کہ ایک انسان
دوسرے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دے؟ مجھے اپنے پروں پر بٹھا کے لے چلو راج ہنسو۔
میں کتنے دنوں سے نہیں سویا ہوں اور نیند میرے انگ انگ میں ڈولتی ہے مگر کہیں بیٹھنے کی
جگہ نہیں پاتی ہے۔ میں تمہارے نرم اور ریشم کی طرح ملائم پروں میں سو جاؤں گا اور نیند کے
سرمئی غباروں میں کھو کر اپنے سپنوں کے جزیروں کی طرف نکل جاؤں گا......

مگر راج ہنسوں کی ڈار ہوائی قینچی کی طرح جھولتی ہوئی، میری امیدوں کو کاٹتی
ہوئی، فضا میں گم ہوگئی اور میں نیچے زمین پر کھڑا رہ گیا!

کیوں میں نے سوچا تھا کہ یہ راج ہنس ضرور مجھے اپنے پروں پر بٹھا کے کہیں لے
جائیں گے؟ بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔ مگر انسان کبھی کبھی ایسی ناممکن الحصول باتیں بھی سوچا کرتا
ہے اور اُن کے پورا نہ ہونے پر بھی روتا ہے۔ میں نے دو آنسو جھٹک دیے اور اپنے گاؤں
کوٹلی سودکاں کی طرف روانہ ہوگیا۔

کوٹلی سودکاں میں میرے دادا جی کا گھر تھا۔ یہاں پر مجھے میرے بھائی بہن، ماں
باپ، بیوی بچے سب مل گئے اور ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ کر وقتی خوشی سے رونے لگے
کیونکہ ان سب لوگوں نے سوچ لیا تھا کہ بیج ناتھ لاہور میں مارا گیا ہوگا۔ میرے دادا جی نے
مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ بڑے وجیہہ، پُر وقار اور پرانے زمانے کے زمیندار تھے۔ اُن
کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور وہ اپنے سفید بالوں والے سر اور مضبوط تھوڑی اور سفید گل

مونچھوں سے بڑے بارعب دکھائی دیتے تھے۔ سارے گاؤں پر اُن کا دبدبہ تھا، اور چونکہ وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار تھے اس لیے سب لوگ اُن کی بات مانتے تھے۔ تحصیلدار اور تھانیدار اور دوسرے حاکم آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ مگر گاؤں پر ہمارے دادا جی کی حکومت ہمیشہ قائم رہتی تھی۔

میں نے دادا جی کو اور گھر کے دوسرے لوگوں کو لاہور کا سارا حال کہہ سنایا! اور اُن کو سمجھایا کہ اب گزر ممکن نہیں ہے اب یہاں سے چلنا ہوگا، اور ابھی تو خیریت ہے۔ ابھی یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہے ورنہ بعد میں......

مگر دادا جی بڑے ضدی تھے۔ برافروختہ ہو کے بولے: ''کیا بات کرتے ہو؟ بیج ناتھ؟ اگر اس دھرتی پر پاکستان بنے گا تو کیا ہوا۔ ہم اس دھرتی پر رہیں گے اور اسی کا جس گائیں گے۔ جیسا سات پیڑھیوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔''

''مصیبت یہ ہے''، میں نے کہا، ''آپ تو سات پیڑھیوں سے آرام کرتے اور جس گاتے آئے ہیں مگر آپ کے مسلم مزارعے فریاد کرتے آئے ہیں اور اب بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے!''

''میرے مسلمان مزارعے تو میرے بچے ہیں!'' دادا جی فخر سے بولے۔

''صرف فصل کاٹنے تک!'' میں نے جواب دیا اور دادا جی لاٹھی لے کر مجھے مارنے کو دوڑے! وہ تو میرے پتا جی اور میرے بڑے بھائی نے بیچ بچاؤ کرا دیا ورنہ پرانے دستور کے مطابق میں آج بھی پٹتا!

دوسرے دن سہ پہر میں دادا جی دالان کے ایک تخت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ کریم خان اُن کے پاؤں دبا رہا تھا اور اللہ داد اُن کی کمر اور فضلو اُن کے سر میں مالش کر رہا تھا۔ مجھے اُدھر سے گزرتے دیکھ کر اُنہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پھر فضلو سے پوچھا: ''کیوں فضلو! کیا یہاں بھی فساد ہوگا؟''

فضلو نے دادا جی کی چمپی کرتے ہوئے کہا: ''مالک! سات پیڑھیوں سے تو اس گاؤں میں آج تک فساد ہوا نہیں ہے اور نہ ہوگا ....''

''تم اللہ داد؟''

اللہ داد نے دادا کی کمر میں مہین مہین چٹکیاں لیتے ہوئے کہا: ''ہم تو آپ کے بچے ہیں مالک!''

''کریم خان؟''

کریما پاؤں دباتے دباتے مسکرا کر بولا: ''بےفکر رہیے! جو فساد کرے گا ہم اُس کی گردن مار دیں گے!''

دادا جی نے فخر سے میری طرف دیکھا۔ اب میں کیا کہتا۔ کندھے جھٹکا کر وہاں سے الگ ہو گیا۔

آٹھ دس روز بڑے آرام سے گزرے۔ میں اپنے دل کے وسوسے اور واہمے تقریباً بھول گیا۔ ہم لوگ صبح کو تازہ چھاچھ پیتے، دوپہر میں کما دکاٹ کر چوستے۔ سہ پہر میں جب کام سے ذرا فراغت ہوتی تو شہتوتوں والے تالاب کے کنارے درختوں کے گھنے سایوں میں میں اپنے دادا جی کے مزارعوں کے ساتھ تاش کھیلتا۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ منا میری گود میں ہوتا اور غوغاں کر کے میری گود میں کھیلتا رہتا یا تاش کے پتے اُٹھا کر اپنے منہ میں ٹھونسنے لگتا اور رال ٹپکا ٹپکا کر میری قمیض گیلی کر دیتا۔ مگر وہ بڑا گول مٹول گوتھلا سا تھا اور مجھے بہت پیارا معلوم ہوتا تھا۔ جب میری گود میں بیٹھتا تھا اور میں اُسے گود میں لے کر شہتوت کے گھنے سایوں میں دادا جی کے مزارعوں کے ساتھ تاش کھیلتا تو مجھے زندگی نیلے آسمان میں تیرتے ہوئے سپید اور ہلکے پھلکے بادلوں کی طرح نرم اور آہستہ خرام معلوم ہوتی تھی!

اکیس اگست کی شام میں، جب چولہوں پر مکئی کی روٹیاں سینکی جا رہی تھیں اور آنگن میں کڑھی کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور بچھڑے کھونٹے سے بندھے اپنی ماؤں کو آواز دے رہے تھے اور گھا گھرا جھلاتی ہوئی جوان اور مہ وش بہوئیں اپنے اپنے خاوندوں کے لیے تھالیاں پروس کر لے جا رہی تھیں، اُس سمے دالان میں دادا جی کے مزارعوں کا ایک وفد تخت کے پاس آ کے رکا۔ اُن لوگوں نے فریادیوں کی طرح چادریں اُلٹی کر کے اپنے گلے میں ڈال رکھی تھیں اور اُن کے سر خوف اور شرم سے جھکے ہوئے تھے۔

دادا جی کھانا کھانے والے تھے کہ اُنہوں نے ان لوگوں کو آتے دیکھ کر تھالی ہٹوا دی اور ذرا کڑی آواز میں بولے:

"کیا ہے؟"

مزارعوں کے وفد میں کریم خان تھا، اللہ داد بھی تھا اور فضلو بھی تھا، رحمان بھی تھا، دوسرے لوگ بھی تھے جنہیں میں زیادہ اچھی طرح سے نہیں جانتا تھا۔

کریم خان نے چادر کا پلو اپنے ہاتھ میں لے کر جھک کر کہا: "مالک اُوپر سے حکم آیا ہے لوٹ لو۔"

"اُوپر والا تو خدا ہے۔" دادا تضحیک سے ہنسے۔

"کیا خدا نے تمہیں ہمیں لوٹنے کے لے کہا ہے!"

وہ لوگ دو ایک لمحوں کے لیے تذبذب میں پڑ گئے، پھر فضلو آہستہ سے بولا: "مالک آپ چلے جائیں یہاں سے!"

"کیوں چلا جاؤں؟" دادا غصے سے چیخے!

کریم خان نے ایک سرد آہ بھر کے کہا: "مالک! اُوپر سے حکم آیا ہے لوٹ لو۔ ہم اُوپر والوں کا حکم ٹال نہیں سکتے۔"

یہ کہہ کر کریم خان نے سر جھکا لیا اور ٹپ ٹپ کرتے ہوئے آنسو اُس کی میلی چادر پر گرنے لگے۔

دادا نے غصے سے کہا: "تم نہایت بزدل اور احمق ہو جو غنڈوں سے ڈر جاتے ہو۔ میرے پاس چھ بور والا ریوالور ہے۔ ایک تھری ناٹ تھری ہے۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال کوٹلی سودکاں کے زمیندار کو لوٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ چلے جاؤ۔"

اُن لوگوں کے جانے کے بعد میں نے اور میرے پتا جی نے بھی دادا جی کو بہت سمجھایا مگر وہ کسی طرح نہیں مانے۔ کسی طرح اُن کے دل میں یہ بات نہیں گھستی تھی کہ اب اُن کو یہاں سے جانا ہوگا۔

گھر میں دو پارٹیاں ہوگئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ جانا چاہیے۔ کچھ لوگ دادا جی کے حمایتی تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ سب خون خرابہ، فساد چند دنوں کا اُبال ہے، ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پھر ہم لوگ جانے والوں سے کہیں زیادہ آرام میں رہیں گے اور کوٹلی سودکاں میں تو کبھی کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ چچا آیا رام اور تایا رام لبھایا تو دادا جی کے حق میں تھے مگر میں اور میرا بھائی

بھائی اور پتا جی جانے کے حق میں تھے، اور جو مرد جس طرف تھا اُسی طرف اُس کی بیوی اور بچے بھی تھے۔ آدھی رات اسی بحث میں کٹ گئی۔ اُس کے بعد سب پڑ کے سو گئے۔

لیکن صبح کو حملہ ہو گیا۔ ابھی ہم لوگ ٹھیک طرح سے جاگے بھی نہ تھے، بچے بالے تو سو رہے تھے۔ میں خود رات کا جاگا ہوا دیر سے سویا تھا اس لیے جب گلی میں ڈھول بجنے لگے، فسادیوں کے نعرے بلند ہونے لگے اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سنائی دی تو میں ہڑبڑا کر جاگ اُٹھا۔ میں ایک بنیان اور تہمد پہن کر سویا تھا۔ اُسی لباس میں اُٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ میرے کمرے کی کھڑکی باہر کمادوں کے کھیت کی طرف کھلتی تھی۔ میں کھڑکی سے چھلانگ لگا کے پہلے تو کمادوں کے اندر ہی اندر دور تک دوڑتا چلا گیا، اور کمادوں کے تیز دھار والے پتوں نے میری بنیان اور تہمد کو جگہ جگہ سے پھاڑ ڈالا اور میری ٹانگوں اور بازوؤں پر بھی کئی جگہ سے خون نکل آیا اور کئی جگہ پر سرخ خراشوں کے نشان پڑ گئے۔ آخر جب ڈھولوں، نعروں اور چیخوں کی آواز دور ہو گئی اور دب سی گئی تو میں لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے رکا اور وحشت سے آنکھیں پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا......

یہاں کوئی بھی نہ تھا۔ چاروں طرف کماد ہی کماد تھے اور وہ جو دور کا شور تھا وہ بھی گویا ڈوبتا سا جا رہا تھا۔ کوئی آدھے پونے گھنٹے کے بعد چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ ڈھولوں کی آواز، دوڑنے والے قدموں کی آہٹیں، تکبیر کے نعروں میں گھلی ہوئی، ڈری ہوئی چیخیں سب ساکت ہو کے رہ گئیں۔ اب میرے چاروں طرف خاموشی کی ایک چادر سی تن گئی تھی۔

میں دب کے کھیت میں بیٹھ گیا۔ ایک دن اور ایک رات اور دوسرا دن اور دوسری رات اور تیسرے دن کی سہ پہر تک میں وہیں کھیت میں چھپا رہا۔ ڈر کے مارے حرکت تک نہ کرتا تھا۔ مبادا میری آہٹ سے وہ لوگ خبردار ہو جائیں اور مجھے پکڑ کر ہلاک کر ڈالیں۔ دوسری رات زور کی بارش ہوئی اور کھیت کے کیچڑ سے میرا سارا جسم غلیظ ہو گیا مگر ایک اچھی بات بھی ہوئی۔ میں سخت پیاسا تھا اس لیے بارش کے بھیگے ہوئے پتوں کو چاٹتا رہا اور کماد کے ڈنٹھلوں میں رکے ہوئے پانی کو پیتا رہا۔ اس سے پیاس تو بجھ گئی مگر بھوک چمک اُٹھی۔ تیسرے روز سہ پہر میں تو اس قدر زوروں کی بھوک لگی کہ جس نے میرے ڈر کو بھی ختم کر دیا

اور میں بھوک سے بالکل مجبور اور بے بس ہو کر کھیتوں سے باہر نکل آیا اور پیچھے پیچھے چل
اپنے دادا کے گھر تک پہنچ گیا۔

میرا دادا دہلیز پر مرا پڑا تھا۔ اُس کا جسم پھول گیا تھا اور اُس کا ایک ہاتھ دہلیز سے
باہر تھا اور ایک ہاتھ دہلیز کے اندر تھا، اور دہلیز کے باہر ہمارے گھر کی کتیا رومی کان لٹکا ئے
دادا جی کی لاش کے قریب بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ میں دادا جی کے اُوپر سے چھلانگ لگا
کے گھر کے اندر چلا گیا۔ آنگن میں جا کے سب سے پہلے نل کھول کر پانی پیا، اور جب پانی پی
کر سیر ہو گیا تو رسوئی میں چلا گیا اور کچھ کھانے کی چیز ڈھونڈنے لگا۔ اتفاق سے چنگیر میں
میلے کپڑے میں لپٹی ہوئی مجھے چند روٹیاں مل گئیں اور چھکے میں مکھن بھی مل گیا اور کونے میں
پڑی ہوئی ایک چھوٹی سی گڑ و بلی میں تھوڑا سا گڑ بھی مل گیا۔ میں کھانا کھاتے ہوئے رسوئی
سے باہر آ گیا اور آنگن میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ غربی دیوار سے لگے ہوئے تخت پوش پر دادا
کے خون کے چھینٹے تھے۔ حقے کی نے الگ تھی، نیچہ الگ زمین پر پڑا تھا۔ قریب میں دو
کھٹولے اور پیڑھیاں اوندھی پڑی تھیں۔ میں نے وہاں سے نظر ہٹا لی اور جنوبی دیوار کو
دیکھا جہاں لوکی کی بیل میں سبز سبز لوکی کے پھل لٹک رہے تھے۔ کونے پر تنور اُسی طرح کھڑا
تھا اور اُس کے نیچے ایک لوہے کا چمٹا پڑا تھا۔ میری نظر مشرقی دیوار کی طرف گھوم گئی۔ دیوار
سے ایک چارپائی لگی کھڑی تھی اور اُس پر ازار بند بُننے کے لیے ریشمی دھاگوں کا اڈہ ابھی
تک کھڑا تھا، اور یکایک میری نگاہوں میں میرے چھوٹے بھائی کی دلہن آشا کا چہرہ گھوم
گیا: شرمیلا، سانولا چہرہ۔ ماتھے پر بندی، ناک میں سونے کی چمکتی ہوئی کیل۔ پتلے پتلے
ہونٹ، حیا اور شرم سے مسکراتے ہوئے اور حنائی انگلیاں ریشم کے لچھوں کو سلجھاتی ہوئیں،
رنگین ڈوریوں میں روزمرہ زندگی کے خواب بنتی ہوئیں۔ اس وقت وہ حنائی انگلیاں کہاں
ہیں؟ یہ گھر کی دیوار سے لگی ریشم کی تصویر شاید اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گی! اور یکایک میرے
چاروں طرف میرا گھر بھر گیا؛ پرانی آوازوں سے، پرانی خوشبوؤں سے، جانے پہچانے
چہروں سے۔ اور ایک لمحے کے لیے میں نے بالکل یہ محسوس کیا جیسے وہ میری ماں آٹا گوندھ
رہی ہے۔ وہ میری بیوی آٹے کے پیڑے پکا رہی ہے۔ وہ میرا بچہ منا آٹے کے بیل بکری
بنا رہا ہے۔ دادا تخت پر بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور مشرقی دیوار سے لگی ریشمی اڈے پر میرے

ھائی کی دلہن ازار بند بُن رہی ہے اور زیرِ لب گنگنا رہی ہے:

گڈی آئی، گڈی آئی سپاہی والی

اہنوں ٹکٹ نہ دئیں بابو

ساہڈی رات جدائی والی!

دوسرے لمحے میں وہاں کچھ نہ تھا۔ تخت پوش خون کے سیاہ دھبوں سے بھرا تھا۔ ُ الٹا پڑا تھا۔ کھٹولے اوندھے پڑے تھے اور دیوار سے لگی اُلٹی چارپائی پر ریشم کا اڈہ نامکمل تھا......

روٹی کھاتے کھاتے میں نے یہ سب کچھ سوچا اور دیکھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ رومی میرے قدموں میں آ گئی ہے۔ اور میری طرف عجیب بے کسی اور بے بسی کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ رومی حاملہ تھی اور اُس کا پیٹ اُبھرا ہوا اور کچھ لٹکا ہوا تھا۔ چند دنوں میں، پندرہ بیس روز یا شاید مہینے کے بعد، یہ بچے دے گی۔

دادا اس سے کتنا پیار کرتے تھے۔ بے چاری یہ بھی تو تین دن کی بھوکی ہوگی، میری طرح۔ میں نے رومی کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینکا۔ رومی نے نہیں کھایا۔ میں نے دوسرا ٹکڑا توڑ کر پھینکا۔ رومی نے اسے بھی سونگھ کر چھوڑ دیا۔ نہیں کھاتی تو نہ کھا، بھوکی مر۔ میں نے دونوں ٹکڑے بھی اُٹھا لیے اور آستین سے جھاڑ کر دوسری روٹیوں کے ساتھ اُسی میلے کپڑے میں لپیٹ کر اپنے ساتھ رکھ لیے۔ جانے کتنے دن بھوکا رہنا پڑے!

روٹی کھا کر میں نے پھر پانی پیا۔ پھر آنگن سے گھر کی دہلیز تک آیا۔ دادا کی لاش پر سے چھلانگ لگا کر پیہے پیہے کھیتوں کے کنارے چلنے لگا۔ یکا یک مجھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا۔ رومی بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

تو کہاں جائے گی کتیا۔ تو حاملہ ہے، تو گابھن ہے۔ تو کتیا ہے، تجھے کوئی ڈر نہیں ہے۔ تو انسان تھوڑی ہے کہ تجھے اپنی جان کا ڈر ہو۔ یہ تو سب تہذیب کی باتیں ہیں۔ اونچے مذہب اور اخلاق کے جھگڑے ہیں۔ یہ تلوار تو بہت بلند اُصولوں کی حمایت میں نکلی ہے۔ شکر کر کہ تیرا گلا اس سے کاٹا نہ جائے گا۔ شکر کر تو غیر مہذب ہے، جاہل اور بے اخلاق ہے۔ شکر کر کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ مذہب کیا ہے۔ تو نے کبھی سندھیا نہیں کی۔ کبھی پانچ

وقت نماز نہیں پڑھی۔ تو کبھی کسی گرجے، مندر، مسجد نہیں گئی۔ تو نے کبھی آزادی کا مفہوم نہیں سمجھا۔ کبھی کسی سیاسی لیڈر کی تقریر نہیں سنی۔ شکر کر کہ تو کتیا ہے، انسان نہیں ہے۔

بھاگ جا، میرے پیچھے مت آ۔ کیونکہ میں ایک انسان ہوں اور اپنی جان بچانے کے لے دوسرے انسان سے بھاگ رہا ہوں۔ بھاگ جا اور چلی جا واپس اپنے گاؤں میں۔ جہاں میں رہتا تھا اور جہاں تو رہتی تھی۔ جہاں میں پیدا ہوا اور تو پیدا ہوئی۔ جہاں سے مجھے نکال دیا گیا ہے مگر تجھے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا کیونکہ تو ایک کتیا ہے، انسان نہیں۔

چلی جا اُسی گھر میں! وہ گھر سدا اسی طرح ویران اور برباد تو نہ رہے گا؟ کوئی تو آئے گا اُس گھر میں، اور کوئی تو اُس حقے کے نیچے کو اُٹھا لے گا اور اُسے دامن سے جھاڑ پونچھ کر اپنے گلے سے لگا لے گا اور فرشی میں تازہ پانی ڈال کے چلم کی گئی تمباکو کو جما کر انگارے رکھے گا اور اسی تخت پوش پر بیٹھ کر حقہ پیے گا، اور اُس ریشمی اڈے میں پھر سے کسی شرمیلی اور معصوم بہو کی حنائی انگلیاں گھومیں گی اور امیدوں کی وہی تصویر بنائیں گی جو میرے چھوٹے بھائی کی دلہن نے نامکمل چھوڑ دی تھی۔ وہ گھر پھر چہکے گا۔ تنور میں آگ بھڑکے گی۔ چنگیر سے گرم گرم روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو آئے گی اور لوکی کی سبز بیلوں سے ڈھکا ہوا آنگن نوخیز کنواریوں کے گیتوں سے بھر جائے گا اور کوئی سعیدہ اور کوئی جمیلہ کِکلی ڈالتے ہوئے کہے گی اور قہقہہ مار کر ہنس پڑے گی:

کِکلی کلیر دی
پگ میرے ویر دی
دوپٹہ میرے بھائی دا
پھٹے منہ جوائی دا

ہاں! نئی زندگی آئے گی اور پرانے ظلم کو دھو دے گی؛ اس لیے تو واپس چلی جا رومی!

مگر رومی واپس نہیں گئی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی آ رہی تھی؛ گردن جھکائے، کان لٹکائے۔

بے وقوف، احمق کتیا:

چوتھا باب

یہاں پر یہ ضروری ہے کہ میں آپ کو اپنی مشکل کا حدود اربعہ سمجھا دوں۔ اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور سے ڈیڑھ میل اِدھر ہمارا گاؤں تھا، کوٹلی سودکاں۔ ڈھائی میل اُدھر کنجروڑ کا قصبہ تھا۔ بیچ میں ریلوے لائن تھی جو نارووال کو جاتی تھی۔ میں چونکہ نارووال سے آیا تھا اس لیے واپس اُدھر نہ جانا چاہتا تھا۔ بچاؤ کا راستہ ایک ہی تھا کہ کسی طرح گوردوارہ کرتار صاحب پہنچ جاؤں اور وہاں سے بریتے بریتے ہو کر دریائے راوی کے کنارے پہنچ جاؤں۔ اُس مقام پر جس کے پار ڈیرہ بابا نانک کا قصبہ اور بیچ میں راوی کا پل تھا جو پاکستان کی سرحد کو ہندوستان کی سرحد سے جدا کرتا تھا۔

جس طرح میں سوچ رہا تھا عین اُسی وقت کنجروڑ سے اور کنجروڑ کے دیہات سے آنے والے ہندوؤں کے قافلے بھی اسی طرح سوچ رہے تھے۔ وہ بھی اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور کو کراس کر کے ایک سڑک پر چل رہے تھے جو ڈیرہ بابا نانک کے پل کو جاتی ہے۔

یہ قافلہ کوئی تیس چالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہوگا۔

میں اکیلا تھا اور یوں بھی میں ایک ڈرپوک، بزدل انسان ہوں۔ زندگی بھر کبھی مار پیٹ نہیں کی۔ کبھی کسی سے زیادہ جھگڑا نہیں کیا۔ کوئی خاص دکھ بھی نہیں اُٹھائے۔ زندگی اب تک بڑے عیش و آرام میں گزری تھی اس لیے کسی سے شدید نفرت کرنے کا موقع بھی آج تک نہیں ملا تھا۔ جدید تعلیم نے اتنا تو کر دیا تھا کہ میرے دل سے اُونچ نیچ، ذات پات، مذہب، رنگ اور نسل کے اختلاف مٹا دیے تھے۔ یہ باتیں مجھے کچھ...... بس کچھ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ ان سے باسی دہی کی سی کھٹاس کی بو آتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ جہاں کہیں بھی یہ

چیزیں ملیں انہیں جلدی سے اُٹھا کے کسی گندی موری میں بہا دیا جائے۔ میرے دوستوں میں ہندو، سکھ، مسلمان، عیسائی، یہودی، انگریز سبھی طرح کے لوگ تھے جیسے کسی کھاتے پیتے برنس مین کے ہو جاتے ہیں۔ مگر میرا سلوک اُن سب سے اچھا اور اُن کا سلوک مجھ سے بھی اچھا تھا اس لیے میں کبھی اُن کے دل میں زیادہ گہرا نہ اُترا تھا، اور اگر یہ کہوں کہ آج تک میں خود کبھی اپنے دل میں زیادہ گہرا نہ اُترا تھا تو یہ بھی غلط نہ ہوگا! شاید حالات نے، آسودگی نے، میرے بے پروالا اُبالی مزاج نے کبھی اس کی فرصت ہی نہیں دی، اور فرصت تو اب بھی مجھے نہیں تھی۔ اس وقت میں اکیلا تھا اور جنگل میں ایک نہتے جانور کی طرح اپنی جان بچانے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا اور اپنے آپ کو بے حد اناڑی پا رہا تھا۔ جنگل سے ناطہ تو کئی ہزار برس سے چھوٹ چکا تھا اور تہذیب کی پتلی جھلی کو میں نے کبھی کرید کر نہ دیکھا تھا۔ آج یہ جھلی اتفاق سے، حادثات سے، تاریخ کے وار سے پھٹ گئی تھی اور اندر سے جنگل نکل آیا تھا اور میں اسے دیکھ کر سراسیمہ ہو گیا تھا۔ میں انسانی آبادیوں میں پلا ہوا، انسانی تہذیب کو مستقل اور دائم سمجھنے والا انسان آج یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس جنگل میں کیسے رہوں جس میں مجھے جانے کتنے دن، کتنے مہینے رہنا پڑے۔ کماد کے کھیت دشمنوں کی کمین گاہ نظر آتے تھے، ہر ٹیلے کی لوٹ میں، ہر نشیب کی بستی میں مجھے موت نظر آتی تھی؛ ریلوے اسٹیشن پر بھیڑیے تاک میں تھے اور یہ ریل کی پٹڑی، جو یہاں سے نارووال جاتی ہے اور نارووال سے لاہور جاتی ہے، جو میرے ذہن میں ہمیشہ سے بیسویں صدی کی تہذیب اور حفاظت کی علامت رہی ہے، آج موت کا بوجھ ڈھو رہی ہے، اور جب میں پیچھے پیچھے چلتا ہوا راستہ بھول گیا، کمادوں میں سے گزر کر گوردوارہ کرتار صاحب کی طرف جانے کے بجائے اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور کی جانب آنکلا تو میں نے کمادوں کی اوٹ میں سے چھپ کر دیکھا کہ ٹیلوں کے پیچھے، بیریوں کے جھنڈوں میں اور کماد کے کھیتوں میں، بالکل میرے سامنے، بہت سے مسلمان فسادی منہ پر ڈھاٹے باندھے، ہاتھ میں بلم، چھریاں، گنڈاسے، بندوقیں لیے کھڑے ہیں اور کمادوں کے اُس پار، ریلوے لائن کی دوسری طرف، سڑک پر سے کنجرو ڑ کی جانب سے آنے والے ہندوؤں کے قافلے کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکتے تھے کیونکہ اُن کی پیٹھ میری طرف تھی اور میں اُن کے پیچھے کے کمادوں کے کھیت میں دبکا ہوا تھا

میدان میں اُنہیں صاف دیکھ سکتا تھا اور وہ پیٹھ سے پیٹھ جوڑے، بلم تانے، شکاریوں کی طرح
یہاں چوکس اور ہشیار کھڑے تھے کہ اُنہیں دیکھ کر یکا یک مجھے احساس ہوا جیسے میں کوئی
انسان نہیں ہوں خرگوش ہوں، گیدڑ ہوں، لومڑی ہوں! چاروں طرف ایک تاریک گھنا
جنگل ہے اور سرسبز پتوں میں چھپی ہوئی بے رحم، لال لال آنکھیں اور لا نبے لا نبے، تیز تیز،
چھری کی دھار والے ناخن میرے گوشت میں گڑ جانے کے لیے تیار ہیں۔

پہلی بار مجھے زندگی میں اک عجیب سا احساس ہوا اور میں کچھ سوچنے لگا حالانکہ
موت سامنے کھڑی تھی۔ کبھی کبھی دماغ دو دو تین تین متوازی سطحوں پر کام کرتا ہے۔ میں
کھیت میں دبکا پڑا ہوں۔ میرے سامنے کے کماد کے کھیت میں اور بیریوں کے جھنڈ میں اور
ریلوے لائن کے ادھر کی جھاڑیوں میں حملہ آور گھات لگائے تیار ہیں اور پار سڑک پر قافلہ
گزر رہا ہے؛ بڈھے، بچے، عورتیں، جوان؛ ہندو، سکھ، کھتری، برہمن، چمار، چوہڑے،
راجپوت، تیلی، زمیندار، مہاجن سب گزر رہے ہیں۔ کبھی یہ سب لوگ آپس میں لڑتے
تھے، ایک دوسرے سے بے ایمانی کرتے تھے ایک دوسرے کا استحصال کرتے تھے، ایک
دوسرے کا گلا کاٹتے تھے مگر آج سب لوگ سر جھکائے اکٹھے بھاگ رہے تھے اور مجھے یاد آیا
کہ جب جنگل میں کوئی بہت بڑی آفت آتی ہے...... سیلاب یا طوفان یا آگ...... اور اس
وقت سارے جانور اکٹھے ہو کر بھاگتے ہیں...... ہرن اور شیر اور بھالو اور ہاتھی اور چیتے اور
نیل گائے اور سانپ اور گیدڑ اور خرگوش...... اور اُس مصیبت کے لمحے کوئی کسی پر حملہ نہیں
کرتا، کوئی کسی کا حق نہیں مارتا، سب ایک مشترکہ خطرے سے بچنے کے لیے ایک مشترکہ
مصیبت کے سامنے اکٹھے ہو کر چلتے جاتے ہیں، چلتے جاتے ہیں...... جنگل کے جانوروں کی
طرح! سڑک مجھے اس وقت بالکل جنگل کی ایک پگڈنڈی سی معلوم ہو رہی تھی جس پر
ہزاروں جانوروں کے غول ہراساں اور سراسیمہ تیز تیز قدموں سے جان بچانے
کے لیے دوڑتے چلے جا رہے تھے......

جب تین چوتھائی قافلہ گزر گیا تو کمادوں میں دبکے ہوئے مسلمان فسادیوں کے ایک
سرغنے نے ایک اشارہ سا کیا اور وہ اشارہ پاتے ہی تکبیر کے بلند بانگ نعروں کے ساتھ
چھریاں، بلم، گنڈاسے اور تلواریں اور لاٹھیاں برساتے ہوئے قافلے پر حملہ آور ہو گئے......

قافلے میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ جس کے جدھر سینگ سمائے اُدھر اپنی جان لے کے بھاگا۔ مدافعت کا یہاں کسی کو ہوش تھا، مدافعت کی ساری اُمیدیں اُن کے دل سے نکل چکی تھیں۔ اب تو وہ اک اتفاق پر تکیہ لگائے، اک اُمید پر جیتے ہوئے چل رہے تھے کہ کسی طرح راوی کے پل تک پہنچ جائیں ورنہ اخلاقی طور پر اُن میں سے ہر شخص مرا ہوا تھا۔

اس لیے سینکڑوں آدمی آدھے گھنٹے میں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیے گئے اور پھر حملہ آوروں کا ہجوم اپنا کام کر کے کسی دوسری سمت کو چل دیا۔

میں نے سوچا کہ قافلے کے ساتھ شامل ہو کے چلنا اور بھی حماقت ہوگی۔ اگر جان بچی تو اکیلے ہی میں کسی طرح بچ جائے گی، ورنہ موت تو یقینی ہے۔

یہ سوچ کر میں نے کسی قافلے میں شامل ہونے کا خیال ترک کر دیا اور شام کے چھٹپٹے تک وہیں کمادوں میں دبکا بیٹھا رہا۔

شام تک مجھے شدید پیاس محسوس ہونے لگی، حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے، اب کسی طرح لعاب حلق سے نیچے نہیں اُترتا تھا اور تالوہی سے چپک کر خشک ہو جاتا تھا۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب حلق میں کسی طرح کا لعاب نہ رہا اور میں نے گھبرا کر اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور جانے کی ٹھانی۔ وہاں تو پانی ضرور مل جائے گا۔ ایک دفعہ پانی پی لوں بعد میں بلا سے کوئی چاہے جان سے مار ڈالے!

یہ سوچ کر میں کمادوں سے نکلا اور ریل کی پٹری کے کنارے کے نشیبوں میں چھپتا چھپاتا اسٹیشن دربار صاحب کرتار پور پہنچ گیا۔

آج اسٹیشن پر اندھیرا تھا۔ دروازے پر ٹکٹ کا بابو نہ تھا۔ پلیٹ فارم پر بتیاں جل رہی تھیں۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں اسٹیشن ماسٹر مرا پڑا تھا۔ باہر پلیٹ فارم پر چاروں طرف ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں عجیب بے ترتیبی کی حالت میں پڑی تھیں۔ میں ان سب مناظر کو ایک پھسلتی ہوئی نگاہ سے دیکھتا ہوا سیدھا ہندو پانی کی طرف گیا اور پیٹ بھر کر پانی پیا۔ لیکن اس دوران میں میں بالکل چوروں کی طرح اسٹیشن میں داخل ہوا تھا، ذرا بھی کہیں میں نے آہٹ نہ کی تھی۔ اب جو میں پانی پی چکا تو سیر شکم ہو کر میں نے چاروں طرف ایک گہری نگاہ دوڑائی۔ کہیں پر کوئی متنفس نہ تھا، چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

پھر یکا یک پلیٹ فارم کے غربی سرے پر مجھے ایک دھندلا، متحرک سایہ سا نظر آیا
او، میں اُسے دیکھ کر ہندو پانی کے بڑے مٹکے کے پیچھے چھپ گیا۔

ہندو پانی کے مٹکے کے آگے چند گز کے فاصلے پر مسلم پانی کا سیاہ مٹکا تھا۔ اُس سے
آ گے اسٹیشن کے چمکتے ہوئے برآمدے میں پیتل کا گھنٹہ لگا تھا۔ اُس کے آگے وہ تاریک
ا یہ کچھ ٹٹولتا ہوا، لاشوں پر جھکا ہوا، نظر آ رہا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ سایہ اُوپر اُٹھا۔
ا ب میں نے دیکھا ایک بڈھا، سفید ریش، کمزور، منحنی سا آدمی ہے اور اُس کے ایک ہاتھ
یں اسٹیشن کی سرخ اور سبز بتی والی لالٹین ہے اور وہ لاشوں میں سے گزرتا ہوا کچھ ڈھونڈ رہا
ہ۔ میں نے سوچا: ''بے چارہ بڈھا! شاید اس جوان بیٹا مارا گیا ہے...... یا کوئی اور رشتے
ار ..... اور یہ لالٹین لیے اُسے ڈھونڈ رہا ہے اور لاشوں کو اُلٹ پلٹ کر کے اُس کا چہرہ
ہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔''

جب وہ میرے قریب آ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ چہرے نہیں پہچان رہا ہے،
ا شوں کی جیبیں ٹٹول رہا ہے اور اُن میں سے نقدی، روپے، نوٹ، ایسی ہی قیمتی چیزیں نکال
ال کر ایک تھیلے میں ڈالتا جا رہا ہے۔

جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں پانی جگہ سے دھیرے سے اُٹھا اور پیچھے سے
جا کے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب وہ ایک لاش پر جھکا ہوا تھا۔

میں نے ڈپٹ کر اُسے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' تو بڈھے کی گھگھی بندھ گئی، اُس کی
آنکھوں کے سفید سفید ڈیلے باہر کو نکل آئے، اُس کے ہونٹ کانپنے لگے، ڈرتے ڈرتے
اس کے منہ سے نکلا: ''میں...... میں...... مسلمان ہوں!''

''مسلمان ہو تو ابھی تمہاری جان لیتا ہوں!'' یہ کہہ کر میں نے اُس کی گردن دبائی۔
بڈھے کے منہ سے کف نکل کر اُس کی داڑھی پر اُڑنے لگا۔ تھیلا چھوڑ کر دونوں ہاتھ
جوڑ کر بولا: ''نہیں۔ نہیں میں مسلمان نہیں ہوں۔ میں، میں بلاقی شاہ ہوں، کنجروڑ والا بلاقی
شاہ۔ تم نے میرا نام سنا ہوگا۔''

ہمارے علاقے میں کنجروڑ کے بلاقی شاہ کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا۔ وہ ہمارے
علاقے کے سب سے بڑا مہاجن تھا۔ کوئی کسان ایسا نہ تھا جو اُس کا مقروض نہ ہو، کوئی ایسا

گھر ہمارے علاقے میں نہ ہوگا جس کا زیور اُس کے گھر گروی نہ ہو۔

"بلاقی شاہ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میرے تو سب مارے گئے اور جو کچھ میرا تھا وہ سب لوٹ لیا گیا۔"

"وہ تیرا تھا ہی کہاں بلاقی شاہ!"

اس نے میری بت کا جواب نہ دے کر کہا: "صرف ایک لڑکی بچی ہے۔ وہ آگے قافلے میں نکل گئی۔ اب جا کے اُسے ڈھونڈوں گا تو ملے گی۔"

"مگر اس وقت یہاں تو کیا ڈھونڈ رہا ہے؟"

"ہے...... ہے......" بڈھا مسکرایا۔ مجھے، ایک ہندو کو، دیکھ کر اُسے اطمینان ہو گیا تھا۔ بولا:

"بیٹا! میری ایک ہی بیٹی ہے اب۔ اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اگر بچ بھی گیا تو جوان بیٹی کی شادی کیسے کروں گا؟ یہی سوچ کر میں......" وہ چپ ہو گیا اور اُس نے زمین پر اوندھے پڑے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے تھیلا اُٹھا کر دیکھا۔ اُس میں دو کے نوٹ تھے اور دس کے نوٹ تھے اور پانچ کے نوٹ تھے اور کچھ سو کے نوٹ بھی تھے اور روپے تھے اور تین چار گھڑیاں تھیں اور سونے کی چھ سات انگوٹھیاں تھیں۔

بڈھا بولا: "سوچا، یہ لوگ تو مر ہی چکے ہیں۔ یہ روپے ان لوگوں کے کس کام کے؟ مسلمان آئیں گے اور ہماری دولت لے جائیں گے۔"

"تمہاری دولت؟"

"ہاں! اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی لیتا چلوں۔ ہے...... ہے...... یہ روپے...... میری بیٹی کے جہیز کے کام آئیں گے......"

"اچھا؟ تو تو ان لاشوں میں اپنی بیٹی کا جہیز ڈھونڈتا تھا؟" میں نے بڑی حقارت اور نفرت سے پوچھا کیونکہ مجھے اُس کی بات کا بالکل یقین نہ تھا۔

"ہاں بابو......" وہ گڑگڑا کر بولا، "اور تو یہاں کیا ڈھونڈتا تھا؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

میں تھوڑی دیر تک چپ رہا۔ چپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ ''میں وہ وطن ڈھونڈتا تھا جسے تیرے لالچ نے کھو دیا!'' میں نے بڑی اُداسی سے کہا اور بلاقی شاہ کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیا کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی انسان کی گردن نہیں کسی سانپ کی کینچلی پر ہاتھ رکھے ہوئے ہوں۔ میں نے اُسے زور سے دھکا دے کر لاشوں پر گرا دیا اور خود اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

اسٹیشن سے بہت دور جانے کے بعد میں نے پھر پلٹ کر دیکھا تو مجھے وہی تاریک سایہ نظر آیا جو لال بتی تھامے لائنوں میں گھوم رہا تھا۔ بلاقی شاہ!

پانچواں باب

اسٹیشن سے نکل کر میں ایک کچے راستے پر ہولیا۔ راستے کے دونوں طرف کماد کے کھیت کھڑے تھے اور رات کی تاریکی میں کسی قلعے کی فصیل کی طرح جید اور مضبوط نظر آتے تھے۔ رات شرم اور خوف سے سہمی ہوئی ان کمادوں میں اُتر آئی تھی۔ چاروں طرف اک ہولناک سناٹا تھا۔ صرف میرے پیچھے پیچھے آنے والی کتیا کبھی کبھی آسمان کی طرف منہ اُٹھا کے رو دیتی تھی۔ یہ رومی بھی عجیب کتیا ہے۔ دن کو کبھی نہیں روتی۔ خاموشی سے آہٹ کیے بغیر میرے ساتھ کمادوں میں دبک جاتی ہے۔ میں چلتا ہوں تو یہ بھی چلتی ہے۔ میں رک جاتا ہوں تو یہ بھی رک جاتی ہے۔ مگر مجھ سے دور دور رہتی ہے کیونکہ ایک دفعہ غصے میں آکر میں نے اسے لات ماردی تھی مگر لات کھانے سے پہلے ہی رومی پیچھے ہٹ گئی تھی اور میرا وار خالی گیا تھا۔ اُس وقت کے بعد رومی بڑی ہوشیاری سے کام لینے لگی تھی کیونکہ رومی کے پیٹ میں اُس کے بچے تھے اور اُسے اُن کی حفاظت بھی کرنا تھی اور اپنی دانست میں میری بھی! اس لیے رومی میرے پیچھے چلتے ہوئے مجھ سے دور دور رہتی۔ دن کو بالکل خاموش رہتی کیونکہ دن میں حملے کا ڈر تھا۔ جانے اتنی عقلمندی اس کتیا کو کس نے سکھا دی تھی؟ وہ صرف رات کو روتی تھی اور منہ اُٹھا کر آسمان کی طرف بین کرتی تھی۔ وہاں، اُوپر، آسمان پر کون ہے رومی جس کی طرف دیکھ کر تو یوں فریاد کرتی ہے؟ آج تو آسمان کا رنگ کالا ہے اور اُس میں کہیں ایک تارہ نہیں چمکتا، اور زمین بالکل خاموش اور سہمی سہمی سی ہے اور افق تا اُفق ایک بے زبان سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہوا بھی نہیں کراہتی، اور دونوں طرف قلعے کی دیواریں بڑی مضبوط اور جید ہیں۔ تیری فریاد کی آواز اس مضبوط تاریکی کو چیر کر کہیں نہیں جاسکتی کیونکہ

تاریکی کا دل نہیں ہوتا صرف پیٹ ہوتا ہے اور فریاد صرف دل ہی سن سکتا ہے، پیٹ تو صرف رونا جانتا ہے!

کچھ عرصے تک یونہی چلتا رہا، چلتا رہا۔ دل میں خیال یہ تھا کہ شاید میں نے اس راستے کو ڈھونڈ کر دریا تک حفاظت سے بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے مگر چند میل چلنے کے بعد معلوم ہوا میں راستہ بھول گیا ہوں۔ یہ تو وہ راستہ نہیں جو میں نے سمجھا ہے یہ تو کوئی اور ہی راستہ ہے اور جانے کدھر کو جاتا ہے! تنگ راستہ آہستہ آہستہ بڑا ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس راستے پر قافلے کے گزرنے کے نشان نظر آنے لگے۔ سینکڑوں قدموں کی روندی ہوئی مٹی کہیں چھپی رہتی ہے۔ راستے کے کنارے ایک بڈھا جاٹ کراہتا ہوا ملا۔ میں اس کے قریب جا کے کھڑا ہو گیا تو اُس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے اپنی سامنے موت کو دیکھ رہا ہو۔

میں نے کہا: ''گھبراؤ نہیں، میں بھی ایک رفیوجی ہوں!''

اُس کی جان میں جان آئی۔ اس کا اُبھرا ہوا نرخرہ دو تین بار خاموشی سے اوپر نیچے کو گھوما، پھر اُس کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز بڑی مشکل سے کھانسی کے ساتھ نکلی......

''واہگورو......واہگورو......میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ......''

''تم نے غلط سمجھا تھا۔ بابا، یہاں کیوں پڑے ہو؟''

''میرے بچے مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے!''

''کیوں نہیں لے گئے؟''

''کیونکہ مجھ سے چلا نہیں جاتا بیٹا! بہت بڈھا ہو چکا ہوں۔''

''تمہارے کتنے بیٹے ہیں؟''

''تین تھے۔ تینوں جوان اور تندرست تھے۔ یہاں تک تو وہ مجھے اُٹھا کے لائے تھے مگر یہاں پر جب حملہ ہوا تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے......''

''چچ چچ......'' میں نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے زبان چلائی۔

بڈھے نے میری ہمدردی کا غلط مطلب لے لیا۔ گڑگڑا کر بولا: ''بیٹا، مجھے یہاں سے اُٹھا کے پل تک لے چلو۔ سنا ہے راوی کا پل یہاں سے بہت قریب ہے۔ میں پل تک

پہنچ جاؤں تو تمہیں زندگی بھر دعا دوں گا۔ بس کسی طرح مجھے پل تک پہنچا دو۔"

میں نے کہا: "بابا! میں خود پل تک پہنچنا چاہتا ہوں اپنے آپ ہی کو کسی طرح پہنچا سکوں تو بڑی بات ہوگی، تمہیں کہاں لادتا پھروں گا۔"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو بیٹا۔ اپنے ساتھ لے چلو......" میں آگے بڑھ گیا۔

بڈھا چند قدم گھٹنوں کے بل میرے پیچھے پیچھے گھسٹتا ہو گڑگڑاتا ہوا آیا۔

"بیٹا مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ بیٹا...... بیٹا...... وہ پل......بس اُس پل تک پہنچا دو۔ بیٹا...... بیٹا۔"

بڈھے نے میرا پاؤں پکڑ لیا۔

میں نے زور سے اپنا پاؤں جھٹک دیا۔ بڈھا لڑکھڑاتا ہوا، پٹخنیاں کھاتا ہوا راستے کی ایک کھڈ میں جا گرا۔ کتیا نے زور کی ایک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ بہت دن ہوئے جیک لنڈن کی ایک کہانی میں نے پڑھی تھی۔ اُس میں اُس نے بتایا تھا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں کے ہاں یہ دستور ہے کہ جب باپ بہت بڈھا ہو جاتا ہے تو اس کے جھولے میں سات دن کا کھانا، سات دن کا تمباکو اور سات دن کا پانی بھر کر رکھ دیتے ہیں اور پھر اسے سردی کے موسم میں ایک برفیلے میدان میں تنہا چھوڑ دیتے ہیں!

یہ اُس زمانے کی رسم تھی جب انسان جنگلی اور قبائلی تھے؛ جب ذرائع پیداوار وحشی اور غیر متمدن تھے؛ جب کھانے کو کم دستیاب ہوتا تھا؛ تیز و تند ہواؤں سے چراگاہیں یک لخت سوکھ جاتی تھیں اور انسان قدرت کے بے رحم ہاتھوں کے طمانچے کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ نان و نفقے کی تلاش میں گھومتا تھا۔

مگر آج تو تہذیب کا دور دورہ ہے۔ دونوں طرف کماد کے کھیت کھڑے ہیں۔ وہاں کہیں راوی کا پل ہے اور قریب ہی میں کہیں ایک ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کوکتی ہوئی، انسان کی عظمت کا اعلان کرتی ہوئی، گزرتی چلی جا رہی ہے۔

مگر وہ بڈھا کھڈ میں گرا ہوا اپنی خاموش نگاہوں سے مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے؟

انسان کی عظمت اس تاریک کھڈ سے باہر کب نکلے گی؟ ہونہہ؟ میں نے اپنا سر جھٹک دیا۔ اکیلے میں نے ہی انسان کی تہذیب کا کیا ٹھیکہ لے لیا ہے؟ جب اس بڈھے

کے بیٹے اسے نہ بچا سکے تو مجھ پر اس کو بچانے کی ذمے داری کہاں سے عائد ہوتی ہے؟

جائے جہنم میں یہ بڈھا! اور کم بخت کتیا اگر تو نے دوبارہ اس طرح مجھ پر لعنت ملامت کی تو لات مار کے تیرے ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔

میں نے کتیا کو مارنے کے لیے لات اُٹھائی، روبی فوراً پیچھے کو بھاگ گئی!

میں آگے چل دیا۔

آگے چل کر راستہ اور کشادہ ہو گیا اور ایک بڑی اور پکی سڑک سے جا کے مل گیا۔

کوئی قافلہ شاید ادھر سے گزرا تھا کیونکہ ایک جگہ ایک بانہہ کٹی پڑی تھی۔ صرف ایک بانہہ؛ باقی جسم غائب تھا؛ نہ دھڑ، نہ سر، نہ ٹانگ، نہ پاؤں نہ چہرہ، نہ کمر؛ صرف ایک بانہہ راستے میں پڑی تھی؛ میرا راستہ روکے ہوئے یہ بانہہ میرے راستے میں پڑی تھی اور اُس کی ہتھیلی آسمان کی طرف کھلی تھی!

صرف ایک بانہہ، ایک بازو، ایک ہاتھ...... ہاتھ کھلا ہوا، آسمان کی طرف دیکھتا ہوا۔ اس ہاتھ نے کبھی ہل چلایا ہوگا، کبھی گلی ڈنڈا کھیلا ہوگا۔ یہ ہاتھ کبھی کسی کی کمر میں رہا ہوگا، کبھی پیار سے اس نے اپنے بچے کو اُٹھایا ہوگا۔ اس ہاتھ سے کبھی کسی نے پھول سونگھا ہوگا، کبھی اس ہاتھ نے کسی کے گیسو سنوارے ہوں گے۔ اس ہاتھ نے پل بنائے تھے، شہر اٹھائے تھے، پھول اُگائے تھے۔ اپنی محبوبہ کے چہرے کو ٹٹول کر اُس میں اپنے مستقبل کے آرام و عافیت کی تصویریں ڈھونڈی تھیں، اور آج یہ ہاتھ مٹی میں سنا ہوا آسمان کو تک رہا ہے۔ یہ ہاتھ کیا کسی ہندو کا ہے؟ یا مسلمان کا ہے؟ یا سکھ کا ہے؟ یا عیسائی کا ہے؟ یہ ہاتھ جو کچھ کہتا نہیں ہے، صرف اپنی پانچوں انگلیاں اُٹھائے ہوئے آسمان کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے، یہ کس کا ہاتھ ہے؟ اور اگر یہ کسی انسان کا ہاتھ ہے تو وہ انسان آج کہاں ہے؟

ہاہاہا! احمق پوچھتے ہیں، کتے فریاد کرتے ہیں، مگر قافلہ آگے بڑھا جاتا ہے......

میں ہاتھ کو پھلانگ کر آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد ایک آواز آئی۔ باریک نسوانی آواز تھی۔ کراہنے کی آواز تھی۔

میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

راستے میں ایک طرف تین بچے مردے پڑے تھے۔ اُن کے قریب ایک عورت

زخموں سے نڈھال پڑی کراہ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی؛

''ویرا! میری جان، پہلے مجھے مار دے!''

عورت کی کمر کے قریب بہت سا خون بہہ کر جم چکا تھا۔ کچھ تھوڑا تھوڑا سا رِس رِس کر بہہ رہا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا؛ ''تجھے کیا مسلمانوں نے مارا ہے؟''

وہ بولی؛ ''نہیں۔ میرے گھر والے نے تینوں بچے مار دیے اور مجھے بھی مارنا چاہا مگر میں تڑپی کسی طرح بچ نکلی۔ مگر جان نہیں نکلتی ہے۔''

''جب قافلے پر حملہ ہوا تو میرا گھر والا مجھے چھوڑ کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے جانے لگا تو میں نے اُس کی بانہہ پکڑ لی اور اُس سے رو رو کر کہا؛ ''تو جا رہا ہے! کہاں جا رہا ہے؟ مجھے اور میرے بچوں کو کس کے آسرے پر چھوڑ کر جا رہا ہے؟''

''اس پر میرے گھر والے نے غصے سے میری طرف دیکھا اور چھری نکال کر میرے تینوں بچوں کو ہلاک کر دیا۔ میں ڈر کے مارے بھاگی، اُس نے زور سے چھری میری طرف پھینکی جو میری کمر میں جا لگی۔ قافلے والے چلے گئے۔ میں یہیں پڑے پڑے تڑپتی رہی۔ مگر میری جان نہیں نکلتی۔ کسی طرح سے میری جان نہیں نکلتی۔ ویرا! تیرا بڑا بھلا ہوئے گا۔ تو میری جان لے لے، مجھے ختم کر دے!''

میں نے کہا؛ ''بی بی، گھبراؤ نہیں۔ صبح تک خود ہی تمہاری جان نکل جائے گی۔ مجھے یہ پاپ کرنے کو کیوں کہتی ہو!''

یہ کہہ کر میں تو آگے بڑھ گیا مگر دیر تک اُس عورت کی گالیوں کی آوز میرے کان میں آتی رہی؛

''وے تیرا کچھ نہ رہے۔ تیرا گھر بار جل جائے۔ (وہ تو جل چکا ہے۔) تیری ماں مر جائے۔ (وہ بھی شاید مر چکی ہوگی۔) تیرے بال بچے بھوکے مریں (مر ہی رہے ہوں گے۔)......ارے کم بخت تجھ سے میرا اتنا بھی نہ ہو سکا؟''

یکا یک چلتے چلتے میں نے محسوس کیا جیسے میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے تھک چکا ہوں، ہار چکا ہوں۔ میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ میں لڑکھڑا کر کمادوں کے

کھردرے پتوں والے بستر پر گر کر سو گیا۔

جب اُٹھا تو صبح ہو چکی تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ رومی میرے قدموں میں سو رہی تھی اور قریب سڑک پر سے ایک نیا قافلہ گزر رہا تھا۔ میں کمادوں سے باہر نکلا اور ایک جست لگا کر قافلے میں شامل ہو گیا۔ جسم و جاں پر ایسی بے حسی سی طاری تھی گویا سوچنے سمجھنے کی ساری قوتیں شل ہو گئی ہوں۔ اندھا دھند جس طرح سے لوگ بھاگتے ہوئے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے جا رہے تھے میں بھی اُن میں شامل ہو گیا۔ کہیں تو پہنچیں گے، کہیں تو جائیں گے......

یہ قافلۂ بے مہار کہیں تو پہنچے گا؟

اب جو ہو سو!

چھٹا باب

بھیڑ کے جس چار خانے میں مَیں چل رہا تھا وہ ایک طرح سے پورے قافلے کی نمائندگی کرتا تھا۔ میرے آگے چار ہندو نوجوان اپنے بڈھے باپ کو چارپائی پر لاش کی طرح لادے چل رہے تھے۔ مختلف گٹھڑیاں اسی چارپائی پر اُس بڈھے کے اِردگرد بندھی ہوئی تھیں۔ میرے بالکل آگے ایک سکھ جاٹ ڈھاٹا باندھے، چھری ہاتھ میں لیے، اپنی بنتو کے ساتھ جا رہا تھا۔ دونوں کے سر پر بڑے بڑے گٹھڑے تھے۔ میرے پیچھے ایک بڑا گڈ چلا آ رہا تھا جسے دو بیل کھینچ رہے تھے۔ اس گڈ پر ایک سکھ خاندان مع اپنے سامان کے براجمان تھا اور یہ لوگ اعلیٰ حیثیت کے زمیندار معلوم ہوتے تھے۔ میری بغل میں ایک بڈھا بنیا، سیاہ رنگ اور سفید مونچھوں والا، چل رہا تھا۔ اُس نے اپنی دھوتی گھٹنوں سے اُوپر کس کر باندھ رکھی تھی اور اُس کی ٹانگوں کی وریدیں ایک مضبوط مچھلی جال کی طرح تنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بڈھے نے ایک ہاتھ میں پوٹلی اور دوسرے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ بیٹی بڑی خوبصورت تھی اور جب وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی لانبی دراز پلکیں، گویا بڑی کوشش سے اُٹھا کر، کسی کی طرف دیکھتی تو دیکھنے والے کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اُس کے شرمیلے سوگوار حُسن میں اک عجیب طرح کا بلاوا تھا اور اُس کی بھرپور جوانی سے لچکتی ہوئی چال میں ایسی کشش تھی جیسے وہ کہیں بھاگی نہ جا رہی ہو بلکہ لوگ اُس کے پیچھے بھاگے بھاگے آ رہے ہیں۔ وہ ہم سب لوگوں کے بیچ میں گھری ہوئی اک شمع کی مانند نظر آ رہی تھی جس سے زندگی کے اس چار خانے میں اُجالا سا ہو گیا تھا۔ ہر شخص کنکھیوں سے اُسے دیکھ لیتا تھا اور پھر آگے چل دیتا تھا۔ موت سر پر کھڑی تھی مگر اس حُسن کے بلاوے سے انکار کی

رأت کسی میں نہ تھی؛ ہر شخص رک کر ایک نظر سے اُسے دیکھنے پر مجبور تھا۔

میں بنیے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد میں نے بنیے سے پوچھا؛

''کہاں سے آرہے ہو؟''

''کہیں سے بھی آرہے ہیں، تمہیں کیا، بنیے نے بڑے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

دیر تک خاموشی رہی۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ آخرکار میں نے پھر ہمت کر کے پوچھا؛

''یہ تمہاری لڑکی ہے؟''

''اور کیا تمہاری ہے؟'' بنیے نے میری طرف غرا کے کہا اور زور سے اُس لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

اس لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا؛ جیسے جھیل میں دو کنول کھل گئے ہوں، جیسے جھیل کا پانی ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا ہو، جیسے میں اُس جھیل میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ وہ شگفتہ، شفاف، شرابی نگاہ...... شمپین سی چھلکتی ہوئی!

اُف...... اُف...... میں نے گھبرا کر منہ موڑ لیا۔ میں دراصل ان معاملوں میں بے حد کمزور ہوں۔ حاجی، برک، میاں، سب اس بات کو جانتے ہیں اور اپنے دل بھی پہچانتے ہیں، اور گو اس معاملے میں وہ ہمیشہ میری طرح کمزوری دکھاتے ہیں مگر وہ لوگ بڑے پیچیدہ اور پُراسرار ہیں اور ہمیشہ اپنی کمزوری چھپاتے ہیں اور میں ہوں گدھا، بے وقوف۔ مجھ سے چھپایا نہیں جاتا...... یہیں پر مار کھاتا ہوں۔

بنیے کو برافروختہ دیکھ کر میں نے اُس سے مزید گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا مگر میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اُس لڑکی کی بغل میں ایک سکھ نوجوان چل رہا ہے۔ اُس نوجوان کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ چہرے پر بڑی باریک سی، خوبصورت سی داڑھی تھی جو اس کے چہرے کو اور بھی پُروجیہہ بناتی تھی۔ وہ جوان اور بنیے کی یہ لڑکی ایک دوسرے سے متعارف بھی نہ تھے پھر بھی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور گو ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے پھر بھی ایک دوسرے کو میٹھی میٹھی کنکھیوں سے دیکھ لیتے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو

میں جلتا اور کڑھتا رہا، مگر جب میں نے دل ہی دل میں اپنا اور اُس سکھ جاٹ کا موازنہ کیا،
اپنے آپ کو ہر اعتبار سے کمتر پایا، تو میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اک آہ بھر کر آخری بار اُس
لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آگے بڑھ گیا اور قافلے کے اگلے چار خانے میں شامل
ہوگیا۔ اب میری کوشش یہ تھی کہ اپنے کسی جان پہچان کے آدمی سے ملاقات ہو جائے یا کوئی
اپنے گاؤں کا آدمی ملے جس سے اپنے خاندان والوں یا اپنے بیوی بچوں کی کوئی خبر ملے
پھر مجھے بھوک بھی زور کی لگ رہی تھی۔ اگر اُس آدمی کے پاس روٹی ہوئی تو میں ایک آدھ
روٹی بھی اس سے مانگ لوں گا۔ مگر تلاشِ بسیار کے بعد بھی مجھے کوئی ایسا آدمی نہ ملا اور میں
اس سلسلے میں بھی مایوس ہو گیا۔

دوپہر کے وقت قافلے نے ایک کھلے بریتے میں آرام کیا۔ یہاں پر کماد کے کھیت
ختم ہو جاتے تھے اور دریائی گھاس شروع ہو جاتی تھی۔ چند ٹیلوں پر ٹاہلیوں کے جھنڈ اپنے
مٹیالے پتوں کے لیے کھڑے تھے۔ دور سے راوی کا کنارہ نظر آ رہا تھا، موہوم سا اور اُفق
میں ڈوبتا ہوا۔ آسمان گدلا اور خبیث تھا۔ زمین سوکھی اور چرخ نظر آتی تھی۔ گرد و غبار
لوگوں کے چہرے اٹے ہوئے تھے۔ لوگ ماتھے پر ہتھیلیاں رکھ رکھ کر ڈیرہ بابا نانک کے پل
کو تلاش کر رہے تھے مگر پل کو جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان۔ پل کہیں پر نظر نہ آتا تھا اور
سب لوگ پل کی تلاش میں آئے تھے۔ قافلے کے لیڈروں نے محلِ وقوع دیکھ کر اندازہ لگایا
کہ وہ لوگ ذرا راستے سے بھٹک گئے تھے۔ اب اُس پل تک پہنچنے کے لے تین میل مغرب
کی طرف جا کر، دائیں سے بائیں مڑ کر، پانچ میل اور جانا ہوگا۔

لوگ دو چار، دس بیس کے گروہوں میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ قافلے کے ...
اور سکھ جوان اِدھر اُدھر پہرہ دینے لگے۔ لاٹھیوں، چھریوں، کرپانوں، گنڈاسوں اور ...
بندوقوں سے مسلح۔ کچھ لوگوں کے پاس پستول بھی تھے۔ کچھ لوگ یونہی ڈنڈے اُٹھا ...
خشونت آمیز نگاہوں سے فضا کو تک رہے تھے مگر اس اُوپری سختی اور خشونت کے باوجود ...
کے دل اندر سے سہمے ہوئے تھے اور وہ جو کبھی کبھی آنکھوں میں اک چور سی، ڈری ہوئی، سہمی
ہوئی سی نگاہ جھلک جاتی تھی وہ گویا دل کا سارا راز کہہ دیتی تھی۔

مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں پھر اُسی بنیے اور اُس کی لڑکی کے پاس چلا گیا، یعنی ...

گروہ میں وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ وہ لڑکی چپ چاپ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھی کھانا کھاتی رہی۔ اُس کی طرف پیٹھ موڑے ہوئے وہی خوبصورت اور باوقار سکھ نوجوان کمال لاپروائی سے اپنا کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ بھیڑ زیادہ تھی، جگہ کم تھی اس لیے اُس خوبصورت لڑکی کی پیٹھ اُس نوجوان سکھ کی پیٹھ سے لگی ہوئی تھی۔ جانے کیسی کیسی بجلیاں اس وقت دونوں کے جسموں میں دوڑتی ہوں گی، میں نے جل کر سوچا، مگر اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ بھوک نے بے تاب کر دیا۔ میں نے دو تین آدمیوں سے کھانا مانگا مگر کسی نے نہیں دیا۔ آخر سردار لہنا سنگھ اور اُس کی بنتو نے مجھے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ سب سے زیادہ ہیکڑی دکھانے والا اُس خوشحال زمیندار کا گھرانہ تھا جو بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ اُن کے بچے اس موقعے پر بھی ایسی شان اور امارت کا ثبوت دے رہے تھے گویا وہ اس بیل گاڑی میں نہیں بیوک میں سفر کر رہے ہوں!

ہم لوگ ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ اچانک ٹیلوں کے پیچھے سے گرد وغبار کا طوفان اُڑتا نظر آیا۔ پہرے داروں نے شور مچایا اور لوگ اپنا اپنا کھانا چھوڑ کر بھاگے۔ خوشحال خاندان کے بچے بیل گاڑی پر کھڑے رونے لگے اور اُن کی مائیں دوہتڑ چھاتی کوٹنے لگیں۔

لہنا سنگھ نے بنتو سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اُس سے کہا:

''اپنے ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ دے!''

بنتو نے زور سے کلائی پر کلائی مار کر کانچ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔

لہنا سنگھ نے اپنے ہونٹ بھینچ کر کہا:

''سمجھ لے آج سے تیرا خاوند مر گیا۔''

بنتو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

لہنا سنگھ چھری ہلاتا ہوا مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پہرے داروں کے ساتھ چلا گیا۔ بنتو گٹھڑی سر پر اُٹھائے اُسے دیکھتی رہی۔ بنیے نے گھبرا کر اپنا مال سمیٹا اور پھر چیخ مار کر بولا: ''ہائے میری لڑکی...... جمنا...... جمنا......''

مگر جمنا کو وہ سکھ نوجوان اپنے بازوؤں میں اُٹھائے کماد کے کھیتوں کی جانب بھاگا

چلا گیا۔ بنیے نے چیخ کر، چلا کر بہت فریاد کی مگر اُس وقت عجیب نفسا نفسی کا عالم تھا۔ مسلمان حملہ آوروں نے قافلے پر حملہ کر دیا تھا۔ سب لوگ اپنی جان بچانے کی فکر میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کس کو پڑی تھی کہ اپنی جان بچانے کے بجائے اس بنیے کی لڑکی کی عزت بچاتا!

میں بھی ایک طرف کو بھاگا۔ پہلے تو ریتے سے دریا کی طرف بھاگا کیونکہ ٹاہلیوں کے جھنڈ کے پیچھے سے مسلمان حملہ آور ہو رہے تھے اس لیے میں مخالف سمت کو بھاگا مگر جب حملہ آور اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دریا کا راستہ بھی روکنے لگے تو میں اُدھر سے پلٹ کر ہانپتا کانپتا کمادوں کی طرف ہولیا۔ ابھی کمادوں میں پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ کھیتوں میں سے بھی حملہ آور نکل آئے اور ایک مسلمان نے اپنا بلم میرے سینے پر رکھ دیا۔

وہ لمحہ مجھے یاد ہے؛ اور کبھی نہیں بھولتا؛ اور کبھی نہیں بھولے گا۔ بلم میرے سینے پر تھا اور میرے چاروں طرف مسلمان حملہ آور کھڑے تھے اور اُن کے پیچھے ایک بڑے گھوڑے پر ایک سوار اپنی پگڑی کے شملے سے اپنا آدھا چہرہ چھپائے رکابوں میں پاؤں ڈالے بیٹھا تھا۔

یکا یک میں نے روکنے کے انداز میں ہاتھ اُونچا کیا اور مسکرا کر اُس سوار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنس کر کہا؛ ''کیا قسمت ہے ہماری بھی؛ ساری زندگی کمیونسٹ بن کر پاکستان کے لیے پروپیگنڈا کرتے رہے، مسلمانوں کے حقِ آزادی کے لیے لڑتے رہے اور آج جب پاکستان بن گیا ہے یہ بلم ہمارے ہی سینے پر رکھا جا رہا ہے!''

جانے کس طرح سے یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے؛ وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھ سے یہ الفاظ کہلوائے کیونکہ نہ تو میں کبھی کمیونسٹ تھا نہ میں نے آج تک کسی سیاسی تحریک میں حصہ لیا تھا۔ میں تو ایک کھانے پینے والا خوشباش انسان تھا جس کے ہندو، مسلمان، سکھ دوست بھی سبھی اسی طرح کے تھے۔ ہم لوگ لاہور میں اپنا اپنا بزنس کرتے تھے اور شام کو چار یار اکٹھا ہو کے دادِ عشرت دیتے تھے۔ ہمیں سیاست سے کیا علاقہ؟ ہماری سیاست تو زبانی بحثوں، اخباری جھگڑوں اور کتابی مطالعوں تک محدود تھی! یہ تو بھوکے لوگوں کی باتیں ہیں۔ پھر...... کس طرح سے میرے دماغ نے اس لمحے میری جان بچانے کا یہ آخری بہانہ یا حربہ ڈھونڈ لیا تھا۔ میں اس کے بارے میں آج بھی سوچ سوچ کر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اتنا جانتا ہوں کہ میرے ان الفاظ کا اُس مخالف مجمعے کے گھڑسوار سردار پر بجلی کا

سا اثر ہوا۔ اُس نے تیز نگاہوں سے میرے خاموش، مطمئن، مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا:

''اسے چھوڑ دو۔''

مسلمان نے بلم میرے سینے سے ہٹالیا اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ لوگ آگے بڑھے اور قافلے پر ہلہ بول دیا۔

جوں ہی میں نے اپنے آپ کو اکیلا پایا میں سرپٹ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ کدھر کو بھاگا۔ کیسے بھاگا، کس طرف بھاگا؟ یہ آج بھی نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ میں سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ میں کمادوں سے گزر رہا تھا۔ میں کھیتوں کی مینڈھوں پر سے دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ میں گڑھوں میں گر رہا تھا۔ پانی دینے والی نالیوں میں سے گزر رہا تھا۔ ٹیلوں پر چڑھ رہا تھا۔ ریتیلے میدانوں میں سے گزر رہا تھا۔ ریلوے لائن کی پٹڑی پر بھاگ رہا تھا۔ ایک شکار کیے جانے والے جانور کی طرح اپنے جسم اور روح کا سارا زور لگا کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ کس طرف بھاگ رہا تھا؟ کیونکر بھاگ رہا تھا؟ کیسے بھاگ رہا تھا؟ کتنی دیر تک بھاگتا رہا؟ اِن سب باتوں کے بارے میں آج بھی وثوق سے کچھ نہیں بتا سکتا۔

اتنا یاد ہے کہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو اچانک دربار صاحب کرتار پور کے گوردوارے کے سامنے پایا۔ گوردوارے کے مضبوط دروازے پر ایک آہنی تالا پڑا تھا اور دروازے کے ایک طرف لکڑی کے ایک بڑے اور پرانے تخت پر ایک بڈھا سکھ اور اُس کی بڈھی عورت بیٹھے ہوئے اُونچی آواز میں گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک لحظے کے لیے چپ ہو گئے۔ میں اُنہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''بابا جی، آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟'' میں نے اُس بڈھے سکھ سے پوچھا، ''کیا آپ کو کچھ معلوم نہیں ہے!''

''ہمیں سب معلوم ہے، بیٹا!'' اُس بڈھے سکھ نے کامل طمانیت سے کہا، ''تو بھی ہم اس لیے بیٹھے ہیں یہاں سے جائیں تو کہاں جائیں؟ ہماری کوئی اولاد نہیں، کوئی بال بچہ نہیں، دور دور تک کوئی رشتے دار نہیں، کوئی جائیداد نہیں، کوئی گھر نہیں۔ ہم دونوں نے ساری عمر جس گورو کے چرنوں میں بیٹھ کر کاٹی ہے، یہیں رہیں گے، یہیں مریں گے!''

اتنا کہہ کر وہ دونوں پھر گورونانک کی بانی کا پاٹھ کرنے لگے۔

میں سر جھکا کر وہاں سے چلا آیا۔ گوردوارے کے چاروں طرف گھوما۔ کہیں پر کوئی متنفس نہ نظر آیا، اور اب تو رات پھیلتی جا رہی تھی کہیں پر کوئی راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔

گوردوارے کے قریب ایک بڑا کنواں تھا۔ میں اُس کی جگت پر چڑھ گیا اور رہٹ کا سہارا لے کر کنویں کے اندر چلا گیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے رہٹ کا چکر پکڑ لیا اور اپنے جسم کو ٹنڈوں پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ٹنڈوں کا لمس میرے تھکے ہوئے جسم کو بہت اچھا معلوم ہوا اور میں اُسی کنویں کے اندر، اُنہیں ٹنڈوں پر لیٹا لیٹا سو گیا۔ کیسے سویا؟ کب تک سویا رہا؟ یہ تو میں نہیں جانتا۔ ہاں جب اُٹھا تو صبح ہو چکی تھی۔ سورج کی روشنی کنویں کے اندر جھانک رہی تھی اور کنویں کی جگت پر ایک کتیا آسمان کی طرف منہ اُٹھائے رو رہی تھی۔

میں کنویں سے باہر نکلا اور گوردوارے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

باہر لکڑی کے تخت پر وہ بڈھا سکھ اور اُس کی بیوی مردہ پڑے تھے۔ پتہ نہیں کب اور کس وقت رات کو حملہ آوروں نے اُنہیں قتل کر دیا تھا!

ساتواں باب

گوردوارے سے چند فرلانگ آگے نکل کر راستہ صاف تھا۔ اب راوی کا کنارہ صاف نظر آنے لگا تھا اور دریا کا پل بھی۔ اِکا دُکا رفیوجی بھی بھاگتے ہوئے دریا کی جانب بڑھتے ہوئے نظر آنے لگے۔ انہی لوگوں میں میں نے جمنا کو دیکھا لیکن جمنا کے ساتھ اب وہ سکھ نوجوان نہ تھا، ایک گورا چٹا سرخ سرخ گالوں والا پشاوری نوجوان تھا اور اُس نے جمنا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ جمنا نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا پھر آنکھیں جھکا لیں۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

میں نے جمنا سے پوچھا: ''تمہارے پتا کا کیا ہوا؟''

''مارا گیا!''

''اور......اور......وہ؟''

''وہ بھی مارا گیا۔''

جمنا نے گردن اور بھی نیچے جھکا لی۔ وہ پشاوری نوجوان کمر بند کے پستول پر ہاتھ رکھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا:

''چلو، چلو۔ آگے بڑھو۔ فضول باتیں مت کرو!''

میں فوراً اُس سے الگ ہو کر آگے بڑھ گیا۔ روحی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے دو تین بار اُسے دھتکار دیا۔ مگر پھر بھی وہ مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتی ہوئی، پیار سے دم ہلاتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے آتی رہی۔

دریا اب قریب آ رہا تھا۔ راوی کا پل بھی اب واضح صورت میں میرے سامنے

نمودار ہو چکا تھا۔ مگر میں نے پل پر سے گزرنا مناسب نہ سمجھا۔ پل کے پاکستانی کنارے پر مسلمان حملہ آوروں کی آماجگاہ تھی اور پل کے ہندوستانی کنارے میں ہندوستانی حملہ آوروں کے اڈے تھے، اور ہندو اور مسلمانوں کے قافلے دونوں طرف سے لوٹے اور مارے جاتے تھے۔ صرف پل پر فوج کا پہرہ تھا جس کی کمان ایک انگریز افسر کے ہاتھ میں تھی لیکن اُس کا کام صرف اتنا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے قافلے کو باری باری پل پر سے جان و مال کی سلامتی کے ساتھ گزر جانے دے۔ پاکستان میں کیا ہوتا ہے، ہندوستان میں کیا ہوتا ہے، اس کا وہ ذمے دار نہ تھا۔ اب میں دریا کے کنارے پر کھڑا تھا۔ کنارے کے اُس پار جان کی سلامتی تھی۔ سامنے کے کنارے پر مجھے سینکڑوں خیمے اور چھولداریاں نظر آ رہی تھیں۔ ہزاروں لوگ دریا کے کنارے دھوپ میں بیٹھے تھے یا لیٹے تھے۔ عورتیں بال کھولے ایک دوسری کی جوئیں چن رہی تھیں۔ کچھ کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ بچے ریت میں گھروندے بنا رہے تھے اور خوشی سے چلاتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

سامنے کنارے پر سلامتی تھی اور ایک نئی زندگی کی نوید؟

اور میں اس کنارے موت اور زندگی کے درمیان کھڑا سوچ رہا تھا: اُس کنارے تک کیسے پہنچوں؟ اگر پل پر سے جاتا ہوں تو راستے میں مسلمانوں کی کمین گاہوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور جس جان کو میں اب تک کسی نہ کسی طرح بچا کر اس دریا کے کنارے تک آیا تھا اُسے اب میں مزید خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھا۔

روی میری ٹانگوں میں کھڑی ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے لگی۔

میں نے اُسے لات مار کر کہا: ”چلی جا۔ بھاگ جا۔ واپس چلی جا۔“

مگر کتیا وہیں کھڑی ٹیاؤں ٹیاؤں کرتی رہی۔

سوچ سوچ کر آخر میں نے اپنی ہمت بیدار کر لی۔ میں نے اپنے کپڑے اُتار دیے اور آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ دوسرے کنارے سے کچھ لوگ مجھے دریا میں چھلانگ لگاتے دیکھ کر چلائے:

”دوڑو...... دوڑو...... وہ بے چارہ ایک ہندو نوجوان ڈوب رہا ہے۔ اُسے بچاؤ“

میں دریا میں تیرنے لگا۔

رومی کنارے پر کھڑی تھی۔ چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی رہی۔ اُس کے دل کے اندر جنگ ہو رہی تھی شاید۔ وہ میرا ساتھ دے یا اپنے ہونے والے بچوں کا جو اُس کے پیٹ میں تھے؟ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کر رہی تھی۔

مڑ جا، رومی! رومی، واپس چلی جا!

مگر رومی نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔

پانی کا ریلا زور پر تھا۔ پھر بھی رومی اپنی پوری طاقت استعمال کر کے میرے پیچھے پیچھے آنے کے لیے تیر رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی سی تھوتھنی پانی سے ذرا باہر نکلی ہوئی تھی اور اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ڈر اور وحشت کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سی مضبوطی اور ضد اور ہمت اور بہادری کی جھلک تھی۔

میں نے چلا کر کہا: ”رومی، واپس چلی جا۔ واپس چلی جا۔ میرے پیچھے مت آ۔“

رومی اپنی پوری قوت سے میرے پیچھے پیچھے تیرتی رہی۔

پھر پانی کا ایک زور کا ریلا آیا اور رومی ڈوبنے لگی۔ میں نے رومی کو پہلے تو اپنے سے دور جاتے دیکھا۔ اُسے بے بسی سے منہ زور لہروں میں ہاتھ پاؤں ہلاتے دیکھا۔ پھر اُس کی تھوتھنی ڈوب گئی۔ پھر اُس کی آنکھیں ڈوب گئیں۔ آخر میں اُس کے کان ڈوب گئے اور لڑھکنیاں کھاتی ہوئی اُس کی لاش پانی کے دھارے میں ڈوب گئی۔

تجھی کو مرنا تھا رومی؟ تجھی کو میرا ساتھ دینا تھا؟ جب سب ساتھ چھوڑ گئے۔ جب ملک نے ساتھ چھوڑ دیا اور زمین نے اور گلی نے اور خاندان نے اور گھر والوں نے اور دوست احباب نے۔ جب اُس دھرتی نے بھی اپنا ساتھ چھوڑ دیا۔ جس کے ساتھ ہزاروں سالوں سے ہم نے محبت کا عہد و پیمان باندھا تھا۔ تو کیا تیری ایسی حقیر کتیا نے ہی میرا ساتھ دینا تھا؟ انسان کو یہ دکھانے کے لیے، یہ جتانے کے لیے کہ قدرت آج بھی اپنے دل میں محبت رکھتی ہے! اور فطرت آج بھی اُلفت اور مہر و وفا کا سبق سکھاتی ہے۔ بے وقوف، بے جان، احمق کتیا، کس لیے تو نے اپنی جان ختم کر دی، کس لیے تو نے اُس حقیر انسان کے لیے اپنے بچوں کی قربانی دے دی جو آج اپنے مقصد سے ہٹ چکا ہے اور ظلم و ستم کے لہو سے

اپنے مستقبل کو داغدار کر رہا ہے۔

رومی مرگئی اور اُس کے ساتھ شاید ایک عہد مرگیا، ایک تہذیب مرگئی، ایک داستان مٹ گئی، تاریخ کا ایک ورق اُلٹ گیا، اور میری آنکھوں سے آنسو اُبلنے لگے، اور مجھے یہ معلوم نہ ہوا کہ میں آنسوؤں کے دھارے میں تیر رہا ہوں یا پانی کے دھارے میں۔ کس طرح میں دوسرے کنارے پہنچا؟ یہ بھی مجھے یاد نہیں۔ شاید یہی آنسوؤں کا دھارا مجھے بہا کر دوسرے کنارے لے گیا۔ شاید مرتے وقت رومی نے اپنی قوت بھی مجھے بخش دی تھی۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ جب میں دوسرے کنارے کے قریب پہنچا تو چند نوجوانوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر کنارے پر کھینچ لیا۔

پھر ایک عورت نے کہا؛ ''ہئے ہئے یہ تو بالکل ننگا ہے!'' اور یہ کہہ کر اُس عورت نے اپنا دوپٹہ میرے ننگے جسم پر ڈال دیا۔

پھر میں بے ہوش ہوگیا!

آٹھواں باب

دوسرے دن شرنارتھیوں کے کیمپ میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر میں نے اپنے خاندان والوں کو ڈھونڈ لیا۔ واضح رہے کہ ہندو اور سکھ، جو اُدھر سے لٹ لٹا کے آئے ہیں، انہیں شرنارتھی کہا جاتا اور اِدھر سے جو مسلمان لٹ لٹا کر اُدھر جاتے ہیں اُنہیں مہاجر کہا جاتا ہے۔ ہندو کبھی مہاجر نہیں ہوسکتا اور مسلمان کبھی شرنارتھی نہیں ہوسکتا۔ شدید سے شدید مصیبت میں بھی یہ تفریق روا رکھی جاتی ہے۔ میرے گھر والے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مارے خوشی کے رونے لگے۔ میری بیوی ایک الگ کونے میں ایک میلا کچیلا پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہنے بیٹھی تھی اور اس کے تن پر اور کوئی کپڑا نہ تھا کیونکہ وہ اسی حالت میں گھر سے بھاگی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا: ''منا کہاں ہے!''

وہ کچھ نہ بولی۔ چند لمحے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی۔ آخر میں میرے پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آخر میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ ''منا کو مسلمانوں نے مار ڈالا۔ وہ تو تمہاری بیوی کو بھی لے جاتے مگر وہ بیچاری تو کسی نہ کسی طرح بچ گئی مگر بہن کو وہ اُٹھا کے لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ مدد دیر میں پہنچی۔''

''بہن سروج بھی......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر میں دھم سے فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ مجھ میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ خون میرے رخساروں میں چڑھا آرہا تھا اور مارے غصے کے میرے کان بجنے لگے تھے اور میں محسوس

کر سکتا تھا کہ میرے لہو میں ایک طوفان سا اُبل رہا ہے۔ میں نے زور سے اپنی کنپٹیوں کو پکڑ لیا کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دماغ ابھی پھٹ جائے گا۔

''نہیں۔ نہیں۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا، ''ایسا نہیں ہوسکتا!''

''ہزاروں کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔'' میرے بھائی نے مجھے صبر دلاتے ہوئے کہا، ''تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہوسکتا۔''

اب تک میں اپنے آپ کو ایک بے حد روادار، مرنجاں مرنج، غیر متعصب سا ہندو سمجھتا تھا جس کے حلقۂ احباب میں اکثریت مسلمانوں کی تھی، جس نے آج تک کسی فرقہ وارانہ تحریک میں، کسی ایسی سیاسی اور سماجی تحریک میں حصہ نہ لیا تھا جنہوں نے گزشتہ پچاس سال سے پنجاب کی فضا کو متعفن کر رکھا تھا۔ اب تک مجھے اپنی روشن خیالی اور آزاد روی پر بڑا ناز تھا لیکن اپنے بچے کے قتل اور بہن کے اغوا کا قصہ سنتے ہی جیسے میرا خون اُبل پڑا، لاوے کی طرح کھولنے لگا اور میں وہیں بیٹھے بیٹھے مسلمانوں کو مغلظات سنانے لگا۔ یہ نفرت کہاں سے میرے دل میں آ گئی تھی؟ اپنے احساس کی شدت اور نوعیت پر میں خود ایک لمحے کے لیے حیران بھی ہوا مگر پھر انتقام اور غم اور غصے کے جذبات کے ریلے میں میرے تمام اچھے خیالات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور میں جوشِ انتقام میں دیوانہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے غصے سے چلا کر کہا، ''مجھے کوئی چاقو دو۔ چاقو۔ کوئی چھری دو۔ چھری۔''

میرے بھائی نے میرا ہاتھ پکڑا، ''کیا کرتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟''

''میں ختم کر دوں گا۔ میں جان سے مار دوں گا۔ میں ایک ایک مسلے کا گلا کاٹوں گا!'' میں زور زور سے چیخنے لگا۔

''کیا ہوا بھائی صاحب؟ کیا ہوا ہے آپ کو؟'' میرے بھائی نے مجھے پکڑ کر اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔

لیکن میں نے زور لگا کر اپنے آپ کو اُس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور چلاتا ہوا غیض و غضب میں انتقام کی دھمکیاں دیتا ہوا وہاں سے باہر نکل گیا......

چند گز دوڑنے کے بعد میں رک گیا اور سوچنے لگا۔ کچھ اور لوگ بھی تو ہوں گے۔ کچھ اور لوگ بھی تو میرے ہم خیال ہوں گے۔ مجھے اُنہیں ڈھونڈنا چاہیے......

بہت جلدی مجھے وہ لوگ مل گئے۔ پیپل کے ایک تناور درخت کے نیچے ایک لمبا سا کیو اگا تھا میں نے قریب جا کر ایک آدمی سے پوچھا، جو ایک پھٹی قمیض اور میلی سی پتلون پہنے تھا؛

''یہاں کیا راشن ملتا ہے؟''

وہ نوجوان ہنسا، بولا؛ ''ہاں، یہاں Sex کا راشن ملتا ہے!''

''کیا مطلب؟''

وہ بولا؛ ''ایک مسلمان لڑکی ہتے چڑھی ہے۔ ہم لوگ اُس کی بے عزتی کر رہے ہیں۔''

میں نے سامنے کے کیو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو گنا۔ مجھ سے آگے پچیس آدمی تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے پیچھے پندرہ آدمی اور آ کے کھڑے ہو گئے......

''یہ کیو کب تک رہے گا؟'' میں نے اُسی نوجوان سے پوچھا۔

''جب تک وہ لڑکی مر نہیں جاتی!'' نوجوان نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک تو میں کیو میں کھڑا رہا۔ لوگ باری باری آگے بڑھتے تھے۔ پھر بھی کیو بہت لمبا تھا اور اُس لڑکی کی چیخیں بڑی دلخراش تھیں۔

کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے دھیرے مسل رہا ہو۔ اُس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔

''وے بھراوا، میں تیری بہن آں۔ وے ویرا، میں تیری بہن آں۔''

میں نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ پھٹی قمیض والا نوجوان اپنی میلی پتلون سہلاتا ہوا میری طرف زور سے قہقہہ مار کر بولا؛

''بزدل!''

مگر میں وہاں سے سرپٹ بھاگ لیا۔ بھاگتے ہوئے اپنے کلوں پر طمانچے مارتے ہوئے، روتے روتے میں اپنے دل کو واپس جانے پر مجبور کرنے لگا۔ میں نے منا کی بھولی صورت کو اپنی یادوں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ میں نے اپنے جذبۂ انتقام کے لیے اپنی بہن سروج کی معصوم صورت کا سہارا لینا چاہا مگر ہر بار سروج کی صورت پگھل جاتی تھی اور پگھل کر اُس مسلمان لڑکی کی صورت میں بدل جاتی تھی...... میری روح کے ویرانوں میں یہ ازلی عورت کی پکار گونجنے لگی اور چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگی؛

''وے بھراوا...... وے ویرا۔ اوئے ویرا میں تیری بہن آں۔''

بھاگتا بھاگتا میں پل کو جانے والی سڑک کے قریب چلا گیا۔

مسلمانوں کا ایک قافلہ گزر چکا تھا۔ صرف چند لوگ باقی رہ گئے تھے۔ سڑک سے اُتر کر چند گز کے فاصلے پر کچی زمین میں وہ ایک قبر کھود رہے تھے۔ قریب ایک دیہاتی مسلمان کی لاش پڑی تھی۔ صرف دھڑ اپڑا تھا جس کے اوپر اُنہوں نے ایک کپڑا ڈال رکھا تھا۔ سر کہیں نظر نہ آتا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

سڑک پر سے ایک بڈھا مسلمان ایک سر۔ کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھائے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے آنسو پونچھتا، اپنے ہاتھوں میں رکھے سر کو دیکھتا تھا اور دھاڑیں مار مار کر رو رو کر کہتا تھا:

''میرا بیٹا...... میرا بیٹا......''

آس پاس کے لوگ سب چپ کھڑے تھے۔

بڈھا بے سر کی لاش کے پاس آ کے دوزانو ہو گیا۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح سر کو دھڑ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا:

''میرا بیٹا! میرا بیٹا!!!''

سب لوگ چپ چاپ کھڑے تھے۔

''میرا ایک ہی بیٹا تھا فجا......''

بڈھے نے زمین سے آسمان تک دیکھ کر کہا:

''ہر ایک بیٹا...... میرا فجا۔''

قبر کھدتی رہی۔ گہری ہوتی گئی۔

بڈھے نے آخری بار اپنے بیٹے کی پیشانی کو چوما...... فجے کا ماتھا صبیح تھا اور اُس کی پیشانی پر گھنگھریالے بال اُلجھ گئے تھے اور اُس کے ہونٹ پتلے پتلے اور نہایت خوبصورت تھے اور وہ اپنے خاموش سوتے ہوئے چہرے سے تکش شلا کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی بدھ

لی کسی مورت سے مشابہ تھا۔

قبر کھد گئی۔ دور سے ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعروں کی آواز آنے لگی۔

قبر کھودنے والوں نے جلدی جلدی سے لاش کو قبر میں سرکا دیا اور اُس کے اُوپر مٹی ڈالنے لگے۔ پہلے تو بڈھے مسلمان نے اُنہیں روکا مگر جب دو ایک آدمیوں نے اُسے زور سے جھڑک دیا تو بڈھے نے بے بس ہو کر دعا کے لے دونوں ہاتھ بلند کر لیے۔

ست سری اکال! ہر ہر مہادیو!

جلدی سے اُن لوگوں نے قبر کو مٹی سے بھر دیا اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

صرف بڈھا اُس قبر پر بیٹھا سورۃ فاتحہ پڑھتا رہا۔

''سب تعریف واسطے اللہ کے۔ پرودگار عالموں کا۔ بخشش کرنے والا۔ مالک ہے روز جزا کا۔ تجھی کی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ دکھا ہم کو راہ سیدھی۔ راہ اُن لوگوں کی کہ نعمت کی تو نے اُوپر اُن کے

''سوا اُن کے جن پر غضب کیا گیا ہے اور نہ گمراہوں کی۔

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَلٰمِین......''

ست سری اکال! ہر ہر مہادیو!

ہوا میں برچھے چمکے اور بڈھے مسلمان کا جسم چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

مرنے والے کی زبان پر آخری نام خدا کا نام تھا اور مارنے والے کی زبان پر خدا نام تھا، اور اگر مرنے اور مارنے والوں کے اُوپر، بہت دور اُوپر، کوئی خدا تھا تو بلا شبہ بے حد ستم ظریف تھا!

میں وہاں سے بھی بھاگ لیا لیکن اب میری سمجھ میں بالکل یہ نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں سے بھاگ کر جاؤں تو کہاں جاؤں؟

دوسرے دن صبح ہماری کیمپ میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ مسلمانوں کو ایک بہت بڑا قافلہ پل پر سے گزرے گا، دوپہر کے وقت۔ لگ بھگ چالیس پچاس ہزار نفوس پر یہ قافلہ مشتمل ہوگا۔ اس خبر کو سن کر ہندو اور سکھ نوجوانوں کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور وہ لوگ حملے کی تیاریوں میں منہمک ہو گئے۔ نواحی دیہات کے جاٹوں کو بھی مدد کے لیے پکارا

گیا اور تمام انتظامات جلدی جلدی مکمل کیے جانے لگے۔

یہ تو بالکل طے تھا کہ پل کا نگران افسر پورے قافلے کو ایک ساتھ نکل جانے کا حکم نہ دے گا کیونکہ وقت پہلے سے بٹ چکا تھا۔ دو گھنٹے کے لیے پل کو راوی پار سے آنے والے ہندو قافلوں کے لیے کھولا جاتا تھا اور دو گھنٹے اِدھر سے مسلمانوں کے قافلے گزرنے کے لیے دیے جاتے تھے۔ اس طرح باری باری دونوں طرف کے قافلے گزرتے تھے۔

لیکن قافلے اتنے بڑے بڑے ہوتے تھے کہ سب لوگ ان دو گھنٹوں میں نہیں گزر سکتے تھے۔ پھر بالعموم قافلے کے پہلے حصے میں مدافعت کا انتظام بھی عمدہ ہوتا تھا۔ جوں جوں لوگ قافلے کی دم بنتے جاتے یہ مدافعتی نظام ڈھیلا ہوتا جاتا۔ اسی لیے دونوں طرف سے جو لوگ ان قافلوں پر حملہ آور ہوتے تھے وہ قافلے کے پہلے حصے کو خیریت سے گزر جانے دیتے اور جب انگریز افسر پل کے بیچ میں کھڑا ہو کر ہاتھ کے اشارے سے قافلے کو روک دیتا تو آگے جانے والے تو اپنی جان کی خیریت مناتے ہوئے جلدی سے گزر جاتے لیکن پیچھے رہ جانے والے قافلے کے لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں کیونکہ یہ سب کو معلوم تھا کہ اب پل دو گھنٹوں کے بعد کھلے گا۔ بس حملہ آور انہیں دو گھنٹوں کو غنیمت جان کر باقی ماندہ قافلے کے کمزور حصوں پر حملہ کر دیتے تھے اور سینکڑوں انسانوں کو لوٹ کر، گھائل کر کے اور جان سے مار کر بھاگ جاتے تھے۔ راوی کے دونوں کنارے، پل کے اِدھر بھی اور اُدھر بھی، ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔

دوپہر کے وقت میں بھی پل سے کوئی سو گز دور، سڑک کے قریب کھڑا ہو کر گزرتے ہوئے قافلے کو دیکھنے لگا۔ سڑک کے دونوں طرف ہندوؤں اور سکھوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے تھے۔ کچھ لوگ خاموش کھڑے تھے، کچھ لوگ استہزائیہ انداز میں فقرے کس رہے تھے۔ جو جتنا بڈھا تھا اُتنی ہی مغلظات قافلے کے مسلمانوں کو سناتا تھا اور وہ لوگ سر جھکائے چلے جا رہے تھے...... گٹھڑیاں اُٹھائے ہوئے، بچوں کو بغل میں دابے ہوئے، کمزوروں کو سہارا دیتے ہوئے، بچوں کو ڈانٹتے ہوئے، اپنی بہو بیٹیوں کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے...... چل رہے تھے۔ ایک کمزور، منحنی سے ہندو لڑکے نے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے ایک مسلمان لڑکے پر تھوک دیا۔

مسلمان لڑکے کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے گھونسا تانا اور سڑک سے باہر نکلنے ہی کو تھا کہ اُس کے باپ نے اُسے پکڑ لیا اور جھڑک کر اُسے سڑک سے ہٹا کر دوسری طرف کر لیا اور پھر وہ چلتے چلتے اُس ہندو لڑکے اور اُس کے ساتھ کھڑے ہوئے جوان ہندوؤں سے معذرت کے انداز میں بولا؛

''معاف کرنا، بچہ ہے نا!''

ہندو لڑکا، جو پہلے تو ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا تھا، اب شیر ہو کر آگے بڑھ آیا اور اپنی باریک، منحنی آواز میں مسلمانوں کو گالیاں دینے لگا۔ اُس کے اِرد گرد کے لوگ اُس کی بہادری پر بے حد خوش ہو رہے تھے!

ایک ادھیڑ عمر کا ہندو بولا؛''دیکھو، ان سالوں کی اس وقت جان نکل رہی ہے، چوں نہیں کرتے اور اس سے پہلے ہمارے ہندوستان میں داماد کی طرح گھومتے تھے اور مسجد کے آگے ذرا سا بینڈ بجانے سے سیخ پا ہو جاتے تھے اور اب ہم گالی بھی دیتے ہیں تو کیسے خاموشی سے سن کر چلے جا رہے ہیں......ان کی......(گالی)۔''

یکا یک سڑک پر چلتے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے مسلمان پر اُس کی نظر پڑ گئی اور گالی آدھی ہی اُس کے منہ میں رہ گئی۔ وہ حیرت سے اُس مسلمان کی طرف دیکھ کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے متاثر ہو کر چیخ اُٹھا:

''اوئے احمد یار!''

احمد یار نے اپنے سر کی گٹھڑی کو ذرا سا اُوپر اُٹھا کر سڑک کے باہر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ پھر پہچان کر خوشی سے چلایا؛''اوئے نتھو، سور دیا پترا، توں کتھے؟''

احمد یار اور نتھو دونوں گلے مل رہے تھے اور رو رہے تھے۔ معلوم ہوا دونوں ایک قصبے کے موچی تھے۔ بچپن، لڑکپن اور جوانی کا کچھ حصہ اکٹھے گزرا۔ پھر تلاشِ معاش میں ایک موچی لاہور چلا گیا اور دوسرا جالندھر۔ اب برسوں کے بعد دونوں گلے مل رہے تھے اور رو رہے تھے۔

نتھو بولا؛''تو میرے گھر چل کے رہ۔ اوہدی بہن دی جیہڑا تیری طرف اکھ اُٹھا کے تکے!''

''نہیں نتھو، میں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔ اب نہیں رہ سکدا۔ تیرے بھراواں نے

ساہنوں کوہ سٹیا۔“

احمد یار نے اپنا تہمد اُٹھا کے اپنی پنڈلی کا زخم دکھایا جس پر ایک گندی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”وہ تو میری قسمت تھی میں بچ گیا۔“ احمد یار بولا، ”مگر ظالموں نے مارنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔“

”میرا بھی یہی حال اُدھر ہوا۔ جوان پتر راستے میں مارا گیا۔“

”ہائے ہائے ...... یہ زمانے کو کیا ہوا ہے نتھو؟ ارے ہم تو جالندھر میں بھی جوتے بناتے تھے اور لاہور جا کر بھی جوتے بنائیں گے پھر یہ جھگڑا کس بات پر ہوا ہے؟“

نتھو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُس نے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی کنپٹی کے بالوں کو کھینچا اور کہا: ”جمانے کی ہوا ہی خراب ہے، احمد یار!“

”اچھا میں چلاں......“ احمد یار جلدی سے بولا، ”نہیں تو قافلہ نکل جاوے گا۔“

دونوں دوست آخری بار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے۔ جب احمد یار آگے چلا گیا تو پیچھے سے نتھو نے زور سے چلا کے کہا:

”جگ بختیار خاں کے چاچا عبدالغنی کو میرا سلام کہیں!“

دور سے ”اچھا! اچھا!“ کہہ کر احمد یار قافلے میں گم ہو گیا۔

جب نتھو اپنے دوست سے باتیں کر کے مڑا تو آس پاس کے سارے ہندو گھور کر اُسے دیکھ رہے تھے جیسے اُس پر نفرین بھیج رہے ہوں۔ نتھو کے چہرے پر ایک کھسیانی سی ہنسی آئی۔ اُس نے اپنے بچاؤ میں کچھ کہنا چاہا مگر زیرِ لب کچھ بڑبڑا کر رہ گیا اور جلدی سے سر جھکا کر وہاں سے کھسک گیا۔

اُسی وقت جانے میرے دل میں کیا آئی، میں اچانک قدم بڑھا کر قافلے کے اندر ہو لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ صرف ایک آدمی نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا:

”تم یہاں کیسے؟“

میں نے فوراً کہا: ”یہاں تک ہندو بن کر آیا تھا، اب اپنے وطن جا رہا ہوں پاکستان!“

''الحمدللہ۔'' اُس مسلمان نے مسکرا کر کہا۔ اُس کا شبہ دور ہو گیا تھا اور اگر نہ بھی ہوتا تو مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ میں بڑی دلیری سے دو سو گز فاصلے تک یعنی پل تک تو جا سکتا تھا۔ پل تک تو مجھے کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ قافلے کے دو رویہ ہندو اور سکھ کھڑے تھے، پل تک۔ پل پر انگریزوں کی فوج تھی۔ پل تک تو ہر ہندو شیر تھا اور ایک لاکھ مسلمانوں پر بھاری تھا اس لیے میں بے خطر ہو کر قافلے میں اُن لوگوں کے ساتھ چلنے لگا۔

میں نے اپنے قریب بائیں طرف کے ایک سفید ریش بڈھے سے پوچھا؛''بابا تم کہاں سے آئے ہو؟''

''مورینڈے سے آیا ہوں بیٹا۔''

''تمہارا خاندان کہاں ہے، بابا؟''

بڈھے نے کہا:''قبر میں!''

میں چپ ہو گیا۔ بڈھے کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر بولا؛

''مورینڈے کے سکھوں نے میری تینوں بیٹیاں رکھ لیں اور میرے تینوں بیٹوں کو قتل کر دیا۔ اگر وہ مجھے اور میری بڈھی بیوی کو بھی مار ڈالتے تو ہم دونوں پر بڑا احسان کرتے!''

بڈھے کی دبلی پتلی کھوسٹ بیوی اپنے سفید بال بکھرائے اُس کے ساتھ چل رہی تھی۔ اُس نے عجیب مسکراہٹ سے اپنے میاں کی طرف دیکھا اور ہونٹ پر اُنگلی رکھ کر بولی؛''ہش، شور مت کرو۔ میرا بیٹا جاگ جائے گا!''

''بیٹا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' وہ میری طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں بولی،''میں حاملہ ہوں نا۔ حاملہ۔ میرے پیٹ میں میرا بیٹا ہے!''

یکا یک وہ مجھ سے پیچھے ہٹ کر سیدھی تن کر کھڑی ہو گئی اور زور زور سے اپنا پیٹ جانے لگی۔

''میں گابھن ہوں۔ میں گابھن ہوں۔ میں گابھن.....''

اُس کی ہنسی کی چیخیں مجھ سے برداشت نہ ہو سکیں۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

بڈھا مسلمان اپنی پاگل بیوی کو گھسیٹتا ہوا آگے لے گیا۔

اب میں پھر قافلے کے ساتھ چل رہا تھا۔ جانے میرے دل میں کیا بات تھی؟ میں کیا چاہتا تھا؟ میں کیوں ان لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا؟ مجھے خود معلوم نہ تھا مگر مجھ سے اس قافلے سے الگ بھی نہ رہا جاتا تھا۔ اب کے میرے ساتھ خوشحال اور مہذب مسلمانوں کا ایک خاندان چل رہا تھا۔ صورت شکل، اطوار سے، گفتگو سے، چال ڈھال سے یہ لوگ پڑھے لکھے اور متمدن معلوم ہوتے تھے۔ ان لوگوں کے لباس گو میلے تھے لیکن اعلیٰ قسم کے کپڑے کے معلوم ہوتے تھے۔ فراک پہنے ہوئے آٹھ دس برس کی دو بچیاں تھیں۔ ایک چودہ برس کا لڑکا تھا جس کے چہرے پر خط کا آغاز ہو چکا تھا۔ لڑکے نے نیلی دھاری کی شرٹ اور بلو بلیک رنگ کی نیکر پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی دونوں بہنوں کے سنبھالے ہوئے چل رہا تھا۔ اُس کے باپ نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جو برقع اوڑھے ہوئے تھی۔

اُس مسلمان نے میری طرف دیکھ کر خوشی سے مسکرا کر کہا: ''خدا کا شکر ہے اب ہم پاکستان تک آپہنچے ہیں!''

''راستے میں خیریت رہی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس پاک پروردگار کا لاکھ لاکھ شکر ہے ہمارا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اگلے گھنٹوں کے بعد ہم پاکستان میں ہوں گے۔ وہ سامنے رہا ہمارا نیا وطن!''

ایک عجیب غرور اور مسرت سے سب کے چہرے مجھے سرشار اور مسرور نظر آئے۔ جیسے اُن کے چہروں پر قوس قزح کے سارے رنگ بکھر گئے ہوں! اُن سب کے قدم بے ساختہ پل کی جانب بڑھتے ہوئے تیز تر ہوتے گئے۔

میں نے اپنی چال دھیمی کر دی۔ وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

اب میرے ساتھ ایک لڑکی چل رہی تھی، اور یکا یک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس پورے قافلے میں وہ بھی میری طرح اکیلی ہے۔ میں نے اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا: ''تم ہندو ہو نا؟''

میری بات سن کر وہ ٹھٹھکی۔ ٹھٹھک کر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اُس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا لیکن میں اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے جذبات سے پہچان گیا تھا

کہ میرا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔

بوٹا سا قد، سنہرے بال، سنہرے گال، سنہری ٹھوڑی، گلاب کی سی رنگت والے پتلے لب، لچکتی ہوئی کمر، اُبھرا ہوا سینہ، چال میں تفاخر اور حُسن، مضبوطی اور بے نیازی، کانوں کے طلائی بندے ہلتے ہوئے، آنکھوں کی پتلیاں اک دردناک خواب میں گرفتار۔

''تم کون ہو؟''

''میں پاروتی ہوں۔''

''کہاں سے آئی ہو؟''

''چیمہ کلاں سے۔''

''کہاں جارہی ہو؟''

''پاکستان!''

''پاروتی تم پاکستان کیوں جارہی ہو؟''

''وہ میرے محبوب کا وطن ہے؟''

''تمہارا محبوب؟''

''وہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ امتیاز اُس کا نام تھا۔ اُس کا باپ ہمارے قصبے کا ایک بہت بڑا زمیندار تھا اور کٹر مسلم لیگی تھا۔ میرا باپ گاؤں کا سب سے بڑا سیٹھ تھا اور کٹر آریہ سماجی تھا مگر امتیاز مجھ سے پیار کرتا تھا اور میں اُسے چاہتی تھی اور ہم دونوں اکٹھے کالج میں پڑھتے تھے ایم۔اے میں......

''پاکستان بن جانے پر امتیاز کے ماں باپ اپنے سارے خاندان کو لے کر ہوائی جہاز سے لاہور چلے گئے مگر امتیاز نہیں گیا۔ اُس کے ماں باپ نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ نہیں مانا۔ اُس نے اپنی پارو کے لیے اپنا پیارا وطن چھوڑ دیا کیونکہ میں نے اُس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔''

''پھر؟''

سر جھکائے خاموشی سے وہ دیر تک میرے ساتھ چلتی رہی۔ آخر میں آہستہ سے بولی؛ ''شادی سے پہلے میرے باپ نے اُسے مروا ڈالا! میرے امتیاز کو ہندو غنڈوں سے

مرواڈالا؛ امتیاز۔ جس نے ہم پر بھروسہ کیا تھا...... میرا امتیاز بڑا خوبصورت جوان اور تگڑا تھا مگر وہ اکیلا تھا اور وہ لوگ بہت سے تھے اور جب میں وہاں پہنچی تو اُس کی لاش کو چیلیں کھا رہی تھیں۔"

آنکھ میں ایک آنسو نہیں، لب پر ایک لرزش نہیں، گردن میں ایک خم نہیں...... وہ سیدھی سرو قد چل رہی تھی، یہ عجیب سی لڑکی۔

"ہوں!" میں نے سوچ سوچ کر کہا، "امتیاز تو مر چکا، اب تم پاکستان جا کر کیا کرو گی؟"

"میں اُس کی ماں کے پاس اُس کی بیوہ بن کر رہوں گی!" پاروتی نے بڑے فخر سے تن کر کہا۔

میں حیرت سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ یکا یک پل قریب آ گیا۔

پاروتی نے پل پر ایک پاؤں رکھا۔

"پاوروتی! کہاں جا رہی ہوں؟ لوٹ آؤ، معصوم، بے وقوف لڑکی! بھلا کس نے محض اک تصور کی خاطر اپنا دیس تج دیا ہے؟ عورت اپنے شوہر کے لیے مرتی ہے۔ ماں اپنے بیٹے کے لیے جان دیتی ہے۔ بہن اپنے بھائی پر واری جاتی ہے۔ یہ سب سمجھ میں آنے والے رشتے ہیں، خون اور جسم کے رشتے ہیں، لیکن تم نے تو کسی سے کوئی ایسا رشتہ نہیں باندھا۔ تم نے تو امتیاز سے شادی نہیں کی۔ تم تو اُس کی بیوہ بھی نہیں ہو۔ تمہاری کوکھ میں اُس کا بچہ بھی تو نہیں ہے۔ تم اُس کے خاندان، ملک اور مذہب کی بھی نہیں ہو پھر ہم سب کو چھوڑ کر تم کدھر جا رہی ہو؟ اپنے تصور کی ڈور سے بندھے بندھے کس منزل کو روانہ ہو رہی ہو؟ پگلی! بھلا اس دنیا میں کوئی پیار کے لیے بھی یوں مرتا ہے؟ آدمی مرتے ہیں پیسے کے لیے، عورت کے جسم کے لیے؛ دولت کے لیے؛ طاقت کے لیے؛ ملک کے لیے؛ مذہب کے لیے؛ آخرت کے لیے؛ لیکن محض ایک تصور کو لے کر مر جانا اور ساری زندگی کسی کی یاد میں ایک اجنبی ماحول میں بتا دینا!! ذرا سوچو تو پاروتی، کتنی بڑی احمقانہ بات ہے! واپس آ جاؤ۔ چاند ایسے مکھڑے والی پاروتی، اپنے اس سوگوار لیکن پھول کی طرح مہکتے ہوئے شاداب حُسن کو دیکھو۔ دیکھنے والوں کی ہندو نظروں پر رحم کرو اور واپس آ جاؤ۔ پھر ہم آہستہ آہستہ تمہارے دل سے امتیاز کی یاد کو محو کر دیں گے۔ ہم۔ جو تمہارے دھرم والے ہیں، تمہارے

ملک اور مذہب والے ہیں۔ تمہاری سوسائٹی اور سماج والے ہیں۔ ہم۔ جو نیکی اور بدی کی آخری پرکھ والے ہیں۔ ہم آہستہ آہستہ تمہیں اپنے مانوس ماحول کے گھیرے میں لے آئیں گے۔ آہستہ آہستہ میٹھے سبھاؤ سے، نرم دباؤ سے، دم سے دلاسے سے تمہیں ہم راستے پر لے آئیں گے۔ ہم تمہیں اس کے لئے تیار کرلیں گے کہ تم دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر دیکھنے لگو، دیکھ کر مسکرانے لگو، مسکرا کر ہنسنے لگو۔

آہستہ آہستہ، بہت ہی آہستہ آہستہ ہم تم کو پچکار کر اُس آگ کے قریب لے آئیں گے جس کے گرد سات چکر لگا کر تم بالکل کسی دوسرے اجنبی کی ہو جاؤ گی اور اُس کے ساتھ ڈولی میں بیٹھ کر خوش وخرم اپنے سسرال کو چلی جاؤ گی۔ ہم نے ایسا ہی کیا ہے۔ ہزاروں سال سے ایسا ہی کیا ہے...... ہم سے بہت محبت کو دفن کرنے والے تمہیں کہیں نہیں ملیں گے!

''واپس آجاؤ۔ پاروتی...... واپس آجاؤ۔''

لیکن پاروتی نے مڑ کر ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سیدھی پل پر سے گزرتی چلی گئی۔ سروقد اور پُرغرور، اور جب وہ آدھے پل کو پار کرگئی تو یکا یک انگریز افسر نے آگے بڑھ کر اور پل کے درمیان کھڑے ہو کر راستے کو روک دیا:

نواں باب

جو پل کے اُس پار چلے گئے تھے وہ خوش تھے۔ جو ادھر رہ گئے تھے وہ خوف سے لرزاں تھے اور بار بار ادھر اُدھر اپنے آگے پیچھے دیکھتے تھے۔ اُس خوش حال مسلمان گھرانے کا لڑکا اپنی دونوں بہنوں کو لے کر پار چلا گیا تھا لیکن عین موقعے پر انگریز نے بیچ آ کے راستہ کاٹ دیا تھا اور اُن بچوں کا مسلمان باپ اور اُن کی ماں اِدھر رہ گئے تھے۔ مسلمان باپ نے بہت فریاد کی: ''ارے دیکھو، میرے بچے اُدھر ہیں۔ بس مجھے اور میری بیوی کو گزر جانے دو۔ پلیز کمانڈر صاحب!''

مگر انگریز افسر نہیں مانا۔ ناچار دونوں میاں بیوی پل کے ایک طرف لگ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے بچوں کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ مگر انگریز افسر نے اُنہیں پل پر بھی نہیں رہنے دیا۔ اب اُدھر سے ہندوؤں کا قافلہ آنے والا تھا اس لیے اُس نے ان مہاجروں سے پل کو خالی کرا کے ان لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ دونوں میاں بیوی دوسرے مہاجروں کے ساتھ پل کے باہر سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ شریف مسلمان بار بار پاؤں پٹکتا تھا اور کہتا تھا:

''کیسی حماقت ہے؟ کیسی حماقت...... ایک خاندان کو یوں ہاتھ کی جنبش سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا۔ اگر وہ فوجی افسر ہم دونوں کو جانے دیتا تو اُس کا کیا بگڑتا تھا۔''

اُس کی بیوی اُسے سمجھانے لگی: ''صبر کرو۔ ابھی دو گھنٹے کے بعد پھر یہ پل ہمارے لیے کھلے گا!''

تسلی تو اُس نے بھی اپنے خاوند کو دی مگر دونوں کے دل اپنے بچوں کے لیے خوف زدہ تھے اور وہ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر پل کے اُس پار دیکھتے تھے جہاں اُن کے بچے کھڑے تھے۔

اب اُدھر سے ہندوؤں کا قافلہ آرہا تھا۔ پل پر سے گزرتا ہوا قافلہ سڑک پر آ گیا۔ سڑک کے کنارے کنارے مہاجر کھڑے تھے اور لٹے ہوئے شرنارتھیوں کو تک رہے تھے۔ شرنارتھی گزرتے جارہے تھے اور تباہ حال مہاجروں کو دیکھ رہے تھے اور دونوں کی نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا اور ایک ہی جواب تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں کی وہ خشمگیں نفرت کسی گہرے جرم کے احساس سے بوجھل ہو جاتی اور دونوں ایک دوسرے سے نظر چرا چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے، جیسے کوئی بھی اُس تلخ حقیقت کا سامنا نہ کرنا چاہتا ہو۔

میں مہاجروں کے ٹولے سے نکل کر شرنارتھیوں کے قافلے میں آ گیا اور اب اُن کے ساتھ مخالف سمت کو چلنے لگا۔ لیکن مجھے بالکل احساس نہ ہوا کہ میں نے اپنی سمت تبدیل کی ہے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں ابھی تک اُسی قافلے میں چل رہا ہوں!

تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس قافلے میں اپنے خاندان کے کئی افراد مل گئے۔ دو تایازاد بھائی، ایک چچا، ایک پھوپھا اور چند بوڑھی عورتیں۔ اور یہ سب لوگ میرے باپ کی لاش کو چارپائی پر لاد کر لا رہے تھے جو ابھی پل کے اس طرف بریتے میں حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا!

دسواں باب

باپ کی لاش ایک کونے میں کپڑے سے ڈھکی پڑی تھی۔ لوگ رو پیٹ کے چپ ہو گئے تھے۔ عورتیں شام کا کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر گاؤں کے دوسرے گھروں سے کھانا آ جاتا تھا مگر یہ تو کیمپ تھا۔ یہاں سب کو اپنی پڑی تھی۔ کون کس کی مدد کرتا؟ سبھی بھوکے ننگے تھے۔ بھائی صاحب چِتا وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے گئے تھے۔ میں ایک جھلنگی چارپائی کے پائے کا سہارا لے کر بیٹھا تھا کہ اتنے میں چند ہندو اور سکھ رضاکار آ گئے۔ اُن کا سرغنہ لاہور کا مشہور ہندو پہلوان بلو تھا۔

بلو کی ایک آنکھ کانی تھی۔ دوسری بلی کی آنکھ کی طرح تھی۔ سب لوگ اُسے بلو کہتے تھے۔ بلو نے لاہوری گیٹ کے اندر مدی شاہ کے اکھاڑے میں ہندو پہلوانوں کا ایک گروہ تیار کر رکھا تھا اور ہندو رئیس لوگوں کے کہنے پر یہ لوگ فرقہ وارانہ فساد میں ہندوؤں کی طرف سے لڑا کرتے تھے۔ بلو دو تین بار لاہور میں مجھ سے بھی چندہ مانگنے آیا تھا مگر میں نے کبھی نہیں دیا اس لیے بلو نے اس وقت جو مجھے دیکھا تو اُس کے پُرغرور لہجے میں ایک عجیب سی تضحیک کی جھلک نمودار ہو گئی۔

بلو بولا: ''ابھی تھوڑی دیر میں ہم لوگ مہاجروں پر حملہ کرنے والے ہیں۔ شام ہو چکی ہے۔ دو تہائی قافلہ گزر چکا ہے۔ بس اب اس کی دم باقی رہ گئی ہے۔ وقت حملے کے لیے بالکل ٹھیک ہے!''

میں نے کہا: ''حملہ کر دو۔ مجھے کیا؟''

''ہاں! ہاں! تمہیں کیا؟'' بلو نے ذرا کڑے لہجے میں کہا، ''ایسے بزدل ہندو ا

نے تو پاکستان بنایا ہے۔ ان کا باپ بھی مر جائے تو یہی کہیں گے ہمیں کیا؟''

میں چارپائی سے لگ کر اُکڑوں بیٹھا تھا۔ یکا یک غصے سے سیدھا تن کر بلو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بلو نے کامل اطمینان سے میری طرف دیکھ کر کہا: ''حملہ کرنے کے لیے ہم لوگ ہر گھر سے ایک حملہ آور لے رہے ہیں۔ آدھے گھنٹے میں راشن ڈپو کے پاس آ جانا۔ ...وں، نیزوں، بندوقوں، گھوڑیوں کا سب انتظام ہو چکا ہے!''

چاروں طرف تیز تنی ہوئی برے کی طرح چھیدتی ہوئی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ میں نے دانت پیس کر کہا: ''میں آجاؤں گا!'' بلو ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔

اُس کی ہنسی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ میں اُسی وقت اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ہر گھر سے، ہر خاندان سے ہم لوگ ایک دو آدمی لیتے گئے۔ جوں جوں حملہ آوروں کی تعداد بڑھ گئی لہجے کی سختی، نگاہوں کی خشونت بڑھتی گئی۔ ہاتھوں کی اُنگلیاں بے تاب ہونے لگیں۔ کسمساتے ہوئے لوگوں کے چہرے بھڑ کتے گئے اور جب ہم لوگ راشن ڈپو پر پہنچے تو وہاں پہلے سے پانچ سو آدمیوں کا چیختا چلاتا مجمع تھا اور مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگا رہا تھا۔

میں بھی اُن لوگوں کے ساتھ چل رہا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں خواب میں چل رہا ہوں؛ میرے اردگرد جتنے بھی انسان تھے کسی بھیانک خواب کی پرچھائیاں معلوم ہوتے تھے۔ راشن ڈپو کے قریب ہندو نوجوان نیزے بلم تقسیم کر رہے تھے۔ بندوقیں صرف سرغنہ لوگوں کو دی گئی تھیں۔ کسی نے میرے ہاتھ ایک نیزہ تھما دیا، میں نے تھام لیا۔ کسی نے کہا۔ ''وہ تمہارا گھوڑا ہے۔'' میں گھوڑے پر نیزہ لے کر سوار ہو گیا۔

ہم لوگوں نے ڈکی موڑ پر جا کر، جہاں برگد کا ایک بہت بڑا پیڑ ہے، مسلمانوں کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ ست سری اکال اور ہر ہر مہادیو کے نعروں کے ساتھ فضا میں مہاجروں کی چیخیں بلند ہوئیں۔ مہاجروں کے قافلے کے افراد سڑک چھوڑ چھوڑ کر ریتیلے میدان میں بھاگنے لگے۔ کچھ نوجوان مسلمان بڑی بہادری اور جی داری سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے مدافعت کرنے لگے مگر حملہ آوروں نے ڈکی کے موڑ پر سے راستہ کاٹ کر مہاجروں کو سڑک سے بھگا کر ڈکی کے مشہور ریتیلے میدان کے گھیرے میں لے لیا جہاں اس

سے پہلے بھی سینکڑوں مسلمانوں کی گردنیں کٹ چکی تھیں۔

میرے چاروں طرف مشعلیں سی جل رہی تھیں اور چاروں طرف گھمسان کا رن پڑا تھا اور میں نیزہ اُٹھائے، گھوڑا دوڑاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر شکار کی تلاش میں پھرتا تھا۔ میرے سامنے ایک بڈھا مسلمان ایک چھوٹے سے بچے کو گلے سے چمٹائے بھاگا جا رہا تھا۔ اُس کی میلی کچیلی بنیائن جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اُس نے سلیٹی رنگ کا ایک میلا سا تہمد باندھ رکھا تھا۔ وہ بھاگتا جا رہا تھا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا۔ بچہ خوف سے چیخ رہا تھا۔ اُس کے دونوں ننھے ننھے ہاتھ اُس بڈھے کی گردن سے چمٹے ہوئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اُس مسلمان کو ٹھوکر لگی اور اُس کی پوٹلی زمین پر گر گئی اور جب وہ اُسے اُٹھانے کے لیے مڑا تو میں نے تیزی سے گھوڑا دوڑا کر نیزہ اُس کے سینے پر رکھ دیا۔

بڈھے نے پوٹلی وہیں زمین پر چھوڑ دی، اُس کا ہاتھ ذرا سا اپنے سینے سے اُوپر اُٹھا اور اُس نے میری طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ کر اپنے ہاتھ کو انکار کے انداز میں ذرا ہلاتے ہوئے کہا:

"ناں! ناں! بیٹا۔ ناں۔ مجھے نہ مار!"

بس اُس ایک لمحے کی تصویر ہی ہمیشہ کے لیے میرے ذہن میں گھومتی ہے۔ اُس بڈھے کا منہ خوف سے کھلا تھا اور اُوپر اُٹھا ہوا ہاتھ ڈر اور التجا سے لرز رہا تھا اور پھٹی بنیان سے اُس کا سینہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں پر میرا نیزہ اُسکے سینے سے لگا تھا وہاں پر سفید سفید بال تھے، بڑے بھلے سے سفید بال، جیسے میرے باپ کے سینے پر تھے، اور اُس بڈھے کی بھنویں بھی سفید تھیں، جیسے میرے باپ کی تھیں، اور جس نرمی اور شفقت اور التجا سے اُس نے مجھ سے کہا: "ناں! ناں! بیٹا۔ ناں مجھے نہ مار!" اُس لہجے سے بھی مجھے اپنا باپ یاد آ گیا اور ایکا ایکی میرے آنکھوں میں آنسو سے چبھنے لگے اور میں نیزہ اُس کے سینے سے ہٹانے ہی والا تھا کہ پیچھے سے ایک کرخت آواز آئی:

"او کتے! باہمن تو کیا لڑے گا۔ پرے ہٹ جا! غدار!" اور یہ کہتے ہوئے بلوانی سیاہ گھوڑی پر سوار درپٹ آگے آیا اور بلم سے اُس بڈھے مسلمان کا سینہ چیرتے ہوئے آگے چلا گیا۔

یکا یک میں نے اُس بڈھے مسلمان کو سیاہ گھوڑی کے قدموں میں لڑکھڑا کر گرتے دیکھا اور اس ننھے بچے کو پٹخنیاں کھا کر ایک چھوٹی سی کھڈ میں لڑھکتے دیکھا۔ پھر سینکڑوں حملہ آوروں کے قدم اُس زمین کو روندتے چلے گئے اور یکا یک میری آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آئے تھے کہ میں آگے کچھ نہ دیکھ سکا۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے میرا سارا جسم کانپنے لگا اور میرے ذہن اور جسم اور روح میں ایک متلی آمیز کراہت کا احساس بڑھتا گیا۔

یکا یک میں نے ہاتھ جھلا کر نیزہ زور سے دور پرے پھینک دیا اور گھوڑا دوڑا کر اُس مقتل سے سر جھکائے باہر نکل آیا۔

سنا ہے چار پانچ گھنٹے کے بعد ملٹری کی کمک وہاں پہنچی مگر جب تک حملہ آور اپنا کام کر کے بھاگ گئے تھے اور ڈکی کے میدان میں ہزاروں مسلمان قتل ہو چکے تھے!

گیارھواں باب

اُس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی۔ نیند آتی بھی تو چند لمحوں کے لیے آتی، اور اُن چند لمحوں میں کبھی اپنے باپ کا چہرہ دیکھتا، کبھی اُس بڈھے مسلمان کا سینہ بلم سے چھدا ہوا اور ایک جھٹکے سے میری نیند اُچٹ جاتی۔ پھر دیر تک کروٹ بدلنے کے بعد غنودگی کا ایک ریلا سا آیا تو دیکھا کہ شاداں سر کے بال کھولے سرکنڈوں کے جنگل کی طرف چیخیں مار مار کر بھاگ رہی ہے اور سرکنڈوں کے جنگل میں آگ لگی ہے۔ پھر آنکھ کھلی گئی۔ دیر تک کروٹ بدلتے بدلتے جب تیسرا پہر گزر گیا اور آنکھوں میں نہ نیند آئی نہ آنسو تو میں زمین سے اٹھا اور باہر چل دیا۔

ابھی صبح کاذب بھی نمودار نہ ہوئی تھی۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا۔ صرف آسمان اور زمین کے درمیان تقسیم کرنے والی ایک سفید سی روشنی نمودار ہو چکی تھی جو آنے والی سحر کا پتہ دیتی تھی۔ میں اسی روشنی کے سہارے کیمپ سے باہر نکل آیا۔ دھیرے دھیرے قدم ڈک کے میدان کی جانب اُٹھنے لگے، میں جانا نہ چاہتا تھا لیکن کوئی طاقت تھی جو مجھے اُس طرف کھینچے لیے جارہی تھی۔

چلتے چلتے اندھیرا کم ہونے لگا۔ روشنی تو نہ تھی لیکن کم تاریک اور زیادہ تاریک اشیا کا تفاوت بڑھتا جارہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کھڈ ہے، یہاں کھائی ہے، یہ ٹیلہ ہوگا، درختوں کا جھنڈ ہوگا، موہوم پھیلے پھیلے سے سائے دم سادھے گویا سانس روکے روشنی کا انتظار کررہے تھے۔ میرے قدموں تلے ایک خرگوش خوفزدہ ہو کر بھاگا اور دور ایک ٹیلے کے بھٹ میں گھس گیا...... ایک لمحے کے لیے میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر حواس جمع کر کے

آگے بڑھ گیا۔ سامنے موڑ پر برگد کا پیڑ تھا، گہرا، اتھاہ تاریک...... جیسے اس سیاہی کا کوئی کنارہ نہ ہو......

موڑ کاٹ کر برگد سے آگے بڑھا تو سامنے ڈکی کا میدان نظر آیا...... کہیں کہیں پر سنتری پہرہ دے رہے تھے......

اب آئے ہو۔ اُس وقت تم کہاں تھے جب زندگی نے تمہیں رو رو کر پکارا تھا؟''

سنتری نے مجھے للکارا: ''ھالٹ!''

میں کھڑا ہو گیا۔

سنتری نے میرے قریب آ کر مجھے دیکھا۔ کرخت لہجے میں بولا: ''کون ہو؟''

''ہندو ہوں!''

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

میرے منہ سے بے اختیار نکلا: ''میری بندوق یہاں کھو گئی ہے، اُسے لینے کے لیے آیا ہوں۔''

سنتری کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اُس نے سر کو جنبش دے کر کہا:

''جاؤ ڈھونڈ لو......''

میں ڈکی کے میدان میں داخل ہو گیا۔

میرے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں پڑی تھیں؛ بڈھوں کی لاشیں، جوانوں کی لاشیں، عورتوں کی لاشیں، بچوں کی لاشیں؛ اوندھی لاشیں، سیدھی لاشیں، اکڑوں لاشیں؛ لاشیں جن کے دھڑ ننگے تھے، لاشیں جن کے ہاتھ اکڑے ہوئے تھے، لاشیں جن کی آنکھیں کھلی تھیں، لاشیں جن کی آنکھیں بند تھیں، لاشیں جن کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی؛ لاشیں جو زندگی کا سراز ہر پی گئی تھیں اور اب ہمیشہ کے لیے سو رہی تھیں۔

دور کہیں ایک بچہ رو رہا تھا۔

میرے قدم بے اختیار اُس بچے کی آواز کی طرف لے گئے گرتا پڑتا، لڑکھڑاتا، لاشوں کو پھلانگتا، کسی کے پاؤں اور کسی کے سر پر قدم رکھتا ہوا جب میں اُس آواز کے قریب

پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف لاشوں کا ایک انبار سا لگا ہے اور اُن کے بیچ ایک بچہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے رو رہا ہے اور کہہ رہا ہے:

"بابا...... بابا...... بابا مجھے بھوک لگی ہے۔ بابا...... میرے بابا......" بابا بچے کے قریب مرا پڑا تھا اور اُس کے سفید بالوں والے سینے میں بلم کا گہرا شگاف تھا۔ ایک تاریک گہرا سیاہ شگاف...... اور شگاف کے اِردگرد سینے پر لہو انسان کی نفرت کی طرح منجمد ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر تک میں چپ چاپ کھڑا رہا اور روتے بچے کو خاموشی سے دیکھتا رہا، اور بچہ روتے روتے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بچہ روتے روتے چپ ہو گیا، اور اب ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اجنبی، ناواقف، بے گانہ، لاشوں میں کھوئے ہوئے، اور ہمارے درمیان کتنے بڑے فاصلے تھے، کتنے گہرے سمندر تھے، کتنی اُونچی فصلیں تھیں، اور ہم ایک دوسرے کی طرف ایک انجانی، سمجھ میں نہ آنے والی حیرت سے تک رہے تھے۔

بچے نے میری طرف دیکھا، پھر اپنے اِردگرد کی لاشوں کی طرف دیکھا، اور پھر جب اُس کی ننھی سی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُس نے سر جھکا کر اپنا ننھا سا انگوٹھا اپنے منہ میں ڈال لیا اور اُسے دھیرے دھیرے چوسنے لگا!

اور پھر جب اُس نے انگوٹھا چوستے چوستے سر اُٹھا کر یکبارگی میری طرف جو معصوم نظروں سے دیکھا تو گویا کسی نے میرے دل کی دائلن کو چھو لیا۔ اُس رات کی خاموشی کا ذرہ ذرہ بول اُٹھا اور چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگا، اور سات سمندروں، سات تہذیبوں سات فصیلوں اور سات نفرتوں کو روندتی پھلانگتی ہوئی اُس بچے کی بھوکی، بلکتی، بے قرار روح مجھ تک آئی اور اس زور سے میرے دل سے چمٹ گئی جیسے وہ ہمیشہ سے اس کا حصہ تھی اور میرے ہاتھ بے اختیار اُس بچے کی جانب اُٹھ گئے۔ میں نے اُسے لاشوں کے انبار پر سے اُٹھا کر زور سے اپنے سینے سے لگا لیا اور رو رو کر اُس کا منہ چومنے لگا۔

اور جب وہ مسلمان بچہ سسکتے ہوئے میرے گلے سے لگ گیا اور جب اُس کے ننھے ننھے ہاتھ میرے سینے پر سرکنے لگے تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے انتقام کی ساری آگ بجھ گئی، میرے دل کا سارا دکھ جاتا رہا، میری ساری نفرتیں دھوئی گئیں، میری روح کی ساری جلن اور تلخی، مٹ گئی۔ اُس لمحے میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے میرا بچہ واپس مل گیا۔

میں اُس بچے کو لیے کھڑا تھا اور چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میرے چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

اور میں نے آپ سے پوچھا؛ کس لیے ہم سربلند ہو کر چلتے ہیں؟ اور کس لیے ہم اپنی برتر تہذیب کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں؟ اور کیوں ہم اپنے جرم کا اقبال کرنے سے قاصر ہیں؟ ارے یہ نامکمل، ناپختہ تہذیبیں اپنے دامن میں کتنے گہرے اندھیروں کو چھپا کر رکھتی ہیں۔ یہ ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب، عیسائی تہذیب اور سکھ تہذیب، یورپی تہذیب اور ایشیائی تہذیب...... ان چمکتی ہوئی تہذیبوں کے اندر کتنی گہری کھائیاں، کیسی خوفناک تاریکیاں مستور ہیں لیکن وہ بتاتے نہیں ہیں۔ وہ جو شب و روز ان تہذیبوں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، وہ بتاتے ہیں...... اور جو کچھ وہ بتاتے ہیں وہ بہت ہی خوبصورت، پُرشکوہ اور شاندار ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی جرأت کر کے اس تہذیب کی خوشنما قبا کو ہٹا کر دیکھنا چاہے تو اُسے غدار سمجھ کر قتل کر دیا جاتا ہے یا اُس کی پیٹھ میں بلم بھونک دیا جاتا ہے۔

مگر اب مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ اُن لاشوں پر سے چلتے چلتے یکایک مجھے محسوس ہوا جیسے اب مجھے کسی کا ڈر نہیں رہا، جیسے بہت عرصہ ہوا میں اپنا سر خود کاٹ کے پھینک چکا ہوں۔ اب مجھے شاہراہوں کے ظلم پر حیرت نہ ہوگی۔ میرے کان اُس آواز سے دھوکا نہ کھائیں گے جو اپنے مخملیں جوف میں ایک زہریلا خنجر چھپائے رہتی ہے۔ اب میں کسی کے گناہ نہیں سونگھوں گا۔ ان لاشوں پر سے چلتے چلتے جب میں نے اپنے سماج کی آدرش کو ٹٹولا تو میرے ہاتھوں کی ساری ریت بہہ گئی، سارے زرد پتے ہوا میں بکھر گئے اور میں نے اُس مسلمان بچے کو گلے سے لگا کر اپنے پرانے رسم و رواج کے غلیظ ڈھیر کو آگ لگا دی۔ چلتے چلتے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اب میں بہت مطمئن ہوں اور کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا کیونکہ میں ایک سربریدہ انسان ہوں جسے صرف ایک سبز پتے کی تلاش ہے!

میدان سے نکل کر پہرے دار نے پھر مجھے ٹوکا۔

میں نے کہا؛ ”مجھے بندوق نہیں ملی۔“

”تو تم اس بچے کو کیوں اُٹھا لائے۔“ پہرے دار نے پوچھا۔ اُس کے لہجے میں تلخی اور سختی تھی، جیسے اُسے میری حرکت پسند نہیں آئی۔

''یہ زندہ ہے!'' میں نے اُس سے کہا۔

''زندہ ہو یا مردہ، تمہیں اس بچے کو اُٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے وہیں چھوڑ دو۔''

''مگر میں اسے مارنا چاہتا ہوں۔'' میں نے پہرے دار کو آنکھ مار کر کہا، ''یہ سانپ کا بچہ ہے۔ زندہ کیوں رہے!''

پہرے دار کے چہرے پر شک و شبہات کے آثار نمودار ہوئے، رک رک کر بولا؛

''تم واقعی اس کو جان سے مار دو گے؟''

میں نے کہا؛ ''ارے! میں اس کی بوٹی بوٹی الگ کر دوں گا۔ دونوں ٹانگوں سے چیر کر اسے دریا میں بہا دوں گا۔'' میں نے پھر پہرے دار کو آنکھ مار دی۔

پہرے دار ذرا سا مسکرایا۔ توقف کے بعد بولا؛

''تم اسے لے جا سکتے ہو۔''

بچہ زور زور سے رونے لگا۔ میں بچے کو لے کر تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ یکا یک پہرے دار نے پیچھے سے چلا کر کہا؛ ''ٹھہرو!'' مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں نے اپنی چال تیز کر دی اور زور زور سے بھاگنے لگا یکا یک ایک گولی کی آواز آئی اور گولی میرے پاؤں سے چھلتی ہوئی خاک اُڑاتی ہوئی گزر گئی مگر میں بھاگتا رہا اور بھاگتے بھاگتے ایک ٹیلے کی اوٹ میں چھپ کر اپنا زخم دیکھنے لگا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

راوی پر صبح ہو گئی۔

اور میں دریا کے کنارے اس بچے کو اُٹھائے سوچ رہا تھا؛

اب تو کہاں جائے گا، بیج ناتھ؟ ظلم اور تشدد، فطرت اور تعصب کے جس طوفان سے بھاگ کر وہاں سے آیا تھا وہ تو یہاں بھی موجود ہے اور تو، جواب ان دونوں تہذیبوں کا غدار ہے، تو ان سے بچ کر کہاں جائے گا؟ تو اب نہ ہندوستان کا رہا نہ پاکستان کا۔ جب تیرے لیے ان دونوں ملکوں کی نفرتیں اجنبی ہو چکیں تو پھر تو اس انسانیت سے خالی، لق و دق، ویران دنیا میں اس بچے کو لے کر کہاں اپنا ٹھکانہ بنائے گا؟ بھول جا ان تمام آدرش اور تخیلی باتوں کو اور جھونک دے اس بچے کو طوفان کے ریلے میں اور واپس چلا جا اپنے گھر میں اور خاندان میں؛ قوم اور ملک، سماج اور اُس کی تہذیب میں، اب وہ دیس تیرا نہیں رہا،

اب یہی دیس تیرا دیس ہے!

ہائے کیسے کہوں وہ دیس میرا دیس نہیں ہے۔ جس کی مٹی کا ایک ایک ذرہ میرے دل میں ہیرے کی طرح روشن ہے! اور کیسے کہوں صرف یہی دیس میرا ہے جہاں میرے بہت سے احساس اجنبی ہیں۔ مجھے تو راوی کے اس کنارے میں اور اُس کنارے میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔ دریا کے دونوں کناروں پر ریت کے تودے ہیں اور دونوں کناروں پر لاشیں پڑی ہیں اور بیچ میں راوی کا وہی پانی بہہ رہا ہے جو اس دھرتی پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی بہتا رہا ہے!

اور پھر میرے دل میں اُس زمانے کی یاد آئی جو ابھی آیا نہیں ہے لیکن جو آنے والا ہے۔ جب ہندوستان ہوتے ہوئے بھی کوئی ہندوستان نہ ہوگا اور پاکستان ہوتے ہوئے بھی کوئی پاکستان نہ ہوگا؛ کوئی ایران نہ ہوگا اور کوئی افغانستان نہ ہوگا؛ کوئی امریکہ نہ ہوگا اور کوئی روس نہ ہوگا؛ کوئی چین نہ ہوگا اور کوئی جاپان نہ ہوگا؛ جب یہ ساری دھرتی اس دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ایک چھوٹا سا گاؤں بن جائے گی جس میں تمام انسان اپنی اپنی گلیوں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت اور اُلفت، ہمسائگی اور آزادی اور برابری کا برتاؤ کرتے ہوئے امن وچین سے رہیں گے۔

ارے کیوں میں ایسا سوچتا ہوں؟ کیوں میں ایسا سوچتا ہوں؟ اور کیوں اُسی طرح سے نہیں سوچتا جس طرح سے دوسرے شریف اور مہذب اور متمدن، عاقل اور فاضل انسان سوچتے ہیں؟ اپنے اپنے ملکوں، مذہبوں، سماجی اداروں اور گروہ بندیوں میں بٹے ہوئے؛ رنگ، نسل، ملک اور قوم کی تفریق اپنے سینے سے چمٹائے سوچتے ہیں؟ آخر مجھے ہوا کیا ہے؟ ہوا کیا ہے؟ یہ کیسی جان لیوا کاہش، خواہش اور تمنا ہے جو میری روح کو ہر لحظہ اپنے مضطرب مضراب سے مرتعش کیے جاتی ہے؛ جو میرے ضمیر سے بار بار کہتی ہے کہ کوئی کچھ کہے، کوئی مانے نہ مانے مگر اب ایک دن ضرور ایسا ہوگا؛ وہ دن آج آئے، کل آئے، سو سال بعد آئے، سو ہزار سال بعد آئے؛ لیکن اگر انسان اشرف المخلوقات ہے، اگر اُس کی زندگی کا کوئی مصرف ہے، اگر اُس کی تہذیب کا کوئی مقصد ہے، اگر اُس کے مستقبل کی کوئی معراج ہے تو وہ دن ضرور آئے گا جب انسان اپنی جان پر کھیل کر، اپنی تمام خامیوں سے لڑتے

ہوئے، اپنی وحشی جبلتوں پر قابو پاتا ہوا، فطرت کے ہر راز کا سینہ چیر کر بلند و بالا انسانیت کی درخشاں منزل کو چھو لے گا!

وہ دن ضرور آئے گا! ضرور آئے گا۔

اور اُس دن کے انتظار میں مجھے زندہ رہنا ہوگا اور اس بچے کو اپنے سینے سے لگائے اسے بھی زندہ رکھنا ہوگا۔ پھیلتی ہوئی تاریکی میں بھاگتی ہوئی روشنی کو دانتوں سے پکڑ پکڑ کر زندہ رکھنا ہوگا، تاریکی کے گرتے ہوئے ملبے میں سے روشنی کی کرن کو ناخنوں سے کرید کرید کر نکالنا ہوگا اور اُسے اپنے سینے سے چمٹا کر حرز جاں بنانا ہوگا۔ وہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے اور تھوکیں گے اور نفرت سے اپنا منہ پھیر لیں گے مگر مجھے اس زہر کو پی کر انسانیت کے وقار کی مشعل کو اپنے سینے سے فروزاں کیے اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہوگا!

بچے نے میری طرف حیران نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا:

''تو تون ہے؟''

میں نے کہا، ''میں تیرا چاچا ہوں۔''

''چاچا؟'' بچے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، ''تو مجھے لوتی دے گا؟''

''ہاں، میں تجھے روٹی دوں گا۔'' میں نے اُس سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''روٹی جو ہم دونوں میں مشترک ہے۔''

اور پھر میرے چاروں طرف، دریا کے اس کنارے سے اُس تک، روشنی چمک اُٹھی۔ میں نے بچے کو دونوں ہاتھوں میں اُوپر اٹھا کر اُس کے گالوں کو بوسہ دیا، اُس کی پیشانی کو چوما، اور اُسے اپنے کندھے پر بٹھا کر اُمید کی اُس وادی کی طرف چلا گیا جہاں سورج کبھی نہیں ڈوبتا!

اُس کا بدن میرا چمن

(ناول)

اُس کا بدن، میرا چمن

میں ہائی لینڈ پارک ہوٹل سے نیچے اترنے لگا میرے سامنے گلمرگ کا گاف کورس اپنے سینے کے اُبھار کھولے ایک نیم عریاں عورت کی طرح لیٹا تھا۔ مئی کی زرد دھوپ نرگس کے پھولوں میں سمٹ آئی تھی جو اپنی آنکھیں کھولے اپنی نیم مدہوش نگاہوں سے مجھے گاف کورس کے سبزہ زاروں پر چلتا دیکھ رہے تھے۔ ان پھولوں کے ہونٹ وا تھے، کسی بھنورے کے بوسے کے لئے اور اُن کے اندر شہد تھا، ہر بوسے کو شہد کی تلاش رہتی ہے چاہے وہ عورت کے ہونٹ ہوں یا گلاب کی پتی کے لرزاں کنارے۔!

گاف کورس کی سلوٹوں میں کہیں نہ کہیں برف موجود تھی جس کے چاروں طرف نیلے پیلے گلابی جنگلی پھول قطار باندھے شریر بچوں کی طرح کھڑے تھے۔ جگہ جگہ برف کی کٹوریاں زرد دھوپ سے لبالب بھری تھیں یہاں پر پھر بوسے کا احتمال ہوتا تھا۔ زرد دھوپ کے بوسے سے اندر ہی اندر برف پگھل رہی تھی۔ بوسے کی حدت سے کائنات کی ہر شے پگھلتی ہے، اور محبت کے نازک ساحلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ آج کی ہوا میں شہوت کی ہلکی ہلکی خوشبو ہے، اُس کے جسم کو اُکسانے والی، عورت کے انگ انگ میں میٹھا میٹھا درد پیدا کرنے والی، گاف کورس کی مخملیں گھاس سے لے کر آسمان کے مخملیں خیمے تک ایک عجیب مدماتی مستی چھائی تھی۔ میں اس مستی سے بچنے کے لئے اپنے ہوش وحواس برقرار رکھنے کے لیے جلدی جلدی گاف کورس طے کر کے ایک سست رفتار نالہ پار کر کے فر کے جنگلوں کی طرف بڑھ گیا۔

جنگل مجھے بلا رہا تھا، جنگل تو میرا بھائی ہے اس کے اندر آتے ہی میری زندگی کی

ساری خلش مٹ جاتی ہے جیسے کسی نے روح پر مرہم رکھ دیا ہو یا کسی نے میرے رستے زخموں پر اپنے ہونٹ رکھ کر اُن کا سارا زہر چوس لیا ہو۔ یہاں میں درختوں کے ساتھ چلتا ہوں جھاڑیوں کے ساتھ انکھیلیاں کرتا ہوں اور پھولوں کے ساتھ مصروف گفتگو رہتا ہوں، کہیں کہیں درختوں سے لپٹی بیلیں کسی چشمے کے کنارے کھڑی دوشیزاؤں کی طرح مجھے محبوب نگاہوں سے تاکتی نظر آتی ہیں۔

ایک ڈھلوان پر بہت سے درخت کھڑے تھے۔ جیسے میری آمد کا انتظار کر رہے ہوں۔ جب میں ان کے بیچ پہنچا تو ان کی طاقت ور شاخوں نے مجھے سہارا دیا۔ کیونکہ یہاں زمین گہری شبنم سے پھسلواں تھی۔ میں درختوں کے بازوؤں کا سہارا لیتے لیتے ایک چھوٹے سے چمن زار میں اتر گیا۔

یہاں دبیز سبزے کا ایک قطعہ تھا، ایک چھوٹے سے ٹیلے کے نیچے چشمہ بہتا تھا۔ اور ذرا فاصلے پر چاروں طرف دیودار کے پیڑ نوکیلے میناروں کی طرح کھڑے تھے۔

پھر میری نگاہ اس لڑکی پر پڑی جو چشمے کے کنارے سیدھی لیٹی تھی، میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور دیر تک اس لڑکی کو دیکھتا رہا، اُس کے جسم میں کوئی جنبش نہ تھی مجھے ایسا لگا جیسے وہ مر چکی ہے۔

میں دھیرے دھیرے بے آواز قدموں سے اُس کے قریب گیا، پھر بھی یہی محسوس ہوا جیسے ہو مر چکی ہے مگر جب بہت قریب گیا اور اُس کے سر کے قریب کھڑا ہو گیا تو مجھے اُس کے سینے کے زیر و بم کا اندازہ ہوا۔ اُس کی سانس بہت ہی آہستہ چل رہی تھی، اور سیپی کی طرح نازک نتھنے دھیرے دھیرے پھڑک رہے تھے۔ وہ بالکل بے سدھ نیند میں غلطاں لیٹی تھی، اور اُس کا سنہرا بلانڈ جسم پنڈلیوں سے اوپر، آدھی سے زیادہ رانوں تک ننگا تھا، اور منی فراک ایک طرف کو اُلٹ گیا تھا، اور اُس کی ننگی ٹانگوں کی حیرت انگیز خوبصورتی سڈول پن کو نمایاں کر رہا تھا۔ وہ ایک لانبی گردن اور موزوں سینے والی لڑکی تھی۔ گلابی ہونٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے اور شہد سے بھرے تھے۔ پلکوں کی گہری لانبی صف رخساروں پر کار استہ تھی۔ میں نے کافی دنیا دیکھ لی ہے اور ہندوستان سے باہر ملکوں میں گھوما ہوں اور نسائی حُسن کے سینکڑوں نادر نمونے دیکھے ہوں گے مگر یہ لڑکی لاجواب تھی۔ سر سے پاؤں تک جیسے کسی

سنہرے سپنے کو کاٹ کر بنائی گئی ہو اور پھر اس چشمے کے کنارے لٹا دی گئی ہو، ایک مجسمے کی طرح مجھے ایسا لگا جیسے اس کا بنانے والا چہل قدمی کے لئے کہیں نکل گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں آئے گا اور اپنا مجسمہ اُٹھا لے جائے گا۔ جب تک اُسے دیکھ سکتا ہوں کیونکہ آخر میں تو خوبصورت عورت اُٹھالی جاتی ہے اور جتنی بدصورت عورتیں ہیں وہ تھیلا اُٹھائے بھاجی خریدنے کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اب تو میں کھڑا تھا۔ بعد میں اُس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کا ادھ کھلا بیگ میرے قریب پڑا تھا میں نے اُسے ذرا سا پرے سرکا دیا اور قریب سے اس حُسن مدہوش دیکھنے لگا۔ یکا یک میری نگاہ اس کے کھلے بازو پر پڑی، بازو کے بیچ جگہ جگہ جلد پر نیلگوں دھبے تھے اب سمجھ تو آیا ضرور یہ لڑکی نشہ آور انجکشن لیتی ہے۔ اور اس وقت بھی کسی نشہ آور انجکشن کے زیر اثر مدہوش ہے نشہ کر کے تنہا دھوپ میں سونے کے لئے اُس نے اس مرغزار کا اچھا انتخاب کیا تھا۔

میں نے اُس کے اُلجھے پلٹے ہوئے منی فراک کے حاشیئے کو پھر سے اُس کی رانوں پر ٹھیک کر دیا۔ حالانکہ اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑا وہ مدور دھندلی رانیں برابر للچاتی رہیں پھر میں نے آہستہ سے اُس کے بلاؤز کو پکڑ کر ہلایا۔ اُس کے بدن میں کوئی جنبش نہیں ہوئی

"نشہ گہرا ہے۔"

اس کی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں اور دھوپ سے رخسار سرخ ہو چلے تھے اور ان پر ادھ کھلے گلابی ہونٹوں کے شہد نے میرے لبوں میں پیاس کی آنچ کو اس قدر بڑھا دیا کہ میں بے اختیار اُس کے چہرے پر جھک گیا اور جھکتا چلا گیا۔

یکا یک اس لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔

میں تیزی سے اور مایوسی سے پیچھے ہٹ گیا۔

شاید اُس نے ابھی تک مجھے نہیں دیکھا تھا، شاید ابھی تک اُس کی آنکھیں کسی خواب کی وادی میں گزر رہی تھیں۔ ان بنفشی آنکھوں میں ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ دھند صاف ہوتی گئی اور میرا چہرہ اُس کی آنکھوں میں فوکس ہوتا گیا۔

پھر وہ یکا یک اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے بالوں کو جھلا کر وہ پیچھے لے گئی۔ بڑے نرم ملائم اور صبح کی پہلی دھوپ کی طرح ہلکے سنہرے بال تھے وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''کون ہو تم؟''

''اور تم کون ہو؟'' میں نے جواب میں پوچھا۔

''میں جین ہوں۔'' وہ بولی۔

''میں جان ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جان کون؟'' اُس نے پوچھا۔

''اور جین کون؟'' میں نے پوچھا۔

''جین گارفیلڈ میرا پورا نام ہے۔'' وہ بولی۔

''مس یا مسز؟''

''مس...... اور تم کون ہو؟''

''میرا پورا نام جان رمیش سکندر علی ہے۔''

اب تک وہ غنودگی میں تھی۔ میرا جواب سن کر بالکل ہوش میں آگئی بلکہ چونک گئی پھر تیکھے لہجے میں بولی۔

''اے مسٹر میں سب جانتی ہوں تین سال سے ہندوستان میں گھوم رہی ہوں کوئی بچی نہیں ہوں تم مجھ سے مذاق مت کرو ایسا نام کہیں ہندوستان میں ہوتا ہے؟''

''ہوتا ہے۔'' میں نے اُس سے بڑے وثوق سے کہا۔

''کیسے؟''

''سنو میرا باپ عیسائی تھا، اُس نے میرا نام جان رکھا۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد میری ماں نے ایک ہندو سے شادی کی، اُس نے میرا نام رمیش رکھا، میری ماں مسلمان تھی اُس نے میرا نام سکندر علی تجویز کیا اب بولو......، میرا نام اب جان رمیش سکندر علی ہوا کہ نہیں۔''

''فنٹاسٹک۔'' کہہ کر وہ زور سے ہنسی، اُس کی ہنسی کا نقرئی فوارہ دور دور تک بکھر گیا۔ میں چونکہ اُس کی ادھ ننگی سے زیادہ ننگی رانوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے اُس نے پہلے تو اپنی منی فراک سے اپنا ستر ڈھانپنے کی کوشش کی مگر جب اُسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو دونوں ٹانگیں پیچھے کی طرف دبا کر اس طرح بیٹھ گئی جیسے چرچ میں مصروفِ دعا

ہو مگر اس طرح اُس کی رانوں کا مدور پن اور اُبھر آیا۔

مگر اب وہ سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی بولی ''تم نے کہاں سے میرا تعاقب کیا ہے؟''

میں نے کہا ''کہیں سے بھی نہیں، اچانک، اس فر کے جھنڈ سے گھرے، ہرے بھرے مرغزار میں آنکلا اور تمہاری ایسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر......!'' میں چپ ہو گیا۔

وہ بولی ''کیا مجھے ریپ کرنے کا ارادہ تھا؟''

میں نے کہا ''اگر تم غلط لمحے پر جاگ نہ جاتیں تو بوسہ تو لے چکا ہوتا۔''

اس نے کسی قدر اداسی سے کہا ''چرایا ہوا بوسہ؟''

''سب سے میٹھا ہوتا ہے۔'' میں نے فقرا مکمل کر دیا۔

وہ بولی ''اب مجھے جگہ تبدیل کرنی پڑے گی۔''

''کیوں؟''

''میں یہاں روز دھوپ کھانے آتی تھی صبح کی ہلکی سہانی دھوپ اس اکیلے مرغزار میں مجھے کس قدر پسند تھی تم نے آ کر سب چوپٹ کر دیا۔''

اُس نے میرا سرکایا ہوا بیگ اپنے قریب کر لیا، اس میں سے ایک آئینہ نکال کے اپنا چہرہ دیکھا اسے تر و تازہ پا کر یقیناً وہ خوش ہوئی ہوگی، کیونکہ پھر اس نے بیگ سے ایک کنگھا نکال کر اپنے بالوں میں پھیرنا شروع کیا۔ ریشمی سپنوں کا وہ گھنا جال اس کی لانبی اور سپید گردن کی پشت پر پھیلتا چلا گیا، کبھی کبھی کمان کی طرح خمیدہ نگاہوں سے وہ مجھے دیکھ لیتی تھی۔

بال ٹھیک کر کے بولی ''گلمرگ میں کہاں ٹھہرے ہو؟''

''ہائی لینڈ پارک ہوٹل میں۔''

''عجیب بات ہے وہیں تو میں ٹھہری ہوں مگر میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔''

''اور میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔''

''کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟''

''نقشے بناتا رہتا ہوں، خاکے تیار کرتا رہتا ہوں، زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہتا

دں۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''کاہے کے نقشے؟ کس کے خاکے؟''

''بمبئی کے قریب تھانے کے پاس ایک نیا شہر آباد ہو رہا ہے بمبئی ثانی......! میں وہاں آرکی ٹیکٹ ہوں کس طرح کی بلڈنگیں بنانی چاہئیں یا بلڈنگوں کے گروپ یہ بہت مشکل وال ہے۔''

''کیا اس سوال کو حل کرنے تم کشمیر آئے ہو؟'' اور پھر ہنسی۔!

''آیا تو کام کرنے تھا اب تم مل گئی ہو تو شاید فرصت بھی مل جائے۔''

''تم بہت جلد فرض کر لیتے ہو اور بہت زیادہ۔''

اتنا کہہ کر اُس نے ایک جماہی لی۔ شاید نشہ ٹوٹ رہا تھا پھر وہ اُٹھ کر چشمے کے کنارے چلی گئی اور بار بار اپنے منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔ گلاب دھونے سے اور نکھر آیا۔ میں بھی چشمہ کے قریب کھڑا ہو گیا اور میں نے اُس سے کہا۔

''تمہارے لہجے سے تو میں نے پہچان لیا کہ تم ایک امریکن لڑکی ہو مگر کہاں کی؟''

''سن سانی کی''

''وہاں کیا کرتی تھیں؟''

''کالج میں پڑھتی تھی۔''

''پھر؟''

''پھر ایک لڑکے سے عشق ہو گیا۔''

''پھر شادی ہو گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں اسے فوج میں بھرتی کر لیا گیا تو وہ ویٹ نام چلا گیا مارا گیا میرا الیکس۔''

اتنا کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اس کا چہرہ خاموش اور ستا ہوا، جانے وہ کیسی درد بھری خوشبو تھی جو اس چہرے کی بند کلی میں پنہاں تھی وہ چہرہ جیسے امنگوں کی شاخ پر کھلتی ہوئی ایک سسکی۔ وہ دیر تک چپ رہی گردن کے اندر کچھ ایسی لرزش تھی جیسے وہ اندر ہی اندر سی ہچکی کو پی جانے کی کوشش کر رہی ہو، پھر اُس نے اپنی اوک میں لبالب پانی بھر لیا اور زور زور سے آنکھوں پر چھینٹے مارنے لگی۔

''کسی تصویر کو ڈھونڈ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ایسے تصویریں نہیں ڈھلتیں۔'' میں نے پھر کہا۔

''گٹ آؤٹ۔'' وہ میری طرف مڑ کر بڑے غصے سے بولی۔

''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے اُس سے کہا ''الیکس کے مرنے کے بعد تم نے کیا کیا۔ ہندوستان آگئی سکون کی تلاش میں؟ مگر یہ دھرتی تو خود اپنے بیٹوں کے لئے حسرتوں کی آماجگاہ ہے کیا یہاں محبتیں نہیں مٹتیں اور دل چور نہیں ہوتے اور ویران قبرستانوں سے لپٹ کر نا کام تمنائیں روتی نہیں ہیں کیا؟ تمہارے الیکس نے بھی تو کسی معصوم ویت نامی لڑکی کے منگیتر یا شوہر کو...... گولی سے ہلاک کر دیا ہوگا۔''

اُس کے چہرے پر کئی طرح کے سرخ رنگوں کی جھلکیاں آئیں گلابی، شہابی، عنابی، آخر میں ایسا لگا جیسے اُس کے چہرے سے خون کا آخری قطرہ بھی غائب ہو گیا ہو، وہ تقریبا سرگوشی کی سی آواز میں بولی۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

میں نے کہا، سگریٹ ہی نہیں ہے۔ تھرماس میں چائے بھی ہے تم ہاتھ منہ دھولو، آرام سے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ناشتا کریں گے اور باتیں بھی کریں گے۔''

اُس نے بیگ سے ایک چھوٹا سا تولیہ نکال کر منہ صاف کیا بالوں میں پھر کنگھی کی۔ مجھے اس احساس سے خوشی ہوئی کہ اُس کے چہرے پر کسی طرح کا میک اپ نہ تھا دراصل اُس کی جلد گلاب اور مرمر کا ایسا حسین امتزاج تھی کہ اُسے میک اپ کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

پھر ہم لوگ فر کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے نیچے جا بیٹھے یہاں خنک سائے کی دھاریوں میں دھوپ کی پیلی دھاریاں اس طرح مل گئی تھیں کہ میں نے سمجھا جین نے زرد دھاریوں والا سوئیٹر پہن رکھا ہے۔

میں نے اپنا جھولا کھول کر سفید کاغذ میں لپٹے ہوئے انڈے اور پنیر کے سینڈوچ نکالے دو سینڈوچ اسے دیئے دو خود لئے، میرے تھرماس کے اوپر دو ڈھکن تھے۔ ایک اور اندر والا چھوٹا، بڑے خول میں اُسے چائے دی دوسرے خول میں اپنے لئے رکھ لی۔

اُس کے چھوٹے چھوٹے ہم سطح سفید دانت سینڈوچ کترنے لگے۔ وہ مجھے اس وقت نرم سمور والی گلہری لگ رہی تھی۔ وہ سینڈوچ کترتی جاتی تھی اور بیچ بیچ میں چائے سپ کرتی جاتی تھی۔ اُس کے چہرے سے نشے والی کیفیت بالکل دور ہوگئی تھی اور اب ایک صحت مند چمک آتی جا رہی تھی۔ اُس کے کھانے کا انداز دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ وہ بہت بھوکی ہے۔ شاید رات سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا، نشہ کر کے غین ہوگئی تھی۔

میں نے اُسے ایک سینڈوچ دیا جو اس نے مختصر سے انکار کے بعد قبول کر لیا۔

سینڈوچ اور چائے کے بعد میں نے ٹھمین کا ایک سگریٹ اُس کے ہاتھ میں تھمادیا دوسرا خود لیا۔

وہ زور زور سے کش لینے لگی۔ اُس کی نیم باز آنکھوں میں گزرے ہوئے زمانے کا ملال جھلکنے لگا۔

اوپر کسی ایک شاخ سے شبنم کا ایک قطرہ گرا اور بالکل اس کے سگریٹ کے جلتے ہوئے حصے پر گر کر اُسے بجھا گیا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اُس کے چہرے پر آئی بولی ''اس شبنم کے قطرے اور اس ٹیلیگرام میں کوئی فرق نہیں ہے جو ایلیکس کی موت پر مجھے ملا تھا۔''

میں چپ رہا اس نے اپنے بیگ کو ٹٹولا اس میں سے ایک لائیٹر نکال کر اپنا سگریٹ پھر سلگا لیا بولی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو ایلیکس نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ اب تک وہ کم سے کم پندرہ ویت نامی ہلاک کر چکا ہے مگر وہ قاتل نہیں تھا، کالج میں ہر وقت لیبارٹری میں گھسا رہتا تھا۔ انسانی خلیوں کی حیرت انگیز تنظیم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ ہم لوگ لمبی لمبی سیروں کے لئے نکل جاتے وہ دوسرے لڑکوں سے مختلف تھا۔ جو جنگجو اور گھونسے باز ہوتے ہیں اور ہر وقت لڑائی پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ ایک سائنس دان بننا چاہتا تھا۔ مگر اُسے اُس کی مرضی کے خلاف لڑائی کے محاذ پر بھیج دیا گیا جہاں پر اُس نے پندرہ ویت نامی مار ڈالے اور آخر میں خود بھی ہلاک ہوگیا۔ میں کبھی بھی اُس کے ہاتھ کا نرم لمس یاد کرتی ہوں اس کی آواز کا گھمبیر لہجہ تو سمجھ بھی نہیں سکتی، کیسے اس نے گولی چلائی ہوگی۔ کیسے ایک انسان کو ہلاک کیا ہوگا شاید غلط رشتوں سے غلط قدریں پیدا ہوتی ہیں۔''

''نہیں'' میں نے کہا'' غلط قدروں سے غلط رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ الیکس میدان جنگ میں نہ بھیجا جاتا۔ اگر یہ فرض نہ کرلیا جاتا کہ امریکیوں کو ہر پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کا حق حاصل ہے اس غلط قدر سے وہ غلط رشتہ پیدا ہوا جس نے لاکھوں نوجوان امریکیوں کی زندگی کو لکڑی کی چھوٹی چھوٹی صلیبوں کی صورت میں میدان جنگ کے قبرستان میں گاڑ دیا۔ زندگی لکڑی کی صلیب تو نہیں ہے نا، مگر ہو جاتی ہے کیوں؟، سوچا کبھی؟''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''میری زندگی تو زہر کی صلیب بن چکی ہے کہیں سکون نہیں ملتا، سکون کی تلاش میں انڈیا آئی تھی، یہاں کے جوگیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا ایک جوگی ملا جو پانچ منٹ میں سکون عطا کرتا ہے ایسا منتر ہے اس کے پاس، میں نے پانچ منٹ تو کیا بیسیوں گھنٹے پھونک ڈالے اس منتر کے جاپ میں مگر میرے دل کا شور سرشام بازار کے ہجوم کی طرح بڑھتا ہی گیا۔ پھر ایک ملا تھا۔ بچہ یوگی جس نے مجھے سکون دینے کے لئے مجھ سے ستر ڈالر کی فیس چارج کی کچھ عجیب سا لگا۔ جتنی مجھے سکون کی تلاش تھی اتنی ہی اسے ڈالروں کی تلاش تھی۔ اپنا اپنا یوگ ہے بھائی میں دو سو ڈالر گنوا کر اس پندرہ سالہ بچہ یوگی سے پند چھڑا کے بھاگی تو ایک پہلوان ٹائپ کے اوتار کے پاس پہنچی، جس کی ایک جرمن چیلی تھی وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی، شاید اپنے آشرم میں مجھے دیکھ کر اس کا سکون تباہ ہوتا تھا۔ میں وہاں بھی ڈیڑھ سو ڈالر گنوا کر بھاگی، اور ایک ماڈرن گرو کے پاس پہنچی۔ بہت پڑھا لکھا تھا وہ فصیح انگریزی میں بھاشن دیتا تھا۔ اُس کے چرن چھو کر اس کی چیلی بن گئی گرو نے مجھے پرانا نام سکھایا اور مستک میں سانس روکنے کا ڈھنگ بتایا۔ سوچا یہاں شائد مجھے سکون مل جائے گا کہ ایک دن وہ رات کو میرے کمرے میں آ دھمکا۔

میں نے اسے جھک کر سیس نوایا، اُنہوں نے مجھے گلے لگالیا میں جلدی سے الگ ہو کر بولی'' یہ کیا حرکت ہے؟''

گرو بولے'' ہم بھگوان کا اوتار ہیں تم سے آخری دکشا لینے آئے ہیں۔''

''وہ کیا؟''

وہ بولے'' بس گرو اور اُس کے ششیہ میں کوئی دیوار نہ رہنی چاہیے۔''

میں نے کہا۔'' شریر جسم، کی دیوار تو ہے اسے کیسے توڑو گے بھگوان؟''

وہ بولے "ایک دوسرے میں لین ہو کر (گھل کر)
وہ پھر میرے قریب آنے لگے۔ میں نے پلٹ کر جوڈو کا داؤ دیا ہم امریکن لڑکیوں کو آج کل جوڈو کراٹے سیکھنا پڑتا ہے کیونکہ ڈاؤن ٹاؤن میں غنڈوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ جوڈو کے ایک ہی وار سے بھگوان چاروں خانے چت گرے اور سانس ایک دم مستک میں آگیا، میں اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے بھاگی۔ تب سے کسی جوگی سے نزدیک نہیں پھٹکی اور اب میں نے غلط یا صحیح سکون پانے کے لئے ایک طریقہ بھی ڈھونڈھ لیا ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"پیتھاڈین جو پانچ منٹ کے بجائے دو منٹ میں سکون دیتی ہے۔"
میں نے اُس کی بانہوں کے نیلے دھبوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"اتنا تو مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے۔"
پھر وہی تلخ مسکراہٹ......!
میں نے پوچھا "ہندوستان میں تم اتنے سال سے ہو، سکون کا کوئی اور ذریعہ نہیں ملا؟"
"ہاں، ایل ایس ڈی اور بہت سے نشے، ہندوستان میں بہت سے نشے ہیں، ایل ایس ڈی تو خیر بہت مہنگا ہے مگر دوسرے نشے ہمارے ملک کے مقابلے میں بہت سستے ہیں اس لیے اب میں نے ہندوستان سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"
"تو یہاں کیا کرتی ہو؟ کوئی کام؟"
وہ ہنسی بولی "جب نشے کے ٹرپ پر جانے کی لت پڑ جائے تو اور کوئی کام نہیں سوجھتا اب تک تو میرے ماں باپ مجھے رقم بھیجتے تھے۔ اب ایک سال سے وہ بھی مجھ سے مایوس ہو چکے ہیں، کچھ نہیں بھیجتے مگر میرا جسم خوبصورت ہے جب مجبور ہو جاتی ہوں تو اُس کی نمائش کرتی ہوں۔"
"یعنی کیبرے گرل؟"
"ہاں اور تمہارے یہاں چٹی چمڑی کی نمائش سے بہت اچھی رقم مل جاتی ہے، چٹی چمڑی کی برتری تمہارے حواس پر بری طرح مسلط ہے حالانکہ میری نگاہ میں کئی ایسی سانولی لڑکیاں ہیں کئی ایسی بانکی لڑکیاں جن کے جسم کے سمٹ جانے کی ادا اور چور نگاہوں کی شرمیلی صدا پر

ہمارے مردوں کے دلوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں میں اپنے یہاں کے کئی مردوں سے پوچھ چکی ہوں مگر تمہارے یہاں کا جو ہوٹل ہے، جو ریستوران ہے صرف چٹی چمڑی کی نمائش کرتا ہے۔

میں نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا "تم نے تو دو سینڈوچ اور ایک چائے کی پیالی پر ساری زندگی بتا دی ایسا کیوں؟ عام طور پر مغربی لڑکیاں بے باک ہونے کے باوجود اتنے کھلے دل کی نہیں ہوتی ہیں۔"

وہ بولی "میں تمہارے قریب آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا، میرے قریب؟ کیوں؟"

"تا کہ تمہارے دل میں میرے متعلق کوئی شبہ نہ رہے۔"

"کس قسم کا شبہ؟"

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"ابھی بتاتی ہوں، کہہ کر جین نے اپنے بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا اور جب اُس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کی انگلیوں میں ایک ریوالور بڑی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

"ہینڈز اپ۔"

میں نے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے ایک دم بھونچکا سا ہو کر پوچھا۔

جین نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بولی "سیدھے اس درخت کے تنے سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ ہاتھ اوپر رکھو اور یاد رکھو اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو گولی تمہارے جسم کے پار ہو گی۔"

میں اس درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا جس طرح اُس نے کہا تھا، میں اُس کی نگاہوں کا مصمم ارادہ پڑھ چکا تھا اس لئے میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی ہاتھ سیدھے اوپر اُٹھائے کھڑا رہا۔

وہ درخت کے نیچے آ گئی اور ایک ہاتھ سے ریوالور کی نالی میری پیٹھ سے لگا کر بولی

"ذرا بھی ہلے جلے تو یہ گولی تمہاری پیٹھ کے پار ہو گی۔"

میں چپ رہا۔

اس نے میری پتلون کی داہنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس میں چند ضروری کاغذات، کچھ ضروری پرزے، چند بل اور پھر میرا سگریٹ کیس نکال لیا پھر دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اس میں سترہ سو کے نوٹ تھے۔ ہوٹل سے چلتے وقت میں نے انہیں کمرے میں نہیں چھوڑا تھا۔ پتلون کی جیب میں ڈال کر نکل آیا تھا۔ وہ کاغذات اور سگریٹ کیس اُس نے اپنے بیگ میں ڈال دیئے۔

پھر اس نے اپنے منی فراک کے اوپر جیکٹ نما بلاؤز پر بندھے ہوئے چھلے والے ایلاسٹک کے کمر بند کو کھولا اور بولی۔

''اپنے ہاتھ درخت کے تنے کے پیچھے سرکا دو۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔

اُس نے میری دونوں کلائیاں بڑی سختی سے ایلاسٹک سے باندھ دیں۔ پھر اس ایلاسٹک کو موڑ کر درخت کے تنے سے باندھ دیا۔

جب اپنی دانست میں مجھے اچھی طرح باندھ چکی تو میرے سامنے آگئی، نوٹ گنتے ہوئے بولی ''ایک دھیلا میرے پاس نہیں تھا۔ بالکل ٹوٹ گئی تھی میں اور ہوٹل کا بل چڑھا جا رہا تھا تمہارے یہ سترہ سو روپے میرے بہت کام آئیں گے'' میں نے کہا ''تم نے بیکار مجھے باندھا، میں یہ سترہ سو روپے تمہیں دے سکتا تھا۔''

وہ ہنس کر بولی ''ریوالور کی نالی کے سامنے سبھی یہی کہتے ہیں۔''

پھر اس نے اپنا بیگ اُٹھایا اسے جھلاتے ہوئے بڑے اطمینان سے بولی۔

''میں جا رہی ہوں تمہارے ہاتھ بڑی مضبوطی سے پیڑ سے بندھے ہیں تم آسانی سے انہیں چھڑا نہ سکو گے، بہر حال میں گھنٹے بھر میں بل ادا کر کے سامان باندھ کر گلمرگ سے رخصت ہو جاؤں گی۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''میرے ہاتھ کھول دو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''واقعی اس میں کیا شبہ ہے۔'' وہ طنز بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''اچھا خدا حافظ تمہارے سینڈوچ بڑے مزیدار تھے اور چائے بھی بہت عمدہ تھی شکریہ بائی بائی۔''

وہ بیگ جھلاتی ہوئی چلی گئی میں درخت سے بندھا رہ گیا۔

☆☆☆

چند لمحے تو درخت سے بندھا حیران اور ششدر کھڑا رہا۔ پھر سارے جسم میں ا
پھریری سی آئی اور دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر چند منٹ ایسے گزرے، جیسے مارے غ
میرے منہ سے جھاگ نکل رہے ہوں۔ ایک لڑکی نے مجھے ایسا بے وقوف بنا دیا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھ موڑ توڑ کر اُن میں بندھے ایلاسٹک سے نجات پانے ک
ترکیب کرنے لگا۔ مگر جوں جوں میں یہ کوشش کرتا ایلاسٹک اور زیادہ مضبوطی سے
کلائیوں کے اندر دھنستا جا رہا تھا اور اس کی گرفت اور مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور ہاتھوں
سخت تکلیف محسوس ہونے لگی۔ میں نے ایلاسٹک سے الجھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

''کوئی ہے......؟ کوئی ہے......؟'' میں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔

شاید کوئی ٹورسٹ یا چرواہا اِدھر سے گزرے یا میری آواز سن کر اِدھر چلا آوے۔

جب آوازیں دیتا دیتا تھک گیا تو گانے لگا زور زور سے گانے لگا۔

''میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟ اجی میری بھینس کو ڈانڈا کیوں مارا؟''

''بجنی او بجنی, میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟''

جب گاتے گاتے تھک گیا اور کوئی میری آواز سننے کے لئے ادھر نہ آیا تو میں
ایلاسٹک سے جنگ شروع کی۔ میں درخت کے کھردرے تنے میں ایلاسٹک کو رگڑنے لگا
مجھے معلوم تھا کہ کوشش میں میری کلائیاں بھی چھل جائیں گی مگر میں دن بھر اس ایلا
سے بندھا نہیں رہ سکتا تھا۔ کچھ مجھے ایسا احساس سا ہو رہا تھا کہ ایک سفید رنگ کی لڑکی
اپنے ربن سے مجھے باندھ دیا ہے میں زور زور سے ایلاسٹک کو درخت کے کھردرے
سے رگڑنے لگا۔ گو اس میں میرے دونوں ہاتھ زخمی ہو گئے رگڑ سے مگر میں نے کوشش جا
رکھی پھر تنے کے کھردرے زاویے میں ایلاسٹک کی ڈور پھنس گئی اور میں نے زور لگا
ایلاسٹک کو ایک ہی جھٹکے سے توڑ ڈالا۔ درخت سے تو اب میں آزاد ہو گیا مگر میرے
میں دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

میں نے گھڑی دیکھی آدھے گھنٹے سے زیادہ ٹائم نہ ہوا ہوگا۔ میں اب بھی اس
کو جا کر پکڑ سکتا ہوں، اس خیال کے آتے ہی پھر میرے بدن میں غم و غصے اور انتقام کی
پھریری سی آئی اور میں نے جنگلوں سے نکل کر گاف کورس کی طرف ایک تیز دوڑ لگائی۔

مرتے گرتے گرتے بچا کیونکہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے بندھے تھے۔ راستے میں کنور
چھپال سنگھ گاف کھیلتے ہوئے مل گیا۔ میں نے اپنے دونوں بندھے ہوئے ہاتھ اُس کے
آگے بڑھا کر کہا۔

''انہیں کھول دو۔''

کنور چھپال سنگھ نے اپنے دونوں ہاتھ سے اپنی پتلون کی دونوں جیبوں کو ٹٹولا ایک
جیب سے ایک چاقو برآمد کیا اور چھلے والا ایلاسٹک کھولنے لگا اور کھولتے کھولتے کہنے لگا۔

''یہ پیتل کے چھلوں والا ایلاسٹک بڑا قیمتی معلوم پڑتا ہے۔''

میں چپ رہا۔

''کسی نازک کا کمر بند معلوم ہتا ہے۔''

میں چپ رہا۔

''معلوم ہوتا ہے وہ مانی نہیں اور اس نے سزا کے طور پر تمہارے دونوں ہاتھ باندھ
دیئے مگر کلائیوں پر یہ رگڑ کے نشان کیسے؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں چپ رہا۔''

جب ایلاسٹک چاقو کے وار سے ٹوٹ گیا اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے تو میں نے
اُور سے ہاتھ ملا کر رخصت چاہی بولا ''کبھی بتادوں گا ابھی جانے دو شکریہ۔''

اتنا کہہ کر پھر میں نے ہائی لینڈ پارک ہوٹل کی طرف دوڑ لگائی مگر اب سامنے کڑی
چڑھائی تھی اس لئے میری رفتار کم ہوتی گئی اور جیسے جیسے رفتار کم ہوتی گئی، میرا غصہ بھی کم ہوتا
گیا۔ دل آہستہ آہستہ اس لڑکی چالاکی، ذہانت اور ہوشیاری کی داد دینے لگا۔ میں نے دل کو
بہت منع کیا مگر وہ نہیں مانا ہوسکتا ہے اس داد میں اس لڑکی کے بے پناہ حُسن کا اقرار بھی شامل ہو۔

اوپر چڑھتے چڑھتے سانس پھول گیا۔ مجھے ہائی لینڈ پارک ہوٹل بہت پسند ہے
مجھے لکڑی کے بنے ہوئے ہوٹل بہت پسند آتے ہیں۔ لال چھتوں والے پس منظر میں
برفیلے پہاڑوں کی چوٹیاں اور اندر آتش دان میں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے لٹھے جلتے
ہوئے اور گرم بخاری سے ہوا اور دھواں، اوپر کی چمنی کو جاتا ہوا اور باہر لان میں ہفت رنگ
گل داؤدی کی کیاریاں، اس طرح کے ہوٹل برفیلے پہاڑوں کے پس منظر میں اس کی فضا

میں ابھرتے ہیں اس میں سما جاتے ہیں اسی دھرتی کا ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں مگر لگتا ہے کھمبوں کی طرح یہ ہوٹل بھی اس ٹیلے سے راتوں رات آپ ہی آپ ابھر آیا ہے ورنہ شہر کی فضا میں اکثر بلڈنگیں اور عمارتیں غلیظ زخموں کی طرح شہر کے جسم پر پھیلتی معلوم ہوتی ہیں

جب میں ہوٹل کے دفتر کے قریب پہنچا، جو نچلی منزل پر تھا تو مجھے جین نظر آ گئی... ہوٹل کا حساب چکا رہی تھی اور اُس کا سامان دفتر سے باہر بندھا ہوا رکھا تھا اور اس کے قریب ایک مزدور کھڑا تھا جو اس سامان کو اُٹھا کر پہنچانے والا تھا۔

جین نے بلو بلیک رنگ کی ایک میکسی پہن رکھی تھی جس پر سفید پھول تھے ذرا سی بھی حرکت سے اس کی میکسی گھاگھرے کی طرح جھول جاتی تھی اور رقص کا سا لطف دیتی تھی۔

اُس کا پُرسکون مسرت بھرا چہرہ مجھے دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ شاید اُس نے میرا اندازہ کرنے میں غلطی کی، شاید اس کا خیال یوں نہ تھا کہ میں اتنی جلدی اس کی گرفت سے آزاد ہو جاؤں گا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلکے سے تیرنے لگے اور چہرہ شک وشبہات اور خطرے کے تاثرات سے معمور ہو گیا۔

دفتر کے باہر لکڑی کے دوستونوں سے ٹیک لگائے دو پولیس کے آدمی کھڑے تھے یہ میرے سامنے ہی آئے تھے وہ لوگ ہوٹل کے دائیں طرف سے آئے تھے میں بائیں طرف کی چڑھائی چڑھ کے آیا تھا اور اب لکڑی کے ستونوں سے ٹیک لگائے اپنی سانسیں ٹھیک کر رہے تھے۔

جین نے ابھی تک اُنہیں نہ دیکھا تھا اب تک وہ اپنے ہوٹل کا حساب دیکھنے میں مصروف تھی جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور پھر پولیس کے آدمیوں پر تو وہ چند لمحوں کے لئے بے حد گھبرا گئی۔ پھر اُس نے کوشش کر کے اپنے آپ پر قابو پا لیا اُس نے اپنے بال جھلائے، کمر کو ایک ذرا سا خم دے کر گھاگھرے نما میکسی کو جھلایا اور خود بھی شاخ ثمر دار کی طرح جھول گئی۔

میں دفتر کے اندر گیا۔

وہ ایک دم جامد وساکت کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ میں نے اسسٹنٹ منیجر سے کہا

"مجھے ایک شکایت کرنا ہے۔"

''کیا؟''

وہ بڑے غور سے سن رہی تھی اس کا سارا جسم پتھر کا ہو گیا تھا۔

میرے کمرے کی چمنی سے دھواں ٹھیک سے نہیں نکلتا ہے بہت سا دھواں واپس کمرے میں آتا ہے۔''

اسسٹنٹ منیجر نے کہا ''ابھی آدمی بھیج کر چند منٹ میں ٹھیک کروائے دیتا ہوں۔''

جین کے چہرے پر سے پریشانی کی رو غائب ہو گئی ہلکی سی مسکراہٹ عود کر آئی، میں انکھیوں سے اُسے دیکھ رہا تھا بل دیکھ کر اُس نے رقم ادا کر دی؟ اسسٹنٹ منیجر نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اسے مس صاحبہ کو چالیس روپے واپس کرنا ہوں گے مگر اُس کے پاس کھلا نہیں ہے وہ ابھی باہر سے لا کر دے گا۔

جین بولی ''یہ سو روپیہ مجھے واپس دو مجھے تمہاری دکان سے کچھ خریدنا ہے۔''

وہ دکان میں گھس گئی جو اسسٹنٹ منیجر کے دفتر کی بغل میں واقع تھی میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے دکان میں گھس گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ دکان والے سے سفید سمور کی ایک ٹوپی طلب کرنے لگی۔ بہت جلدی سے اسے اپنے سائز کی سمور کی ٹوپی مل گئی ٹوپی لے کر اُس نے بار بار اپنے سر پر پہنی، یہ مردوں والی جناح ٹائپ کیپ تھی مگر بالکل سفید سمور کی آخر میں جین نے اس ٹوپی کو ایک بانکے زاویے پر اپنے سر پر سجا لیا اور سو کا نوٹ تڑوا کر گنگناتی ہوئی واپس نکلی، میں پیچھے پیچھے تھا مگر اُس نے میری طرف نگاہ تک نہیں ڈالی۔ ہاں اتنا مجھے معلوم تھا کہ میں اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں۔

دکان سے باہر نکل کر میں نے ایک پولیس مین سے کہا۔ ''اوپر بار میں آؤ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

وہ پھر لڑکھڑا سی گئی مگر میں نے اُس کی طرف نہیں دیکھا پولیس مین کو لے کر اوپر بار کی طرف چلا گیا مگر بار میں گھسنے سے پہلے ہی میں نے اس سے نہایت رازدارانہ لہجے میں پوچھا اور اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ تھما دیا۔

''یہاں کوئی چوری کی واردات ہوئی ہے؟''

''نہیں صاحب ہم کو معلوم نہیں۔'' وہ پولیس مین سیلوٹ مارتے ہوئے بولا۔

''تو پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''ہماچل پردیش کا ایک منسٹر یہاں آ کے ٹھہرا ہے اس لئے۔''

''ایک کام کرو گے؟'' میں نے اس کے ہاتھ میں پانچ کا ایک اور نوٹ دے کر کہا۔

''کروں گا جناب۔''

''نیچے تم نے دفتر میں میم صاحب دیکھی تھی؟''

''ہاں جناب۔''

''جب وہ اپنا سامان لے کر جانے لگے تو اس کی طرف گھورتے رہنا''

''گھورتا رہوں گا جناب۔'' وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''بس یہی کام ہے۔''

''ہاں، تم گھورتے رہو گے جب تک وہ ہوٹل سے باہر نہ چلی جائے۔''

''بہت اچھا جناب۔''

میں بار کے اندر چلا گیا اور کالج کی بڑی دیوار سے لگے ایک ایسے ٹیبل پر بیٹھ گیا جہاں سے ہوٹل کا راستہ صاف دکھائی دیتا تھا بیرے سے میں نے ایک جن زانو کا آڈر کیا۔ وہ شمپین کے گلاس میں جن زانو لے کر آیا۔ میں دھیرے دھیرے اسے سپ کرنے لگا اور نیچے دیکھنے لگا۔

کوئی پانچ منٹ بعد جین لکڑی کے نچلے برآمدے سے نمودار ہوئی، اُس کے آگے آگے اُس کا سامان اُٹھائے مزدور چلا جا رہا تھا۔ جین بار بار متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی جاتی تھی۔

شاید وہ مڑ مڑ کر پولیس مین کو دیکھ رہی تھی۔ جو برابر اس کو گھور رہا ہو گا۔

مجھے مزہ آ رہا تھا۔

جب وہ آگے نکل کر ہوٹل کے ونگ نمبر دو کے قریب پہنچی جہاں کی ڈھلوان سے نیچے اتر کر وہ میری نظروں سے غائب ہو جائے گی تو اس نے پھر مڑ کر ہوٹل کی طرف دیکھا یکایک اُس کی نگاہ اوپر کے بار پر پڑی اور اُس کی نگاہیں مجھ سے مل گئیں۔

میں نے مسکرا کر اپنا جام اتنی دور سے اُس کی طرف دیکھ کر آگے بڑھایا اور پھر سپ کر کے اُسے سپ کر لیا۔

میں اتنی دور سے اُس کے چہرے کا ردِعمل نہ دیکھ سکا مگر کنور چھپال سنگھ نے میری حالت دیکھ لی تھی۔ اندر آکر میری کرسی کے قریب کھڑے ہو کر بولا۔

"تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟"

"نہیں، مگر کسی خوبصورت لڑکی کو یوں الوداع کہنے میں کیا حرج ہے؟ میں نے کہا۔

کنور میرے پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے مارٹینی کے جام سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"نمبر ون حرافہ تھی دس دن ہوٹل میں رہی کم بخت نے کسی کو پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیا۔"

"تمہارے خیال میں جو لڑکی پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دے وہ حرافہ ہوتی ہے؟"

"ہاں۔"

"اور جو پٹھے پر ہاتھ رکھنے دے؟"

"وہ بے وقوف ہوتی ہے۔" کنور چھپال سنگھ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ میں بھی اُس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

☆☆☆

دن ڈھلے لگا دیودار کے پیڑ سبز رنگ میکسیاں پہنے شاید کیرول گانے کے لئے ایک دوسرے سے لگے کھڑے تھے۔ اونچے برفیلے پہاڑوں پر شاید جین کی طرح بہت سی لڑکیاں سفید سمور کی ٹوپیاں پہنے کھڑی تھیں۔ فضا کی آنکھیں نشے سے بند ہو چکی تھیں اور کسی نے ہوا کے ہاتھ درختوں کے پیچھے باندھ دیئے تھے۔

میرے دل میں عجیب طرح کا اطمینان تھا میں نے سری نگر فون کر کے اسٹیٹ بنک سے مزید روپیہ بھجوانے کے لئے کہہ دیا تھا، اور اب مجھے اطمینان تھا کہ میں نے اس مجبور لڑکی سے بدلہ نہیں لیا بس اسے ذرا سا ڈرا کے چھوڑ دیا۔

میرے دل میں سکون تھا شام کی چائے اور گرم گرم تکونے بہت عمدہ تھے۔ رات کے کھانے بھی بڑھیا تھے اور سوتے وقت سانڈرس کی کتاب کے جو دو باب کازبوریئے مشہور تعمیر کار کے بارے میں تھے وہ بھی انتہائی دلچسپ تھے۔

میں نے اپنی کلائیوں کے چھوٹے چھوٹے زخموں کو پھر بینڈز ایڈ لگائی اور بتی بجھا کے چادر اوڑھ کے سو گیا۔ رات کے گہرے گداز سناٹے میں جلدی نیند آگئی۔

جب آنکھ کھلی تو کوئی دھیرے دھیرے مگر مسلسل دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا میں نے بتی جلا کے گھڑی دیکھی رات کے دو بجے تھے۔ اتنی رات کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

سامنے جین کھڑی تھی ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی۔

بولی۔ "میں تمہارا قرضہ چکانے آئی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ خود ہی اندر آ گئی اور اندر آ کر اُس نے خود ہی دراوزہ پر چٹخنی چڑھا دی اور پھر ایک لمبی سانس لے کر میری بانہوں میں آ گئی۔

☆☆☆

مکعب کا جوف مخمل کی سطحیں، آسودگی کی کراہیں اور بدن آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں کی طرح ٹوٹتے ہوئے، میں نے گلابی شیڈ کے لیمپ کے اوپر اپنی بادامی سلک کی قمیض ڈال دی تھی اور اُس سے جو ہلکا ہلکا نور نتھر رہا تھا اُس نے اس کے اشرفی رنگ بدن کو اور بھی نکھار دیا تھا جیسے اُس کا سارا بدن کاش زر سے تراشا گیا ہو۔

اُس کا چہرہ میرے ہاتھوں کے ہالے میں تھا اور میں اسے بار بار دیکھ لیتا تھا کیونکہ میں مرد کی بے چہرگی برداشت کر سکتا ہوں عورت کی بے چہرگی نہیں، عورت اپنے چہرے سے عبارت ہے ورنہ اُس کے ٹارسو سے تو ہر شخص بغلگیر ہو سکتا ہے۔ عورت کا چہرہ گلاب کا پھول، پائن کی خوشبو، ہوا کی راگنی، یہی تو ابدی فطرت کے چہرے ہیں۔

بعد میں اُس نے مجھے بتایا "تم میرے پہلے کالے آدمی ہو۔"

"واقعی۔" میں نے اُس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیسے ہوتے ہیں کالے آدمی؟"

وہ زور سے ہنسی، سر ہلا کے بولی۔

"نہیں بتاؤں گی۔"

پھر میرے کان کی لو کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کے بولی۔ "تمہیں کیا لگتا

جان، کہوں کہ رمیش کہوں کہ سکندر کہوں کہ علی کہوں؟''

میں نے کہا'' جو کچھ کہنا ہے نگاہوں سے کہہ دیا کرو۔''

''واہ کیا میں گونگی ہوں؟'' وہ میرے کان کی لو کو ذرا سا اٹک کر بولی۔

''سنو جب میں اپنے آپ کو کمزور پاؤں گی تو تمہیں جان کہوں گی، کیونکہ جان بڑا مضبوط اور سہارا دینے والا نام ہے جب میں کسی ہندوستانی لڑکی کی طرح جھجک اور شرم محسوس کروں گی تو تمہیں رمیش کہوں گی۔ جب ٹوٹ کے محبت کرنا چاہوں گی تو علی کہوں گی اور جب مجھے میرا پہلا منگیتر یاد آئے گا، تو تمہیں الیکس کہوں گی کیونکہ جو الیکس وہ الیگزینڈر یعنی سکندر کا مخفف ہے ہے ناں؟ چار ناموں والے آدمی کیا عجیب تمہاری چار شخصیتیں بھی ہوں اور یہ تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ مین ایک ہی شخصیت والے آدمی سے جلد بور ہو سکتی ہوں اور جب تمہارے چار نام ہیں تو چار شخصیتیں بھی ضرور ہوں گی ایک سنیچر وار کے لئے، ایک اتوار کے لئے، ایک سوموار کے لئے اور ایک منگل وار کے لئے اور بدھ سے پھر پہلی شخصیت......!''

میں نے کہا'' تم ناشتے کی طرح کیا میری شخصیت کا مینو بنا رہی ہو؟''

اُس نے ہنس کر اور ایک انگلی بڑھا کر میرے دائیں رخسار کو ذرا سا دبایا اور پھر پوچھنے لگی۔

''سگریٹ کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم، میرا سگریٹ کیس تو تم لے گئیں۔''

''ہاں یاد آیا وہ تو میرے تکیے کے نیچے ہے۔''

اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ کیس نکالا، لائٹر نکالا، بولی،'' پیو گے؟''

''نہیں۔''

''ایک کش لے لو۔''

اُس نے ایک کش لے کر سگریٹ میرے حوالے کر دیا میں نے ایک کش لے کر سگریٹ اُس کے حوالے کر دیا یوں ہی سگریٹ میرے اُس کے درمیان لبوں کی پیاس لئے گھومتا رہا اور دھوئیں کے چھلے کمرے کی چھت کی طرف جاتے رہے۔

وہ سیدھی لیٹی تھی اور اُس کی نگاہیں چھت پر تھیں وہ میری طرف پلٹے بغیر بولی۔

''جان۔''

''یس جین۔''

''تمہارا مذہب کیا ہے؟''

''میرا مذہب کوئی نہیں اور اگر ہے تو فنِ تعمیر......! میں اینٹ پر اینٹ رکھ کر آسمان کی طرف اٹھتا ہوں۔''

''میرا تو کبھی مذہب تھا میں شاعری میں اعتقاد رکھتی تھی۔ ایک اچھی نظم کو پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں چرچ میں داخل ہو رہی ہوں مگر ویت نام نے نہ صرف میرا منگیتر بلکہ میرا مذہب بھی مجھ سے چھین لیا، میری روح ایک کانسنٹریشن کیمپ ہے جس کے باڑھ دار جنگلے کے اندر سے بھوکے ننگے پھٹے حال عقیدے جھانکتے ہیں کیا تم سمجھ سکتے ہو؟''

ہاں سمجھ سکتا ہوں کیونکہ جس ماحول میں پلا اور بڑھا وہاں تین مذہب میری آستین پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری آستین جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور میں کسی ایک مذہب کا نہ ہو سکا۔''

''مجھے شوارز کی ایک نظم یاد آ رہی ہے۔'' وہ بولی اور پھر اُس نے شاعری کے آہنگ میں انگریزی میں کہنا شروع کیا۔

زندگی کیا ہے۔

چاقو مارنا۔

چاہے وہ جانور ہو عورت ہو یا پتھر۔

سب کاٹ دینا کہ آخر میں

صرف روح رہ جائے۔

نفرت کے ذریعے ہم محبت تک پہنچتے ہیں۔

اور کوئی ذریعہ نہیں!''

میں نے کہا ''ہاں اس عہد کا سب سے بڑا مذہب نفرت ہے۔''

وہ بولی ''تم میرے خیالات کی تہہ تک بہت جلد پہنچ جاتے ہو لگتا ہے تمہاری میری

انہی نبھے گی۔"

میں نے پوچھا۔" کیا تم لانگ ٹرم میں سوچ رہی ہو؟"

یکا یک اُس نے اپنا لہجہ بدل دیا بولی "میں یہ سوچ رہی ہوں تم نے مجھے کیسے جانے دیا، مجھے پولیس کے حوالے کیوں نہ کیا؟"

میں نے ہنس کر کہا۔" پولیس کے حوالے کرتا تو آج کی رات کیسے ملتی؟"

" بکومت سیدھے سیدھے جواب دو۔"

میں نے کہا۔"محض سترہ سو روپے کے لئے مجھے ایک مجبور لڑکی کی بے عزتی گوارا نہ تھی۔"

اس کا مطلب ہے سترہ سو روپے تمہارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے؟"

میں چپ رہا دل میں کہا" تم سے بحث کرنا فضول ہے تم جو سمجھتی ہو، سمجھتی رہو۔"

چند منٹ کے توقف کے بعد وہ بولی" بڑے قاردی لانگ ٹرم چلو اس خوشی میں ایک ایک پیگ ہو جائے۔"

میں نے کہا" میری وہسکی کی بوتل خالی ہو چکی ہے اور صبح کے چار بج رہے ہیں اور مجھے بے تحاشا نیند آرہی ہے۔"

"سو جاؤ میرے ننھے۔" وہ میرے گال تھپک کر بولی۔ اور کسی زبان میں ایک ایسی لوری سنانے لگی جو میں نہیں سمجھتا تھا مگر اُس کی آواز میں گلاب کی پتیوں کا ریشم تھا۔

"یہ کون سی زبان ہے؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

☆☆☆

"یہ ویلش زبان کی لوری ہے میری ماں ویلش تھی۔"

وہ پھر گنگنانے لگی مجھے نیند آنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں میں کب سو گیا کب تک سوتا رہا، جب جاگا تو گھڑی آٹھ بجا رہی تھی۔

وہ میرے بستر پر نہ تھی کروٹ بدل کے دیکھتا ہوں تو وہ دوسرے پلنگ پر بھی نہ تھی۔ کمرے میں کہیں نہ تھی دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ چٹخنی بھی اندر سے لگی تھی، کوئی کھڑکی بھی اندر سے کھلی نہ تھی۔ ایکا ایک مجھے باتھ روم کا خیال آیا۔

''جین جین جین۔''میں نے بستر پر لیٹے لیٹے آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔

میں بستر سے اُٹھ کر باتھ روم کے دروازے تک گیا۔ باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا۔

''جین جین جین کیا تم باتھ روم میں ہو؟''

کوئی جواب نہیں آیا مگر دروازہ ذرا سا دباؤ سے کھل گیا میرے سامنے باتھ روم کے فرش پر جین کا جسم پڑا تھا۔ میں ایک دم گھبرا سا گیا جلدی سے اُٹھا کر سامنے والے پلنگ پر ڈال دیا۔ نبض ٹٹولی جین زندہ تھی مگر بے ہوش پڑی تھی۔ نشے میں غلطاں مجھے سوتا دیکھ کر اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر جین نے ایک ٹرپ اور لگا لیا تھا۔

☆☆☆

میں اُسے نشے میں اسیر چھوڑ کر ایک لمبی سیر کو نکل گیا واپسی پر میں نے ناشتا نیڈوز میں کیا حالانکہ اس وقت ناشتے کا وقت بھی نہیں رہا تھا کوئی گیارہ بجے تھے۔ جب میں نے نیڈوز میں ناشتا لیا دھیرے دھیرے کوئی پون گھنٹہ میں نے ناشتے میں صرف کیا دراصل میں اس وقت واپس اپنے ہوٹل جانا چاہتا تھا جب وہ ہوش میں آچکی ہو۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب اپنے ہوٹل میں آیا کمرے کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی۔ صفائی تو بیرے بھی کرتے ہیں لیکن اگر کسی کمرے کو گھڑ عورت کے ہاتھ لگ جائیں تو اس کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے دو گلدانوں میں اکی بانا کے نئے اسٹائل پر پھول سجائے گئے تھے اور انہیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ جین کو اکی بانا گل ریزی پر بھی مہارت حاصل ہے۔

مینٹل پیس پر کئی چیزیں نہایت قرینے سے سجادی گئی تھیں اور دونوں پلنگوں پر نئے بیڈ کور بچھے ہوئے تھے اور وہ خود کریم کلر کا ایک کاٹن فراک پہنے جس پر رنگا رنگ پھولوں کی گلکاری تھی گلاب کی ایک کیاری کی طرح کھلی ہوئی، میرا وارڈ روب کھولے اس میں کپڑے سجاتے ہوئے کچھ گا رہی تھی۔ کچھ اس قدر اطمینان سے جیسے وہ اور میں کچھ آج سے نہیں برسوں سے رشتۂ مناکحت میں پرو دیئے گئے ہوں۔ فلیکسن بالوں کا ایک ڈھیلا ڈھالا جوڑا

بڑے گھریلو انداز سے اُس کی گردن کے پیچھے لٹک رہا تھا اور وہ خود اس قدر دھوئی دھلائی صاف اور معصوم دکھائی دے رہی تھی جیسے اُس نے رات کوئی غلط حرکت نہ کی ہو، کسی خطرناک نشے میں غلطاں نہ ہوئی ہو، مجھے اس پر بہت غصہ تھا اور اس پر برسنے والا تھا مگر اس کا فرشتہ صفت موڈ اور پیاری پیاری گھریلو ادائیں دیکھ کر میرا دل پگھل گیا۔ ویسے بھی میرا دل خوبصورت عورتوں کو دیکھ کر آدھی پگھلی ہوئی صورت میں ہمیشہ رہتا ہے اس نے مجھے دیکھ کر ایک نہایت چمکیلی مسکراہٹ مجھے عطا کی۔

''ہائی جان'' وہ بولی۔

''ہائی۔'' میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر کہا اُس کا نام نہیں لیا۔

وہ میرے لہجے میں ذرا چونکی بولی ''کیا بات ہے تمہیں اس کمرے کی نئی ترتیب پسند نہیں آئی؟''

''بہت پسند آئی۔'' میں نے کہا۔

''پھر اس قدر اکھڑے اکھڑے سے کیوں ہو؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا موڈ کیسا ہے؟

''عورتیں صرف ایک جھلک سے معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں عورتوں کی چھٹی حس بہت تیز ہوتی ہے جب کہ مردوں کے پاس ان کے پانچ حسیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔''

میں ہنسا'' وہ میرے قریب آ کر مجھ سے لگ گئی میرے کان کی لوکنک کر بولی۔

''خفا نہیں ہوتے کہو آئی ایم ساری۔''

''آئی ایم ساری۔''

''کس می۔''

میں نے اُس کا بوسہ لیا۔

''اونہہ تمہارے بوسے میں بھی خفگی ہے۔''

میں نے کہا ''یہ کون سا خطرناک نشہ تم کرتی ہو؟''

''پکنس۔''

''پکنس کیا؟''

''یہ ایک نیا نشہ ہے کرو گے؟ ایک چٹکی لے کر آدمی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔''

''نہ بابا میں باز آیا۔'' اور تمہیں بھی اسے چھوڑ دینا چاہیے۔''

جین نے اپنے سینے سے کندھوں تک صلیب کا نشان بنایا نقلی سنجیدگی کے لہجے میں بولی ''شروع ہو جایئے پادری صاحب اخلاق کے لیکچر پر''

''اخلاق وخلاق کی ایسی تیسی نہیں معلوم ہے صبح تم مجھے کس حالت میں ملیں۔''

''پلنگ پر نشے میں بے ہوش۔'' وہ بولی۔

''نہیں باتھ روم کے فرش پر نیم عریاں حالت میں، باتھ روم کی سردی میں تم مر بھی سکتی تھیں۔''

''بیچ بے چاری جین۔'' جین نقلی ہمدردی جتاتے ہوئے بولی۔

''جین کا جنازہ جا رہا ہے پیچھے پیچھے صرف ایک آدمی اُس کا کالا عاشق جنازے کے ساتھ ساتھ روتا ہوا جا رہا ہے۔''

''مذاق بند کرو۔'' میں نے اُسے بانہوں میں لے کر کہا۔ ''سچ کہتا ہوں تم نے چند لمحوں کے لئے مجھے ڈرا دیا۔''

''اچھا آئندہ ایسا نہیں ہوگا'' جین بولی ''آئندہ میں اپنے پلنگ پر یا تمہارے پلنگ پر ٹرپ لے لیا کروں گی قسم کھاتی ہوں اب مسکراؤ تمہارے سانولے چہرے پر تمہارے سفید دانت کتنے اچھے لگتے ہیں۔''

اُس نے میرے کان کی لو کٹک لی۔

''گلہری۔'' میں نے اُس سے مسکرا کر کہا۔

وہ بولی۔ ''مجھے تمہاری کان بہت پسند ہیں۔''

میں نے کہا ''واہ مرد کے چہرے میں تم نے انتخاب کیا تو کس جگہ کا کیا؟''

وہ بولی ''ایک دن میں تمہارے دونوں کان کتر جاؤں گی۔''

اور میں اُس کے ہونٹوں پر جھکتے ہوئے بولا۔ ''اور میں آج ہی تمہارے لبوں کا سارا شہد......''

اُس کے بعد ہم دونوں کو کچھ بھی یاد نہ رہا۔ کھڑے کھڑے ہی ہم دونوں ایا۔

دوسرے کے لبوں میں کھو گئے اور میں نے جین کو اس وقت چھوڑا جب اُس کی چھوٹی موٹی مُلیاں میرے سینے پر برس رہی تھیں۔

"وحشی۔" وہ بناوٹی غصے سے بولی

"کیوں کیا ہوا؟"

"میری سانس اندر ہی اندر گھٹنے لگی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کتنا لمبا بوسہ تھا؟"

"کتنا لمبا؟"

"میں نے پانچ سو تک گنا۔" وہ بولی

"واہ ایسے میں بھی کوئی گنتا ہے؟"

"میں گنتی ہوں مجھے عادت ہے نشے کی چسکی لیتے وقت بھی گنتی ہوں کہ کتنے میں نشہ ہوتا ہے۔"

"کتنے میں ہوتا ہے۔"

"چھ سو کی گنتی کے بعد۔"

"لو...... تو چھ سو سے پانچ سو ہی بہتر ہیں۔"

"لو......" اُس نے جواب دیا "یہ نشہ اور ہے وہ نشہ اور ہے۔"

"دونوں میں کون سا نشہ بہتر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کچھ کہنے والی تھی کہ اتنے میں ایک بیرا اندر آ گیا اُس کے ہاتھ میں گلابی رنگ کا ایک پرزہ تھا۔

"میم صاحب کا ٹیلیگرام ہے۔"

بیرے نے جین کے ہاتھ میں ٹیلیگرام دیا۔ جین نے ٹیلیگرام پڑھا، بے حد سنجیدہ ہو گئی کچھ کہا نہیں مجھے کچھ بتایا بھی نہیں۔

میں نے پوچھنا مناسب بھی نہیں سمجھا، اتنا مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ جین ایک خودسر لڑکی ہے اڑیل گھوڑی ہے اُسے رام کرنے کے لئے اور راہ راست پر لانے کے لئے بہت وقت چاہیے، اتنا وقت آج کل کس کے پاس ہے، انسان خود اپنے آپ کو سدھار نہیں سکتا۔ دوسرے کو کب، کہاں اور کیسے سدھارے گا اور کون کس کے سدھارنے سے سدھر جاتا ہے؟

ہر شخص کی زندگی کی اپنی ہی سچائیاں ہوتی ہیں اور اپنی ہی غلط کاریاں، جن کے گرد وہ کولہو کے بیل کی طرح گھومتا پھرتا ہے کتنے لوگ ہیں جو اس دائرے سے نکل کر ایک تیر کی طرح آزادی کی فضا میں پرواز کر جاتے ہیں۔

☆☆☆

ہوٹل کے ڈائننگ روم میں کھانا کھاتے ہوئے طے پایا کہ کھلن مرگ پکنک کے لئے چلا جائے۔

میں نے پوچھا ''گھوڑوں پر چلیں گے؟''

''نہیں۔'' وہ بولی ''ہوائی ٹرالی سے چلیں گے بالکل جھولے کا سا لطف آتا ہے۔ بس کھانا ختم کر کے چلتے ہیں۔''

کھانا ختم کرنے کے بعد ہم دونوں درامبوئی سپ کرنے گئے دھیرے دھیرے کھانے کے سرور میں درامبوئی کا سرور شامل ہوتا گیا۔ پھر ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔ خوبصورت عورت کی آنکھوں میں دیکھنے سے بھی سرور ملتا ہے خصوصاً جب وہ آنکھیں ایسی ہوں جیسے سحر کی شبنم میں کھلتے ہوئے بنفشے کے پھول!۔

''ایک جام درامبوئی کا اور؟'' بیرے نے آ کر پوچھا۔

جین چونک گئی ''بولی نہیں میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

میں نے کہا ''تو جب تک میں ایک اور لے لیتا ہوں۔''

☆☆☆

جین کے جانے کے بعد کنور چھپال سنگھ میری ٹیبل پر آ گیا اُس کی بانہیں، گردن، کان، بالوں سے بھرے پڑے تھے۔ آنکھوں کے کونوں تک شیو کرتا تھا۔ تین چوتھائی چہرہ گھٹے ہوئے شیو سے نیلا پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھیں، اور سر پر بھی بے حد گھنے بال تھے۔ دور سے دیکھنے سے ایک کلین شیو ریچھ معلوم ہوتا تھا۔

اُس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ عورتوں میں بہت پاپولر ہے۔

اُس نے آتے ہی میرا کندھا تھپتھپایا پھر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔

''ارے اس دلربا کو تم نے کیسے لاسے پر لگا لیا؟''

"بس لگالیا۔"

"مگر کیسے؟"

"کیوں بتاؤں ہر شکاری کا اپنا ایک گر ہوتا ہے۔"

"بھئی ہم تو اپنے سارے داؤ آزما کے دیکھ چکے۔" اتنا کہہ کر وہ جین کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا، اور میری طرف آگے بڑھ کر بولا "ایک داؤ میں پانچ ہزار روپے کمانا چاہتے ہو؟"

"داؤ بتاؤ۔"

"اس کو کسی طرح پانچ منٹ کے لئے میرے کمرے میں بھیج دو۔"

میں ذرا توقف کرنے کے بعد کہا "کنور جی زمینداری ختم ہوگئی پھر تم کیسے فیاضی سے روپیہ برباد کر سکتے ہو؟"

کنور چھپال سنگھ مسکرا کر بولا "کچھ ختم نہیں ہوا بچے سب اسی طرح چل رہا ہے میرے پاس پانچ سو ایکڑ زمین تھی، میں نے اپنی دو بیویوں اور چار آشناؤں اور بیٹیوں اور بیٹوں میں بانٹ دی۔ دونوں بیویوں کو ظاہراً طلاق دے دی، مگر وہ رہتی میرے پاس ہیں۔ کچھ سچ، کچھ جھوٹ کچھ بے نامی، ساری زمین اپنے پاس ہے ایک مرلہ تک حکومت کو واپس نہیں کرنا پڑا۔ سارے افسر اپنی جیب میں ہیں۔"

کنور چھپال سنگھ نے اپنی جیب تھپتھپائی بولا "پانچ ہزار کا داؤ منظور ہے؟"

میں نے کہا "کنور جی تم تو راجپوت ہو، سنا ہے ہر راجپوت اپنا شکار خود کرتا ہے۔"

کنور بولا۔ "پھر وہی بچوں کی سی باتیں؟ ارے بیٹا ہر شکار میں دوسروں سے مدد لینی پڑتی ہے، مچان بنانے والے مچان بناتے ہیں جنگل جاننے والے شکار کا کھوج لگاتے ہیں ہانکا لگانے والے ہانکا لگاتے ہیں اور شکار کو گھیر کر مچان کے سامنے لاتے ہیں، تب جا کر ایک ٹائیگر ہاتھ آتا ہے۔"

میں نے کہا، "تو تم نے بھی مجھے کوئی ہانکا سمجھ لیا ہے، جو شکار کو گھیر کر تمہاری مچان کے سامنے لاؤں گا؟"

کنور چھپال سنگھ جین کو آتے دیکھ کر اٹھ گیا۔ آہستہ سے بولا۔ "کبھی پانچ ہزار کی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لینا۔"

جب جین کپڑے بدل کر آ گئی تو بولی ''اس بھالونما مسخرے نے مجھے گھیرنے کے لئے بہت چکر لگائے کیا کہتا تھا؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''گاف کھیلنے کے لئے کہتا تھا میں نے کہا ہم لوگ پکنک پر جا رہے ہیں۔''

''مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔'' جین بولی۔

☆☆☆

دو طرفہ فولادی تاروں پر ہوائی ہنڈولہ گلمرگ سے کھلن مرگ جا رہا تھا۔ نیچے ایک چھوٹا سا نالہ تھا اور دو طرفہ دیوار کا اونچا ہوتا ہوا جنگلہ۔

میں نے جین سے پوچھا۔ ''کس کا ٹیلیگرام تھا؟''

''میرے پارٹنر کا۔'' وہ بولی۔

''لائف پارٹنر؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، بزنس پارٹنر۔''

''کیسا بزنس؟''

''تمہیں کیا دلچسپی ہے؟''

''اگر تم میں دلچسپی ہوگی تو تمہارے بزنس میں بھی ہوگی۔''

وہ قدرے ہچکچا کر بولی ''اس کی آمد کی ٹیلیگرام ہے اس کے آنے پر بتا دوں گی مگر شرط یہ ہے کہ پھر تمہیں بھی اس بزنس میں شریک ہونا پڑے گا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا ہاں میں نہ ناں میں، مگر میرا دل کچھ کچھ اداس ہونے لگا۔ اس کے پارٹنر کا سوچ سوچ کے۔ کم بخت کون ہوگا کیسے ہوگا دیکھنے میں کیسا لگتا ہوگا۔ اسے صرف بزنس ہی کا تعلق ہے دوسرا کچھ نہیں۔'' جین نے کہا تھا تم میرے پہلے کالے آدمی ہو تو ممکن ہے یہ کوئی گورا ہو۔ حسد سے میرے دل میں غصے کے جذبات ابھرنے لگے پھر میں اپنے دل کو سمجھانے لگا ''ارے بودم تین سال سے وہ ہندوستان میں گھوم رہی ہے تو کیا کسی کے بغیر رہی ہوگی، ایسی خوبصورت لڑکی کے گرد تو مرد بھنورے کی طرح منڈلاتے ہیں تو کیا پہلا مرد ہے اُس کی زندگی میں؟ یا یہ کیا پہلی عورت ہے تیری زندگی میں؟ تو پھر اس قدر جلنے

کڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو تو یہاں آیا تھا بلڈنگوں کا نقشہ بنانے اور جمانے لگا ہے محبت کا نقشہ؟ ارے اس نشہباز عورت کی زندگی میں جانے کتنے نشے آئے ہوں گے۔ ان میں سے تو بھی اسے چند دن کا نشہ سمجھ کر مزا لے لے گدھے......!۔

مگر اپنے آپ کو گالیاں دینے یا سمجھانے سے بھی دل نہیں سمجھا" کھلن مرگ کی پکنک میں کچھ مزا نہیں آیا مگر جین بہت خوش دکھائی دیتی تھی، اور میری اداسی دیکھ کر اس کی خوشی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ سلیج لے کر برف پر بار بار پھسلی کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر اُسے جھلانے لگتی اور زور زور سے گانے لگتی اُس کے گانے میں طنزیہ ہنسی کے سر بھی شامل تھے۔ جیسے وہ گانا میرا منہ چڑا رہا ہو۔

شام ہوتے ہوتے میری اداسی اتنی بڑھ گئی کہ میرے لئے اُسے چھپانا مشکل ہو گیا۔ میں واپسی میں راستے بھر چپ سا رہا مگر وہ برابر کسی خوش گلو چڑیا کی طرح فضا میں بالوں کی لڑیاں پروتی جا رہی تھی۔

ہوائی ہنڈولے سے اتر کر نالہ پار کر کے جب ہم لوگ ہوٹل کے اونچے رستے پر ہوئے تو اُس نے یکا یک رک کر مجھ پوچھا۔ "ہوا کیا ہے؟ اس قدر چپ کیوں ہو؟"

میں خاموشی سے چلتا رہا ایک ٹیلے کی اوٹ میں رک کر میں نے اُسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر کہا "میں تمہارے پارٹنر کی جان لے لوں گا۔"

وہ زور سے ہنسی، میری بانہوں سے باہر پھسل گئی، بولی، "تم ایسا نہیں کر سکتے، وہ تم سے تگڑا ہے، اس کا سینہ تم سے ڈیوڑھا ہے باکسر رہ چکا ہے، خبردار اس سے لڑائی مت مول لینا وہ تمہیں مار مار کر چوسنے والے آم کی طرح پلپلا کر دے گا۔"

"اُس کا تمہارے ساتھ کیا تعلق ہے؟" میں نے زور سے اُس کی بانہہ پکڑ کر کہا۔

اُس نے جھٹکے سے اپنی بانہہ چھڑا لی پھر کسی قدر غصے میں بولی "تمہیں اُس سے کیا؟ کیا تم میرے منگیتر ہو؟ یا کیا میں تمہاری بیوی ہوں؟ کیا تمہاری میری کورٹ شپ چل رہی ہے؟ میں نے سنا تھا کہ ہندوستانی بڑے شک وحسد اور جلن کے مارے ہوتے ہیں، وہی بات سچ نکلی، ہٹو مجھے جانے دو میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔"

وہ تیزی سے قدم اُٹھا کر ہوٹل کی طرف بلندیوں پر بکری کی طرح اچھلتی بھاگتی چلی گئی۔

میں دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا گیا کیونکہ میں غصے سے اُبل رہا تھا اور میرے

لئے اس غصے پر قابو پانا ضروری تھا میں اُس کے پارٹنر کی نظر میں احمق دکھائی دوں مجھے منظور نہیں اس لئے میں دھیرے دھیرے چلنے لگا اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اونہہ قوت اور طاقت مجھ میں بھی ہے، مگر میں کوئی پیشہ ور باکسر نہیں، ایک جہاں گرد لڑکی کے لئے اپنی ہڈی پسلی تڑوانے کا مجھے کوئی شوق نہیں، جہنم میں ڈالو جین کو اور اُس کے باکسر پارٹنر کو دونوں پر لعنت بھیجو جی۔

آسمان پر شفق کے ہنگامے غائب ہو چکے تھے ردائے شب کی اوٹ میں تارے آنکھ مچولی کھیلنے لگے تھے اور کہیں کہیں اونچے اونچے ٹیلوں پر نرگس کے پھولوں کی لمبی لمبی ڈنڈیاں شام کے جھٹپٹے میں کھڑی کنواریوں کی طرح کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ میں ان کے قریب سے نکلتا چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو جاتیں اور مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر پھر سرگوشی کرنے لگیں، یہ شام کے وقت پھولوں کے جھنڈ میں کیا باتیں ہوتی ہیں؟ جنگل میں سرگوشیوں کے چرچے کیوں بڑھ جاتے ہیں، ندی میں ڈولتا پانی کاجل لگی آنکھوں کی طرح چمکتا کیوں ہے؟ اور رات کے وقت ایسے سوال میرے دل میں سسکیوں کی طرح ابھرتے کیوں ہیں؟

ہوٹل پہنچ کر میں سیدھے اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ پہلے بار میں گیا اور ڈمپل کی نرم ملائم دھیرے دھیرے کسی افسوں کی طرح چڑھنے والی وہسکی کا مزہ لیتا رہا جب طبیعت اعتدال اور سکون پر آ گئی تو اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے جو مین ہوٹل سے الگ مغربی جنگل کے کنارے کاٹج کی صورت میں موجود تھا کمرے میں روشنی تھی میں نے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے جین کی آواز آئی۔

"اندر آ جاؤ۔"

میں اندر چلا گیا، اندر جاتے جاتے میرے دل کی حرکت غیر متوقع طور پر تیز ہو گئی۔

میرے سامنے آرام کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ سیاہ بال، سیاہ ابرو، سیاہ آنکھیں، یاقوتی ہونٹ اور کندن کی طرح دہکنے والے رخساروں پر لہراتی ہوئی زلف......!

"یہ شکنتلا ہے۔" جین دوسری آرام کرسی سے اٹھتی ہوئی بولی......

"میری پارٹنر۔"

☆☆☆

چند لمحوں کے لئے میں شکنتلا کی بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھوں میں کھویا رہا پھر شکنتلا نے بڑے تپاک سے اپنے دونوں ہاتھ مجھ سے ملانے کے لئے بڑھا دیئے پھر مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے بجائے میرے ہاتھ کو دھیرے دھیرے سہلا رہی ہے۔ جیسے کسی کبوتر کو ہاتھ میں پکڑ کر دھیرے دھیرے رام کرتے ہیں۔

جین جواب تک میری حیرت کا مزہ لے رہی تھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''اب زیادہ مت تکو، شکنتلا کی طرف پریشان ہو جائے گی وہ صوفہ ادھر کھینچ لو اور ہمارے قریب بیٹھ جاؤ کیسی لگی تمہیں میری پارٹنر؟'' وہ زور سے ہنسی۔

میں نے کہا ''مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری پارٹنر تم سے کم خوبصورت نہ ہوگی۔''

جین بولی ''ہاں مگر ایک فرق ہے شکنتلا کی خوبصورتی نیم فراموش ماضی کے محبت بھرے افسانوں کی یاد دلاتی ہے میں مستقبل ہوں۔''

وہ دونوں بلور کی طرح چمکنے والے برف کی ٹکڑیوں پر کینڈین وہسکی کا آدھا پیگ ڈالے اسے دھیرے دھیرے سپ کر رہی تھیں۔

میں نے کینڈین وہسکی کی بوتل میز سے ہٹالی۔

جین نے مسرور نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا ''ہاں یہ ٹھیک ہے'' آج میری پارٹنر کی آمد پر جشن ہو جائے گا یہ کینڈین وہسکی نہیں چلے گی۔''

میں نے بیرے کو بلانے کے لئے بٹن دبایا، جین نے مجھے روک کر کہا۔

''تم رہنے دو سب بندوبست میں کروں گی۔''

''ابھی آتی ہوں'' وہ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

اُس کے جانے کے بعد چند لمحوں کی خاموشی رہی پھر میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

''معاف کرنا مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم خالص ہندوستانی نہیں ہو۔''

''نہیں'' وہ بولی ''تم نے ٹھیک پہچانا میری ماں ہنگرین تھی باپ ہندوستانی۔''

''تمہارے اندر ہندوستان اور ہنگری دونوں کا خون ہے امرتا شیرگل کی طرح کیا تم باقی باتوں میں بھی امرتا شیرگل کی طرح ہو؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''نہیں میں مصور نہیں ہوں۔''

’’پھر کیا ہو؟‘‘

’’وہ لڑکی ہوں جسے دیکھ کر لوگ مصوری کرتے ہیں۔‘‘

’’کیا بات کہی ہے واہ واہ شاعرہ ہو شاید؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ وہ بڑے مدھر لہجے میں بولی ’’میں ایک ماڈل ہوں۔‘‘

’’شادی ہو چکی ہے؟‘‘

اُس کی لانبی مخروطی انگلیوں میں بے چینی سی پیدا ہوئی ’’شادی بھی ہوئی پھر طلاق بھی ہوئی، ایک بچی ہے وہ نچ گنی کے ایک سکول میں پڑھتی ہے۔‘‘

’’طلاق کیوں ہوئی، معاف کرنا اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری ایسی عورت کو کوئی آسانی سے طلاق نہیں دے سکتا۔‘‘

’’وہ شاعر تھا! میرا شوہر کچھ کماتا نہیں تھا جو میں کماتی تھی وہ بھی شراب پر خرچ کر دیتا تھا۔‘‘

میں نے ہنس کر کہا۔ ’’شاعر کے لئے شاعر ہونا ہی ضروری ہے کمانا کیا ضروری ہے۔‘‘

وہ ہنسی ’’پہلے پہل تو مجھے بھی بہت اچھا لگا اُس نے مجھ پر بڑی خوبصورت نظمیں کہیں، مگر تم جانتے ہو خوبصورت نظموں سے تو روح سیراب ہوتی ہے پیٹ نہیں بھرتا۔ اس لئے اس لئے......‘‘

وہ خاموش ہو گئی اُس کی آنکھوں میں حزن و ملال جھلکنے لگا۔ میں نے بھی اس گفتگو پر مزید طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اتنا میں نے جان لیا کہ وہ شاعر جو کوئی بھی تھا اُس سے اس لڑکی نے ٹوٹ کر محبت کی تھی مگر یہ دنیا جیسی کہ اب ہے اس میں محبت کافی نہیں ہے اُنہوں نے کاریں بنائیں اور بے کار ایجاد کئے۔ اسکائی اسکریپر اُٹھائے اور ان کے نیچے سلم آباد کئے اُنہوں نے چند لوگوں کو چاند پر بھیجا اور تین چوتھائی آبادی کو گٹر میں پھینک دیا۔ اُنہوں نے زندگی کے ہر گوشے میں بزنس کو زندہ کیا، اور محبت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ محبت کافی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ محبت زندہ بھی نہیں ہے۔ شکنتلا عورت نہیں ہے۔ ایک کار ہے جو پیٹرول کے بجائے پگھلے سونے سے چلتی ہے میں مرد نہیں ہوں، نقشہ نویس ہوں۔ جس کی تعمیر کردہ بلڈنگوں میں لوگ کبوتروں کی طرح کابکوں میں رہیں گے اور

کارخانے کی آگ اور گندھک کے دھوئیں سے شب وروز اپنے پھیپھڑے جلائیں گے۔

پھر جین آگئی اور میں نے جلدی جلدی سے دو تین بار سر ہلا کر اپنے پاس بھرے خیالات کو دور کیا کیونکہ جین نے بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ دو بیرے سامان اُٹھا کے اندر لائے تھے۔ ایک ٹرے میں ڈمپل کی بوتل تھی اور تین کٹ گلاس کے جام اور ایک باؤل میں بلور کی سی برف کی ٹکڑیاں اور بسلیری سوڈا، دوسرے ٹرے میں تیتر کے تکے، تندوری چکن، کاجو، بھنے ہوئے بادام اور چھوٹی چھوٹی بسکٹوں پر سویڈیشن اور سویڈیش پنیر پر پائن ایپل کا ٹکڑا اور پائن ایپل کے ٹکڑے پر چیری۔

پہلا آدھا پیگ کچھ خاموشی میں کچھ چمچے ہلانے میں کچھ، سرویٹ سنبھالنے میں، کچھ ایک دوسرے کو تولنے میں گزرا۔ دھیرے دھیرے شخصیت کی رگڑ کھا کر جب ہم تینوں کی چولیں بیٹھنے لگیں تو نگاہوں میں سرور اور باتوں میں بشاشت عود کر آئی۔

اس موقع کو غنیمت جان کر جین نے گفتگو کا دھارا موڑا۔

جین نے پوچھا ''میری پارٹنر تمہیں پسند آئی؟''

میں نے کہا، ''بہت مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی دو اتنی خوبصورت لڑکیوں میں اتنی یکجائی کیسے؟

جین بولی ''جب اور زیادہ کھلو گے تو معلوم ہوگا کہ ہم دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں مگر بزنس ایک ہے تم چاہو تو تم بھی تیسرے پارٹنر ہو سکتے ہو'' جین نے پتا پھینکا۔

''مگر بزنس کیا ہے؟ مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تمہیں کچھ روپیہ لگانا ہوگا؟''

''کتنا؟''

''بیس ہزار۔''

''اور اگر میرے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟''

''تو ہمارے پارٹنر نہیں بن سکتے''

''مگر بزنس کیا ہے۔''

''یہ تو تم کو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکتے ہو۔''

میں نے سوچا پھر پوچھا ''اور یہ رقم لگا کے فائدہ کتنا ہو سکتا ہے؟''

''کم سے کم دو لاکھ۔''

''نہیں۔'' میں تقریباً چلا اُٹھا۔

''ہاں۔ ہاں۔'' جین نے بڑی دل جمعی سے کہا۔

میں نے پھر سوچا سات ہزار تو میرے سری نگر کے اکاؤنٹ میں ہیں۔ باقی رقم میں بمبئی سے منگوا سکتا ہوں، بمبئی کے اکاؤنٹ میں چالیس ہزار کے قریب پڑا ہے۔ میں ایک ابھرتا ہوا، آرکیٹیکٹ ہوں، ساری زندگی میرے سامنے پڑی ہے، اگر بیس ہزار چلا بھی گیا تو سمجھ لوں گا کہ ایک چاند سے مکھڑے کے لئے پھونک دیا۔

میں نے جین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''ڈن۔''

خوشی کی ایک چیخ مار کر ایک طرف سے جین اُٹھی دوسری طرف سے شکنتلا دونوں مجھ سے لپٹ گئیں۔ چند لمحوں تک ہاتھ، ہونٹ، گال گردن گڈمڈ ہوتے رہے۔

چند لمحوں کے بعد جب سکون طاری ہوا تو میں نے کہا۔

''لیڈیز اب تو مجھے بتا دیا جائے کہ یہ بزنس کا ہے کا ہے؟''

جین بولی۔ ''پکنس کا۔''

''یہ کیا بلا ہے پکنس؟''

جین بولی ''پکنس ایک بوٹی ہوتی ہے جسے پہاڑی لوگ شدید سر درد یا شدید بے خوابی کے لئے استعمال کرتے ہیں اور بہت ہی کم خوراک سے اس کی یوں سمجھئے کہ دو پتے اُس کے چبا لیجئے یا جڑ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بس آرام آجائے گا۔ مگر زیادہ نہیں کھا سکتے زیادہ کھانے سے آدمی مر بھی سکتا ہے۔''

شکنتلا بولی ''مگر ایک خوراک بیچ کی بھی ہے یعنی ایک چٹکی بھر کے لے لیجئے آٹھ دس گھنٹے تک وہ دل آرام نشہ رہتا ہے کہ آدمی سورگ میں پہنچ جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''آدمی ایک خوبصورت عورت کی بانہوں میں بھی تو سورگ میں پہنچ

سکتا ہے۔"

شکنتلا بولی "مگر پکنس کا نشہ زیادہ دیر پا ہے۔"

"اور یہ بوٹی کہاں سے ملتی ہے؟"

شکنتلا بولی "یہ بوٹی بغلیاز کی گھاٹیوں میں پائی جاتی ہے۔

"یہ بلغیاز کدھر ہے؟"

جین بولی "گلمرگ سے ایک بہت ہی دشوار گزار اور تنگ سا راستہ پیدل جانے کا گرجن ڈھوک کو جاتا ہے اور وہاں سے بلغیاز کو اس بوٹی کو چند ہپیوں نے سب سے پہلے دریافت کیا گرجن ڈھوک کے مرغزاروں میں گوجروں کے قبیلے اس بوٹی کو اکثر استعمال کرتے ہیں، وہیں سے اس کا استعمال ہپیوں نے اُن سے سیکھا کچھ ہپی اسے امریکہ لے گئے گزشتہ دو سالوں میں ہی اس بوٹی نے ایل ایس ڈی کو مات دے دی ہے۔ ایل ایس ڈی ایک طرف ہوا اور ادھر دوسری طرف پکنس تو کوئی ایل ایس ڈی کو اُٹھائے گا نہیں مگر ہے یہ بوٹی بہت کم یاب صرف بغلیاز کے پہاڑوں پر پائی جاتی ہے اور بہت دشوار گزار گھاٹیوں میں۔"

تو اس پکنس نام کی بوٹی سے پکنس کا نشہ کیسے تیار ہوتا ہے؟"

"کچھ نہیں کرنا پڑتا۔" شکنتلا بولی "ساری بوٹی میں نشہ ہوتا ہے جڑ سے لے کر پتوں تک پوری بوٹی سکھائی جاتی اور کھرل میں ڈال کر اُس کا سفوف بنالیا جاتا ہے سفوف کے چند ذرے زبان پر رکھ کر لیٹ جایئے اور جنت کی سیر کیجئے۔"

جین بولی "پچھلے سال نیو یارک میں ایک ٹرپ کی قیمت دس ڈالر تھی اس سال ضرور قیمت بڑھی ہوگی۔"

"چند ذروں کی قیمت دس ڈالر؟ میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

میں نے کہا۔" شاید اسی موقعے کے لئے شاعر نے کہا ہے" جو ذرہ جس جگہ ہے آفتاب ہے۔"

جین نے میری بات نہیں سمجھی بولی "کیا کہتے ہو؟"

"کچھ نہیں آگے چلو۔"

"مزے کی بات یہ ہے۔" شکنتلا نے مجھے بتایا "پکنس اگر مقررہ مقدار میں لی جائے تو اس کا جسم پر کافی برا اثر نہیں ہوتا۔ ایل ایس ڈی کے استعمال سے تو لوگ اندھے بھی ہو جاتے ہیں۔"

"تو کیا حکومت اندھی ہے جو تم لوگوں کو یہ دھندا کرنے دیتی ہے۔"

"دو ہی سال سے تو یہ بوٹی چل نکلی ہے ابھی تو بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ بوٹی کس کے لئے استعمال کی جاتی ہے حکومت اور خود گوجر لوگ جو یہ بوٹی ہمارے لئے لاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس بوٹی کو سر درد یا بے خوابی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا "تو کیا اس بوٹی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں بغلیاز جانا پڑے گا۔"

"نہیں۔"

"تو کیا یہیں گلمرگ میں؟"

"نہیں۔" جین کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں "پچھلے سال گلمرگ میں لین دین ہوا تھا اس سال جگہ بدل دی ہے احتیاط"

"کہاں؟"

"ہمیں پرنگ جانا ہوگا کبھی پرنگ گئے ہو؟"

"گاندربل سے آگے ناں؟"

"ہاں، وہیں گوجروں کا وہ قبیلہ آئے گا یہ بلغیاز سے سون مرگ تک گھاٹی گھاٹی اور ڈھوک ڈھوک اپنے گلے چرانے کے لئے لے جاتے ہیں۔"

"کب پرنگ جانا ہوگا؟"

"بارہ تاریخ کو پہنچ جانا چاہیے آج چھ ہے۔"

میں نے دل میں اندازہ لگایا سوچ کر کہا "میں کل ہی سری نگر ٹیلیفون کر دوں گا مگر ٹیلیفون کر دینے سے بات نہیں بنے گی۔ مجھے سری نگر جانا ہوگا۔"

"کیا کل ہی؟" شکنتلا کی آواز میں مایوسی تھی۔

"نہیں دو دن تک اور رک سکتے ہیں۔"

شکنتلا نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "تو ٹھیک ہے آج ہی تو آئی ہوں دو دن تو

گلمرگ کی فضا میں سانس لے لوں۔"

☆☆☆

جب سب کچھ طے ہو گیا تو فضا روشن ہو اُٹھی۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے گلنار
ہوتے گئے کچھ وہسکی کے اثر سے، کچھ بزنس کا تصفیہ ہو جانے سے، وہ جو پہلے ہیرے کی
طرح سخت تھیں کسی اندرونی خوشی سے سرشار ہو کر نرم اور گداز میٹھی اور مہیان ہوتی گئیں
شکنتلا نے ہنگری میں رہنے والے خانہ بدوشوں کا ایک گیت گایا گیت میں محبت کے پرانے
ملبوں کی خوشبو تھی، اور ایسی غنودگی جو اوراق پارینہ کے غم اور افسردگی کی طرف لوٹتی معلوم
ہوتی ہے بار بار اس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھو جاتیں اور ہر بار ان کا لمس گہرا اور دیرپا
ہوتا جاتا مگر جین نے اس کا برا نہیں مانا کیونکہ جب شکنتلا نے اپنا گیت ختم کیا تو جین نے کسی
شاعر کا کلام بزبان انگریزی اپنے مخصوص آہنگ میں سنانا شروع کیا۔

"یہ ابھی زندہ ہیں
نہ سائے ہیں نہ مردہ ہیں
وہ مدہم آواز گلیوں میں
ان کے چلنے کی چاپ ہے
وہ پیتل کی گھنٹیاں ان کی بلند چیخ
بھرے چوک میں ہوا چلتی ہے۔
جہاں تشدد ہے اور کوئی خفیہ تبدیلی
اور سمندر کے نیچے زندگی کے مجسمے ہیں
یہ ہیں حسین عورتیں
اور وہ بزم نشاط جو لٹ جاتی ہے۔"

جین نے میرا بازو پکڑ کر دہرایا۔

"یہ ہیں حسین عورتیں۔
اور وہ بزم نشاط جو لٹ جاتی ہے۔"

"کینتھ نیرنگ جس کا یہ کلام ہے میرا محبوب شاعر تھا۔"

"اب نہیں ہے؟"

"ساری شاعرہ ویت نام میں مرگئی وہ بڑے اداس لہجے میں بولی اور اُس کی آنکھیں گہری ہوتی گئیں اور زیادہ سے زیادہ دیر تک میرے چہرے پر تکتی گئیں مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے چہرے میں کسی دوسرے چہرے کو تلاش کر رہی ہیں۔

اس نے بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا بولی "آؤ میرے پاس آ جاؤ۔"

میں نے بڑی نرمی سے اُس سے کہا "شکنتلا ضرور اس سفر سے تھک گئی ہوگی اسے آرام کرنا چاہیے اب تو مجھے اجازت دو میں اس کے لئے دوسرا کمرہ بک کر کے آتا ہوں۔"

جین نے میرا بازو چھوڑ دیا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

"کیوں ہنستی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جاؤ، جاؤ شکنتلا کے لئے کمرہ بک کر کے آؤ۔"

اب مجھے اطمینان سا ہوا کیونکہ صورت حال نازک سی ہوتی جا رہی تھی میں جلدی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور لان کراس کرتا ہوا اس پتھریلے راستے پر ہو گیا جو ہوٹل کے دفتر کو جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے اپنے کاٹج نما کمرے سے ملحق دوسرا کمرہ مل گیا۔ ڈبل بیڈ کا کوئی مضائقہ نہیں صرف دو دن ہی تو اور ٹھہرنا ہے سب بندوبست کر کے میں جب اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو دونوں لڑکیوں کو شب خوابی کے لباس میں پایا اتنے میں وہ دونوں ڈریس بدل چکی تھیں اور دونوں نے اپنے بال شانوں سے نیچے لہرا لیے تھے جین کے صبح اُجالے کی طرح دمکتے بال اور شکنتلا کے گہری سیاہ رات والے بال جو اس کے پنڈلیوں تک آتے تھے۔ کمرے کی خاموشی میں وہ دونوں بڑی پُراسرار اور خطرناک لگ رہی تھیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میرے پیچھے ان دونوں میں کوئی سمجھوتہ ہو چکا ہے کیونکہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب جھکی ہوئی تھیں۔ بنفشی آنکھیں اور گہری سیاہ آنکھیں۔ دو مختلف رنگ کی جھیلیں ایک ہی جذبے سے چھلکتی ہوئی۔

میں نے کہا، جب عورتیں اپنے بال کندھے تک گرا کے ان کی گھنی اوٹ سے مرد کی طرف دیکھتی ہیں تو بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔"

دونوں ایک ساتھ ہنسیں۔

میں نے کہا۔"میں نے کھانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا کھانا آتا ہی ہوگا۔"

"کسے کھانا چاہیے؟" شکنتلا شکایت بھرے لہجے میں بولی "یہ اتنے سارے سنیکس اور دھیرے دھیرے بدن میں اترتی ہوئی وہسکی اور یہ خوبصورت صحبت...... بہت کافی ہے۔"

جین بولی "ہاں واقعی کھانا کینسل کردو کون کھانا چاہتا ہے آج کی رات تو وہ رات ہے جب ہم نگاہوں سے کھاتے ہیں اور انگلیوں کے لمس سے جیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اسی لئے میں تو نے بہت ہلکا ڈنر کا آرڈر کیا ہے۔ بس سوپ، لیمب چاپ، بریانی، اور چکن قورمہ۔"

"اسے تم ڈائٹ ڈنر کہتے ہو؟" جین زور سے ہنسی اب اسے بار بار بلاوجہ ہنسی آرہی تھی۔

"اور تم خوش ہو جاؤ گی یہ سن کر کہ اُس کے ساتھ مجھے فرنچ وائن کی دو بوتلیں مل گئی ہیں شانو بریاں ۹۰۹۔"

"سویٹ۔" جین بولی۔

"ڈارلنگ۔" شکنتلا نے پیار سے کہا۔

اور دونوں نے دائیں بائیں اپنے گال میرے گال سے لگادیئے۔

اتنے میں دروازہ پر کھٹ کھٹ ہوئی میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے بیرا ٹرالی پر کھانا رکھے کھڑا تھا۔

"تم جاؤ" جین نے اُس سے کہا۔ "ٹرالی اُٹھانے مت آنا صبح آنا کیونکہ ہم لوگ دیر میں کھانا کھائیں گے۔"

بیرا چلا گیا تو جین نے فرنچ وائن کی پہلی بوتل کھولی۔

ہم دھیرے دھیرے پیتے گئے دھیرے دھیرے کھانا چکھتے گئے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے گئے، باتوں کی سطح سرگوشیوں سے کچھ ہی بلند تھی۔ بیچ بیچ میں ننھی ننھی پھلجھڑیوں کی طرح دنوں عورتیں ہنس پڑتیں۔ شانو بریاں ۹۰۹ بڑی شوخ شراب ہے مگر آج تو وہ حرارت سے بھرپور تھی۔

کھانا کھا کر ٹرالی ایک طرف کھسکا دی گئی۔
میں نے جین سے کہا۔ ''اب تو شکنتلا کو جانے دو، بہت تھک چکی ہوگی۔''
وہ بولی۔ '' تھک جائے گی تو میرے بستر پر سو جائے گی۔''
میں چونکا۔
''نہیں نہیں۔'' میرے منہ سے نکلا۔
''کیوں جی؟'' شکنتلا نے میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھا ''کیا تم میرے
تیسرے پارٹنر نہیں ہو؟'' اس نے میرا ہاتھ تھام کے پوچھا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''تم دونوں اس کمرے میں سو جاؤ
میں شکنتلا والے کمرے میں جا کے سو جاؤں گا۔''
''نیند آ جائے گی؟'' جین نے پوچھا پھر جین اور شکنتلا زور سے ہنسیں مگر مجھے...
دیکھ کر جین بولی۔
''اچھا ٹھیک ہے جیسا تم چاہو گے ویسا ہی ہوگا مگر ابھی تو وائن کی ایک بوتل باقی
ہے آؤ اسے ختم کر لیں۔ پھر اپنے اپنے کمرے میں اپنے اپنے بستر پر جا کے سو جائیں گے
یعنی شکنتلا اپنے کمرے میں چلی جائے گی۔''
جین نے بوتل اُٹھائی ''کم بخت اوپنر کہاں ہے؟''
''شاید مینٹل پیس پر ہے۔'' شکنتلا بولی۔
جین وائن کی بوتل اُٹھائے مینٹل پیس کی طرف گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے شکنتلا...
کے تین خالی گلاس اُٹھائے چلی گئی۔ دونوں سر جوڑ کے فرنچ وائن کو شیمپین کے گلاس...
بھرتی رہیں، اور نیم سرگوشیوں میں دبی دبی ہنسی کی پھوار برساتی رہیں۔ پھر جین میرے
پاس آ کر بولی ''لو یہ تمہارا گلاس ہے، یہ میرا اور یہ شکنتلا کا''
ہم تینوں نے جام ٹکرائے اور پھر پینے لگے مگر جام ختم کرنے سے پہلے ہی مجھے
محسوس ہو گیا جیسے اُنہوں نے میرے جام میں کچھ ڈال دیا ہے۔

☆☆☆

وہ دو نہیں تھیں بس ایک تھیں، آدھی طرف کے بال سنہرے تھے آدھے سیاہ...

آنکھ بنفشی تھی ایک سیاہ۔ ایک گال سونا اور دوسرا چاندی پھر وہ دونوں پگھلنے لگیں اور کرسیوں سے اُٹھ کر چھت کو چھونے لگیں، وہ الگنی پر ٹنگے کپڑے کی طرح جھول رہی تھیں اور اُن کے کوئی پاؤں نہیں تھے اور وہ آئینے کے لمس کی طرح ایک دوسرے سے ملی جا رہی تھیں۔ میں نے چلا کر کہا ''یہ کیا ہو رہا ہے تم الگ الگ رہو'' میں نے دونوں کو بازوؤں سے پکڑ کر الگ کرنا چاہا مگر میری انگلیاں ان کے جسموں میں دھنس گئیں جیسے وہ عکس ہی نہ ہو پانی کی لہریں ہوں اور پھر ایک ریلا سا آیا اور میں اُن کے ساتھ پانی میں بہہ گیا۔ ہم تینوں سمندر کے نیچے مچھلیوں کی طرح تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ہمیں ہمارے جسم واپس مل گئے تھے مگر اب مچھلیوں کی طرح لبوترے تھے اور بغیر کسی کاوش کے پانی کے اندر تیزی سے تیرتے جا رہے تھے۔

ہمارے آگے پیچھے پانی گدلا تھا پھر صاف ہوتا گیا پھر شفاف ہوتا گیا۔ پھر آسمان کی طرح نورانی ہوتا گیا اور یکایک محسوس ہوا جیسے سمندر نہیں ہے آسمان ہے مگر نہ یہاں چاند ہے، نہ سورج ہے، نہ تارے ہیں، ایک ابدی سحر سی ہے اور ہم تینوں فضا میں اڑے جا رہے ہیں اور ہمارا کوئی وزن نہ تھا، اور ہماری کوئی صدا نہ تھی۔

اور کوئی گہرائی ہمارے پاس موجود نہ تھی، صرف لمبائی، چوڑائی، تصویروں کی طرح ہم ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے، اڑتے اڑتے ایک شفق رنگ دھنک کے ہنڈولے میں جا بیٹھے پھر ایک دم چاروں طرف شرارے ہی شرارے اور شراروں میں تاریکی اور تاریکی میں خوشبو اور خوشبو میں لمبی لمبی سانسوں کی نرگسی ڈنڈیاں بدن کے ٹیلوں سے پھوٹتی ہوئی سہمی ہوئی لڑکیوں کی طرح سرگوشیاں کرتی ہوئیں۔ اب آنکھوں میں بصارت نہیں تھی صرف لمس کا احساس ہے اور لمس بھی اس قدر گڈمڈ کہ میں اپنی پلکوں کے سہارے چھو چھو کر محسوس کرنا چاہتا ہوں مگر یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ جین کا بدن کہاں سے شروع ہوتا ہے اور شکنتلا کا بدن کہاں پر ختم ہوتا ہے؟''



دوسرے دن کوئی ساڑھے گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تو کمرے کو بے حد صاف ستھرا پایا رات کی آرگی Orgy کا کوئی نام و نشان نہ تھا نہ گندے گلاس، نہ بوتلیں، نہ ٹرالی، نہ

پلیٹیں، ہر چیز منظم اور مرتب، جین نئے کپڑوں میں ملبوس ایک صوفے پر بیٹھی خط لکھ رہی تھی اور قریب میں دوسرے صوفے پر شکنتلا بیٹھی ایک سوئیٹر بن رہی تھی۔

مجھے جاگتے دیکھ کر جین نے پوچھا ''کیوں کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''کیوں رات کو کیا ہوا تھا؟'' میں نے جین سے پوچھا۔

وہ بولی ''تم برابر انکار کر رہے تھے اس لئے تمہاری ضد کو توڑنے کے لئے تمہیں تھوڑی سی پکنس کھلانی پڑی۔''

''کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا؟''

''نہیں، اتنی خوراک نہیں دی وہ تو میں لیتی ہوں تمہیں اس سے کم خوراک دی۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔'' شکنتلا بولی ''دھیرے دھیرے نشہ طلوع ہوتا ہے پھر بدن میں شرارے پھوٹنے لگتے ہیں بینائی کم ہونے لگتی ہے بدن کو چھونے کا احساس بڑھ جاتا ہے آخر میں مرد تشدد پر اتر آتا ہے۔''

شکنتلا نے اپنی ہلکی قرمزی رنگت کی شفاف ساڑھی کا پلو ہٹا کر مجھے اپنا بازو دکھایا جگہ جگہ کھرونچے پڑے تھے۔

پھر دوسرا بازو دکھایا بڑے بڑے نیلے دھبے مگر وہ مجھے کچھ اس فخر سے دکھا رہی تھی جیسے وہ کھرونچے نہ ہوں، جنگ میں جیتے ہوئے تمغے ہوں۔

''آئی ایم ساری، آئی ایم ساری۔'' دوبارہ میرے منہ سے نکلا پھر میں نے کہا ''تمہیں مجھے یہ دوا نہیں کھلانی چاہیے تھی۔''

جین بڑے طنطنے سے بولی ''پھر انکار کرو گے تو پھر کھلا دوں گی۔''

اس کی گردن پر ایک نیلگوں داغ تھا جس کی وہ نمائش کر رہی تھی حالانکہ وہ اونچے کالروں والا بلاؤز پہن کر اسے چھپا سکتی تھی۔

سہ پہر میں گاف کھیلتے ہوئے میری ملاقات ماجد سے ہوئی پورا نام عبدالماجد تھا نئی دلی میں رہتا تھا۔ موتی لال نہرو مارگ پر، اور فرید آباد میں اُس کی پلاسٹک کی ایک فیکٹری تھی اور فیروز آباد میں چوڑیاں بنانے کا ایک کارخانہ تھا اور کاشی پور میں ایک فارم تھا، خوش مزاج، دوست نواز آدمی معلوم ہوتا تھا بہت جلد وہ مجھ سے گھل مل گیا۔ کنور چھپال سنگھ نے

اُس کا تعارف مجھ سے کرایا تھا مجھے ماجد بہت پسند آیا کسرتی بدن کا آدمی تھا، جیسے سارے بدن میں سپرنگ لگے ہوں، کھلتا ہوا صاف رنگ، کھلی پیشانی چوڑے مضبوط جبڑے مگر چہرہ ہر وقت کھلا ہوا ہنستا ہوا۔

میں کنور چھپال سنگھ، ماجد باتیں کرتے جلد کلب پہنچ گئے اور ایک رنگین چھتری کے نیچے جا بیٹھے جہاں پانچ سات کرسیاں تھیں۔

بیرہ قریب آیا تو ماجد نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا بولا۔

''تھوڑی دیر بعد لیڈیز کا انتظار ہے۔''

کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، سامنے سے تین عورتیں بیل باٹم پہنے اور گاف کی چھتریاں ہاتھ میں لئے مغربی کونے سے نمودار ہوئیں۔

ماجد بولا۔ ''وہ جس نے ہرے رنگ کی مخملیں بیل باٹم پہن رکھی ہے اور سیمن رنگ بلاؤز، وہ صبیحہ ہے۔''

کنور چھپال سنگھ بولا ''اور وہ جو بلانڈ حسینہ ہے فلیکسن بال والی، وہ ہمارے دوست کی محبوبہ ہے مگر اُس کے ساتھ وہ انار کلی کون چل رہی ہے؟''

ماجد نے پوچھا ''وہ جس نے سرخ رنگ کا بیل باٹم پہن رکھا ہے اس کی بات کرتے ہو؟''

''ہاں۔'' کنور چھپال سنگھ بولا۔

میں نے کہا ''وہ جین کی دوست ہے کل ہی آئی ہے۔''

کنور چھپال سنگھ نے کہا ''یک نہ شد دو شد، آج میں نے ان دونوں کو تمہارے ساتھ لنچ کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بھئی حد ہوگئی کسی کو ایک نہیں ملتی کوئی دو دو سنبھالے پھرتا ہے۔''

ماجد ہنسنے لگا۔

کنور چھپال سنگھ بولا ''کیا بات ہے تم میں جو مجھ میں نہیں؟ ہیں'' اس نے اپنی نظریں مجھ پر گاڑ دیں۔

میں نے کہا ''مجھے کیا معلوم؟''

وہ بولا ''تم دو دن کے لئے سری نگر چلے جاؤ اور ان دونوں حسیناؤں سے میری ملاقات کراتے جاؤ سری نگر پیلس ہوٹل میں ٹھہرو، بھر کے خرچ کرو، سارا بل میرے ذمے، اوپر سے اس غیر حاضری کے تین ہزار دوں گا۔''

ماجد ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا بولا۔ ''لوگ حاضری کے پیسے دیتے ہیں تم غیر حاضری کے پیسے دو گے؟ ایسا سودا تو آج تک نہیں سنا۔''

میں نے کہا ''جہاں تک تعارف کا تعلق ہے وہ تو ابھی ہو جاتا ہے اور سری نگر جانے کے میں تم سے پیسے نہیں لوں گا کنور جی دو دن کے بعد جا ہی رہا ہوں۔''

کنور کا چہرہ کھل گیا زور سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''بھگوان تمہیں خوش رکھے اور سری نگر میں تمہاری ملاقات کسی بڑھیا حسینہ سے کرائے۔''

اچھا ہوا میں نے اسے نہیں بتایا کہ سری نگر تو جا رہا ہوں لیکن جین اور شکنتلا کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔

اب لیڈیز ہماری چھتری کے بہت قریب آ چکی تھیں ہم تینوں اٹھے تعارف ہوا۔ یہ جین ہے یہ شکنتلا، یہ صبیحہ، یہ کنور چھپال یہ ماجد یہ میں۔

لیڈیز نے کافی پینا مناسب سمجھا ہم تینوں نے ٹھنڈی پلسر آرڈر کی کیونکہ شدید پیاس لگ رہی تھی اور اسے اچھی بیئر ہی بجھا سکتی تھی مگر لیڈیز کافی پر جم رہیں میں نے دیکھا ہے عورتوں کو اکثر بیئر ناپسند ہوتی ہے، شاید موٹاپے کا ڈر ہوتا ہے۔

صبیحہ بہت جلد جین اور شکنتلا سے گھل مل گئی تھی، میں نے دیکھا وہ ایک لمبے قد کی، تیکھے خدوخال کی لچکتی کمر والی ہنس مکھ عورت تھی۔ عمر یہی کوئی پینتیس برس، ماجد اُس سے جوان معلوم ہوتا تھا شربتی آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک طنز آمیز ذہین مسکراہٹ، ذہین مسکراہٹ کہے دیتی تھی کہ اس تبسم کی مالک نے بہت دنیا دیکھی ہے اور صرف دیکھی ہی نہیں اسے سمجھا بھی ہے۔

کلب ہاؤس کسی انگریزی کنٹری ہاؤس کی طرح بنا ہوا ہے۔ دیودار کی چھال لکڑی کی دیواروں پر لگی تھی اور یہی چھال چھت پر بھی بجی تھی اس کھردری بھوری چھال نے اس کلب کو ایک عجیب دیہاتی مضبوط اور کھردرا حُسن عطا کیا تھا باہر بائیں کونے پر دیوار سے لگا

سرخ رنگ کا ایک پوسٹ بکس بھی تھا۔

اسے دیکھ کر جین کو یاد آیا کہ اسے ایک خط پوسٹ کرنا ہے جو وہ صبح کو لکھ رہی تھی۔

بیگ سے لیٹر نکالتے ہوئے بولی، ''آدھے منٹ کے لئے معافی دو میں ذرا یہ خط پوسٹ کر آؤں۔''

میں نے خط اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا ''میں پوسٹ کر آتا ہوں'' وہ بولی'' نہیں نہیں میں خود جاتی ہوں۔''

میری اور اس کی کشمکش میں لفافہ نیچے گھاس پر گر گیا میں نے اُٹھا کے جین کو دے دیا۔ جین اسے لے کر ڈولتی چال سے چلتی پوسٹ بکس کی طرف چلی گئی، چند لمحے جب تک وہ لفافہ گھاس پر رہا میں نے اس کا پتا پڑھ لیا تھا۔

''ہنری کاٹنر وائیلڈ۔''

۵۸ بہرام روڈ کولابہ بمبئی۔

یونہی پڑھ لیا کوئی خاص بات نہ تھی یونہی یہ پتا میرے ذہن کے کسی نامعلوم خانے میں محفوظ ہو گیا۔

بیر کا دوسرا دور شروع ہوا کیونکہ پہلا دور تو پیاس کی شدت سے چند منٹ میں ختم ہو گیا تھا۔

دوسرے دور کے درمیان میری نگاہ بار بار مد مقابل چھتری کے اندر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے لڑ جاتی تھی جو بار بار ہمیں گھور کر دیکھ رہا تھا اُس نے بند گلے کا اونی کوٹ پہن رکھا تھا اور اسی کالے بھورے کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی پتلون تھی اور شانوں کے گرد ایک سفید شال اوڑھے تھا۔

چہرے کے خدوخال بھی ایسے ڈھلمل، غیر یقینی سے تھے جیسے اُسے بناتے بناتے قدرت سوچ میں پڑ گئی ہو کہ اُس کے چہرے کو کیا بنائے؟

اُس کے دو کمتر حیثیت کے آدمی بھی تھے جو ہر بار جھک جھک کر اور ضرورت سے زیادہ سر ہلا کر اُس کی طرف خوشامدی انداز سے دیکھتے جا رہے تھے۔ میں نے اُن تینوں کو ہوٹل ڈرائنگ روم میں بھی دیکھا تھا۔ چھری کانٹے کی تمیز واجبی سی تھی۔

پھر ان دو کمتر حیثیت کے ملازموں میں سے ایک اُٹھ کر ہمارے پاس آیا اور بولا۔

''آپ میں سے بمبئی کا آرکی ٹیکٹ کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو ایک منٹ کے لئے اگر تکلیف نہ ہو، تو ہمارے وزیر صاحب سے مل لیجئے آپ کو بلاتے ہیں۔''

''وزیر صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں وہ سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے ہیں، وہ ہماچل کے وزیر صاحب ہیں جنگلات کا محکمہ اُن کے پاس ہے وزیر سدھی رام آپ کو بلاتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ان کو اگر مجھ سے ملنا ہے تو یہاں آ جائیں۔''

''مگر؟''

''اگر مگر کچھ نہیں اُن کو جا کے بول دو۔''

وہ کچھ حیرت زدہ کچھ مایوس ہو کر چلا گیا اور جا کے اُس نے وزیر صاحب سے کچھ کہا مگر وزیر صاحب خفا ہونے کے بجائے خوشدلی سے مسکرا دیئے جیسے اس دعوت کی تاک میں تھے جلدی سے شال پہنتے ہوئے اُٹھے ہماری چھتری کے نیچے آن دھمکے۔ میں نے ایک خالی کرسی اُن کے لئے کھسکا دی۔ سب سے تعارف کرایا پھر پوچھا ''بولیے کیا حکم ہے؟''

''ایسا ہے۔'' وزیر سدھی رام کچھ گڑبڑاتے ہوئے بولے ''ہم لوگ بمبئی میں ایک ہماچل ہاؤس بنوانا چاہتے ہیں ہوٹل کے منیجر سے یونہی باتوں باتوں میں آپ کا ذکر آیا اُس نے کہا بمبئی کا ایک مشہور آرکی ٹیکٹ ہمارے ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ ڈرائینگ روم میں اُس نے مجھے آپ کو دور سے دکھا بھی دیا تھا مگر پریچے آج ہی ہوا۔ میں اس سمبندھ میں آپ کی سہائتا چاہتا ہوں آپ شملے کبھی گئے ہیں؟''

''نہیں'' میں نے جواب دیا۔

''اور آپ کی بیوی؟'' اُس نے جین کی طرف اشارہ کیا۔

''کبھی نہیں۔'' میں نے جین کی طرف سے جواب دیا۔

''اور آپ کی......؟'' اُس نے شکنتلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میری سالی'' میں نے ذرا سا سر جھکا کر کہا ''میری سالی بھی شملے کبھی نہیں گئی ہے۔''

''تو آپ تینوں شملے آیئے میں دعوت دیتا ہوں آپ سرکاری مہمان ہوں گے اور میں ہماچل ہاؤس کا پراجیکٹ آپ سے ڈس کس کرلوں گا دس لاکھ کا پراجیکٹ ہے۔'' وہ میری طرف سرسری نگاہ ڈال کے جین اور شکنتلا کو گھورنے لگا ''ممکن ہے پندرہ لاکھ تک پہنچ جائے آپ لوگ آیئے ناں''

عجیب پتلا دبلا چہرہ تھا اُس کا کبھی تو عقاب نما معلوم ہوتا تھا اور کبھی کوے کی طرح دکھائی دیتا عجیب بھوکی لالچی نگاہیں تھیں اُس کی وہ بار بار عورتوں کے چہرے پر آ کر اس طرح جم جاتیں جیسے ان میں گوند لگا ہو۔

صبیحہ جو میرے قریب بیٹھی تھی مجھ سے سرگوشی میں کہنے لگی۔ ''موئے کی عجیب سی نگاہیں ہیں میرا تو منہ گندا ہو گیا منہ دھونے کو جی چاہتا ہے۔''

وزیر سدھی رام نے جین کو میری بیوی سمجھ کر اُس سے توجہ ہٹالی تھی اور اپنی پوری توجہ شکنتلا پر مرکوز کر دی تھی۔ میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا ''وزیر صاحب آپ شاید مس صبیحہ سے نہیں ملے؟''

''مس......؟'' وزیر سدھی رام چوکنا ہو کر بولے ''آپ نے تو شاید بتایا تھا یہ (ماجد کی طرف اشارہ کر کے) اُن کی بیوی ہیں۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی'' میں نے ماجد کو ایک کونے سے آنکھ مار کر کہا۔

''ان کی تو شادی نہیں ہوئی یہ تو مس صبیحہ ہیں ابھی تک آزاد زندگی پسند کرتی ہیں، شادی کرنا بھی نہیں چاہتیں، ہندی اور اُردو میں کہانیاں لکھتی ہیں۔''

''کہانیاں لکھتی ہیں؟'' وزیر صاحب نے تعریفی نگاہوں سے صبیحہ کی طرف دیکھ کر پوچھا پھر ذرا ناک سکوڑ کے گردن کو ایک طرف خم دے کے شرمیلے لہجے میں بولے ''وزیر بننے سے پہلے میں بھی شاعری کرتا تھا۔''

''شاعری......؟'' صبیحہ تالی بجا کر بولی ''تو اپنے شعر سنایئے ہم ضرور وزیر جی آپ سے آپ کے شعر سنیں گے کیوں شکنتلا؟''

''ہاں ہاں۔'' شکنتلا کو بھی مزہ آنے لگا اُس نے بھی اپنی کرسی وزیر صاحب کے قریب

کھسکالی اوران کی کرسی کی ہتھی پر اپنا خوبصورت ہاتھ رکھ کر بڑی پیار بھری سرگوشی میں بولی۔

''سنایئے ناں۔''

جین بولی''انگریزی میں کہتے ہیں آپ؟''

''جی نہیں۔'' وزیر سدھی رام بولے''پہاڑی میں کہتا ہوں۔''

''پہاڑی تو بڑی میٹھی زبان ہے۔'' ماجد نے لقمہ دیا۔''ضرور آپ کے شعر خوبصورت ہوں گے۔''

''شعر نہیں ہوتے جی ہماری پہاڑی زبان میں۔'' وزیر صاحب نے اطلاع بہم پہنچائی''گیت ہوتے ہیں گیت۔''

''واہ واہ۔'' شکنتلا اور صبیحہ دونوں نے تالی بجائی''گیت ہم ضرور سنیں گے اور گا کر سنیں گے۔''

وزیر بالکل ریشہ خطمی ہو گئے''بہت دنوں سے گایا نہیں ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟'' صبیحہ بولی''آپ کی میٹھی آواز سے لگتا ہے قدرت نے جو گلوکاری آپکو بخشی ہے وہ ابھی تک باقی ہے۔''

''مگر ایک شرط پر گاؤں گا۔'' وزیر صاحب نے بخ لگائی۔

''وہ کیا......؟'' شکنتلا اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''آپ تینوں، آپ اور آپ اور آپ، آپ تینوں آج شب میرے ساتھ کھانا کھائیں۔''

وزیر سدھی رام نے ہم تینوں مردوں کو کاٹ دیا۔

جین بولی۔''کیا میں اپنے شوہر کو ساتھ نہیں لا سکتی؟''

وزیر سدھی رام نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا جیسے کوئی پُر نخوت آدمی سڑک پر جاتے ہوئے کسی کتے کے پلے کو دیکھتا ہے۔ میرے سارے جسم میں خارش ہونے لگی۔

''اچھا۔'' وزیر سدھی رام نے مجبوری سے کہا''ان کو بھی لے آیئے۔''

ماجد اور کنور مسرور تھے اور وزیر صاحب کے پینترے دیکھ رہے تھے۔ وزیر سدھی رام بولے''گا کر سناتا ہوں۔''

پھر کھانس کر گلا صاف کیا اور پھٹے ڈھول کی آواز میں گانے لگے۔

پل پل بھئی جانا

پل پل بھئی جانا۔ایک پل کے لئے بیٹھ جاؤ

چن چڑھیا...... چاند نکل آیا۔

اوئے چن چڑھیا　　اوہو چاند نکل آیا۔

بیٹیاں دے اوھلے

بیٹیاں دے اوھلے　　ٹیلوں کی اوٹ سے

چن چڑھیا میرا چاند اُبھر آیا۔

پل پل بھئی جانا

پل پل بھئی جانا　　پل بھر کے لئے بیٹھ جاؤ۔

یہ ایک پرانا لوک گیت تھا جسے وزیر سدھی رام اپنا کہہ کر سنا رہے تھے مگر جب سارا ملک ہی اپنا ہے تو ایک لوک گیت پر قبضہ کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

وزیر صاحب اب شکنتلا کی طرف نگاہیں جمائے گا رہے تھے۔

پل پل بھئی جانا

پل پل بھئی جانا

وزیر صاحب کچھ شرارت آمیز کچھ معذرت آمیز نگاہوں سے ہچکچاتے ہوئے لہجے میں بولے "مطلب یہ ہے کہ شکنتلا جی کہ ایک ایک پل کے لئے ڈھئی جاؤ، یعنی گر جاؤ یعنی میری بانہوں میں ہی ہی ہی۔!

وزیر سدھی رام صبیحہ سے بولے "آپ ہمارے پرانت کا دورہ کیجئے۔آپ ہماری سرکاری مہمان ہوں گی۔مجھے کلچر کا بہت شوق ہے کلچر کا محکمہ بھی میرے پاس ہے۔"

جین بولی "اور مجھے پہاڑی لوگ گیت جمع کرنے کا بہت شوق ہے میرے شوہر تین مہینے کے لئے لندن جا رہے ہیں اپنے کسی کام سے۔فن تعمیر کے سلسلے میں مزید ٹریننگ کے لئے کیا میں بھی آسکتی ہوں؟"

"ضرور۔ضرور۔" وزیر سدھی رام ایک دم خوش ہو گئے صبیحہ مس تھی آزادانہ زندگی بسر کرتی تھی۔جین کو لوک گیت اکٹھے کرنے کا شوق تھا۔شکنتلا کیسی میٹھی نگاہوں سے اُس کی

طرف دیکھ رہی تھی معاملہ پٹ گیا تھا اس کے پہاڑی گیت نے بازی مار لی تھی۔

"ایک گیت اور سناؤں؟"

"یا خدا یہ آدمی ابھی ہمیں اور بور کرے گا۔" ماجد نے میرے کان میں کہا پھر بولا میں کلب کے اندر جاتا ہوں عاجز آ گیا۔"

"مگر لیڈیز تو خوش ہیں۔"

"خوش ہیں کہ ایک آدمی مل گیا احمق بنانے کے لئے۔"

ماجد نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی آیا۔"

کنور چھپال سنگھ نے جماہی لے کر کہا۔ "معاف کیجئے میری ایک اپوائنٹ منٹ ہے۔"

جین، وزیر صاحب کی طرف دیکھ کر بولی "آپ یہ پگڑی کیوں پہنتے ہیں آپ ہیٹ پہنا کیجئے، بہت سجے گی آپ پر، چلیے میرے ساتھ اُٹھیے وزیر صاحب میں آپ کو ایک عمدہ ہیٹ خرید کر دیتی ہوں۔"

جین نے وزیر کی پگڑی اتار لی شکنتلا نے اُس کی شال لی صبیحہ نے اُس کا چھاتا۔

وزیر کچھ ہڑبڑا سا گیا جین نے اُس کا اطمینان قائم کرنے کی خاطر اُس سے پوچھا۔

"وزیر صاحب آپ نے زندگی کیسے شروع کی؟"

وزیر سدھی رام بولے "میں ایک سیلف میڈ آدمی ہوں۔"

اور صبیحہ ان کی گنجی چاند دیکھ کر بولی "میں یقین کر سکتی ہوں کیونکہ آپ کے سر پر ایک سیلف میڈ گاف کورس بھی موجود ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" وزیر سدھی رام جھینپ کر ہنسنے لگے۔

مگر شکنتلا نے اپنی آنکھوں میں خمار اور مستی لا کر غنودگی آمیز لہجے میں کہا۔

"مگر مجھے گنجی چاند والے ادھیڑ عمر کے آدمی بہت پسند ہیں بڑے پیارے ہوتے ہیں گڈو سے جی چاہتا ہے ان کی چاند تھپتھپا کر اُنہیں سلا دیا جائے۔" شکنتلا نے بڑے پیار سے سدھی رام کی چاند تھپتھپائی۔

"ہے ہے ہے۔" سدھی رام کے منہ سے خوشی کے بلبلے نکلنے لگے اس کے احساس ساتویں آسمان پر تھے۔

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا ''میں ذرا باتھ روم تک جاتا ہوں۔'' میں نے کلب کے اندر اشارہ کیا۔

جین بولی ''جب تک ہم وزیر صاحب کو ایک ہیٹ خرید کرآتے ہیں ہیٹ میں یہ کتنے شاندار معلوم ہوں گے میں شرط لگاتی ہوں۔''

''چلو، چلو۔'' وزیر صاحب اٹھتے ہوئے بولے ''ایک ہیٹ خریدیں گے۔''

تینوں عورتیں وزیر صاحب کے ساتھ چلنے لگیں۔ جین نے میری طرف ہاتھ ہلا کے کہا۔

''اب ہوٹل میں ملیں گے، بائی بائی۔''

''بائی بائی۔''

بڑی مشکل سے میں اپنی ہنسی روک کر کلب میں داخل ہوا باتھ روم کی طرف جارہا تھا کاریڈور کے ایک کونے میں ٹیلی فون رکھا تھا ٹیلی فون کرنے والے کی آواز سن کر میں ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔

ایک کونے میں ماجد میری طرف پیٹھ کئے ہوئے ٹیلیفون پر کہہ رہا تھا۔

''ایڈریس نوٹ کرلو۔''

ہنری کاٹز وائیلڈ۔

''۵۸ بہرام جی روڈ کولابہ بمبئی۔''

چند لمحوں کے لئے میں سکتے میں رہ گیا۔ پھر بے آواز قدموں سے واپس لوٹ گیا ماجد نے مجھے نہ آتے ہوئے دیکھا نہ جاتے ہوئے۔

☆☆☆

بہت دیر تک سمجھ میں نہ آیا کہ جین کے ہاتھ سے جو لفافہ گھاس پر گرا تھا اس پر لکھے ہوئے پتے کا عبدالماجد سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ اور ماجد کس کو ٹیلیفون پر یہ پتا بتا رہا تھا اور کیوں جین نے مجھ سے اس پتے کے چھپانے پر اصرار کیا تھا اور خود اس لفافے کو پوسٹ بکس میں ڈالنے پر بضد ہوگئی تھی اس پتے کی کیا اہمیت تھی، اور یہ ہنری کاٹز وائیلڈ کون تھا اور عبدالماجد دراصل کون تھا ایک کھاتا پیتا امیر گھر کا دیسی سیاح جو گلمرگ سیر کرنے کے لئے آیا تھا کسی خطرناک گروہ سے تعلق رکھنے والا فرد جو یہاں کسی خاص کام سے آیا تھا مگر وہ کام کیا تھا؟

دل میں ہزاروں سوال ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے، جن کا جواب میرے پاس کوئی نہیں تھا۔

پہلے سوچا جین کو سب کچھ بتا دوں لیکن لفافے کے پتے نے خود جین کے لئے میرے دل میں سینکڑوں شبہات ڈال دیئے۔ یہ چکر کیا ہے، اور شکنتلا کون تھی کیا ایک سیدھی سادی ماڈل لڑکی دل کو طرح طرح کے وسوسے ستانے لگے۔ یہی مناسب سمجھا کہ آنے والے واقعات پر گہری نظر رکھی جائے اور مجھ سے قریب آنے والے افرد کو غور سے پرکھا جائے۔

مگر جین کا چسکا کچھ ایسا پڑ گیا تھا کہ میں آسانی سے اُس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ لڑکی واقعی مجھ سے لگاؤ رکھنے لگی ہے اُس کی باتوں سے سچائی اور اخلاص کی بو آتی تھی، اور اُس کی سپردگی میں کسی قسم کا تصنع نہیں تھا۔

تصنع تو شکنتلا میں بھی نہیں تھا مگر اُس کی شخصیت مجروح نظر آتی ہے ایسی شخصیت جس کی روح میں ہزاروں گھاؤ ہیں جو کئی بار اپنی مرضی کے خلاف اپنے آپ کو دوسرے مردوں کے حوالے کر چکی ہے۔ میرے ساتھ اُس کی سپردگی میں گہرے گداز کے ساتھ ایک عجیب قسم کا حزن و ملال شامل تھا مگر اس میں کوئی مجبوری نہ تھی۔ کسی قسم کا تصنع کا شائبہ تک نہ تھا اُس کی سپردگی غیر مشروط تھی، اور اس وقت ایسا لگتا تھا کہ اس بے محابا سپردگی کے عالم میں اس کی روح کے ہر گھاؤ میں ایک گلاب بھی کھل رہا ہے میں خود اس تثلیث پر حیران تھا وہ شب و روز بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر میرا پلڑا جین کی طرف زیادہ جھکتا تھا تو خود شکنتلا کا رجحان جین کی طرف زیادہ تھا اس تثلیث کا مرکزی کردار جین معلوم ہوتی تھی۔ مگر جتنا میں اس کے قریب جا رہا تھا اتنا ہی اس کی شخصیت پُراسرار ہوتی جا رہی تھی لوگ کہتے ہیں کہ سیکس کی قربت پیچیدہ سے پیچیدہ شخصیتوں کی گتھیوں کو حل کرنے میں مدد دیتی ہے مگر ایسا نہیں ہے ماڈرن لڑکیاں پرانے زمانے کی لڑکیوں سے زیادہ پیچیدہ اور پُراسرار ہیں اُن کے دل چین کو ڈھونڈنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی بے آب و گیاہ دشت میں کسی کنوئیں کو دریافت کرنا۔

میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر ڈال دیا اور فیصلہ کر لیا کہ فی الحال میں جین سے کچھ نہ کہوں گا۔ خاموش رہ کر حالات کو کھلتے ہوئے دیکھوں گا۔ اگلے دو دن میں صبیحہ، شکنتلا اور جین کے بہت قریب آ گئی میری اور ماجد اور کنور چھپال کی گاف کورس پر

اب گھٹنے لگی تھی۔ سری نگر آنے سے پہلے وزیر سدھی رام نے ایک کاک ڈنر دیا تھا میں اس
میں نہیں جا سکا تھا کیونکہ مجھے بمبئی بہت سے اسکیچ بھجوانے تھے اور ادھر میں نے اپنی روزی
کے کام سے کافی بے اعتنائی برت لی تھی۔

اب ہم ایک پرائیویٹ ٹیکسی لے کر سری نگر جا رہے تھے ایک کار میں صبیحہ، ماجد اور
کنور چھپال سنگھ ان لوگوں نے بھی ہمارے ساتھ سری نگر جانے کا پروگرام بنالیا تھا ایک
سرکاری کار میں وزیر سدھی رام بھی سری نگر جا رہے تھے تیسری کار میں ہم تینوں تھے یعنی
میں، جین اور شکنتلا۔

پہلے تو مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں جین اور شکنتلا کل رات کی پارٹی کا ذکر کرتی
رہیں باری باری وزیر سدھی رام اور کنور چھپال سنگھ دونوں نے ان دونوں لڑکیوں کو پھانسنے
کی ساری ترکیبیں کر ڈالی تھیں۔

کنور چھپال سنگھ کا ٹرمپ کارڈ اُس کا بٹوہ تھا تو سدھی رام باری باری سب لڑکیوں
کو شملہ آنے کی دعوت دے رہے تھے اور سرکاری سطح پر مہمان بنانے کا لالچ دے رہے تھے
اور سارا اماچل مفت گھمانے کی ترغیب دے رہے تھے شملہ نارکنڈہ منالی، ککلو منڈی، چمبہ
اور نہ جانے کہاں کہاں لے جانے کا وعدہ کر رہے تھے۔

شکنتلا بولی ''وزیر سدھی رام بے وقوف نہیں ہے ایک بار مجھے اکیلا پا کر چومنے کی
اس نے کوشش کی۔''

جین بولی ''میں نے تو شملہ آنے کا وعدہ کرلیا ہے کس کرنے کی تو اُس نے بھی کوشش
کی تھی اور کنور چھپال سنگھ نے بھی مگر میں نے دونوں کے وار خالی کر دیئے مگر میں زیادہ تر
سدھی رام پر مہربان رہی کیا معلوم کبھی شملہ جانا ہی پڑ جائے اور کبھی اُس کی مدد لینا پڑ جائے
کچھ کہا نہیں جا سکتا تاش کے جوکر کی طرح کبھی سدھی رام بھی بے حد کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

شکنتلا بولی ''مگر ہے بڑا بے وقوف تم نے اُسے وہ کاؤ بوائے ہیٹ پہنوا کر گھوڑے
پر دوڑا کر کیا الو بنایا۔ اس سامبرے رو (Sombercro) میں وہ کیسا چغد معلوم ہوتا تھا۔''

جین بولی ''نہیں وہ بالکل چغد نہیں ہے بے حد کائیاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ
لڑکیوں کے سامنے جان بوجھ کر بے وقوف بن جاتا ہے تا کہ لڑکیاں اُس کے قریب آجائیں

اور وہ ان سے لبرٹی لے سکے ورنہ اس ادھیڑ عمر کے چوہے چہرے جیسے آدمی کو کون پوچھے گا۔"

"اور وہ جو دوسرا بھالو ہے" شکنتلا بولی۔

"کون، کنور چھپال۔" جین نے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" شکنتلا نے بیزار لہجے میں کہا "بات بات پر نوٹ نکالتا ہے اس کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر عورت کال گرل ہے پیسہ یقیناً ضروری چیز ہے مگر عورت شاید کچھ اور بھی چاہتی ہے مگر اِس کا اُس بھالو کو کچھ پتا نہیں وہ کبھی کسی کال گرل کے سوا کسی دوسری عورت پر فتح یاب نہ ہو سکے گا۔"

جین بولی "یہ جوڑا اچھا ہے جو کار میں ہمارے آگے جا رہا ہے میرا مطلب صبیحہ اور ماجد سے ہے دونوں بہت ہی سمجھدار اور مہذب معلوم ہوتے ہیں۔"

"صبیحہ تو بڑی محبت کرنے والی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی۔" شکنتلا بولی "کہ گلمرگ آپ لوگوں کے بغیر سونا سونا معلوم ہوگا، اس لئے ہم نے بھی آپ ہی کے ساتھ جانے کا پروگرام بنالیا ہے اور پیلس ہوٹل میں بکنگ کرلی ہے۔"

"جین، شکن۔" میں نے دونوں لڑکیوں سے بے اختیار کہا "مجھے دونوں سے کچھ کہنا ہے۔"

جین اور شکن دونوں نے میری طرف بھنوئیں تان کر سوالیہ لہجے میں دیکھا۔ جین کو کچھ اس بات پر بھی تعجب تھا کہ میں شکنتلا کو پہلی بار شکن کہہ کر پکار رہا تھا یعنی اس نام سے جس نام سے جین اُس کو پیار کے عالم میں پکارتی تھی۔

"بات دراصل میں یہ ہے۔" میں نے جین سے کہا "کہ میں نے اس لفافے پر لکھا ہوا ایڈریس پڑھ لیا تھا جسے تم نے دو دن پہلے کلب میں پوسٹ کیا تھا مگر اس میں کوئی خاص بات نہ تھی خاص بات یہ ہے کہ جب تم لوگ وزیر سدھی رام کو ہیٹ خریدوانے گئیں اور میں کلب کے اندر باتھ روم جانے کے لئے گیا تو میں نے عبدالماجد کو ٹیلیفون پر وہی ایڈریس دہراتے ہوئے سنا۔

جین چیخ کر بولی۔ "ہنری کانز وائیلڈ؟"

"ہاں۔" میں نے کہا "۵۸ بہرام جی روڈ کولابہ بمبئی۔"

جین عرصے تک چپ رہی۔

میں نے پوچھا۔ "تم بتا سکتی ہو کیا راز ہے؟"

"اچھا ہوا تم نے مجھے بتا دیا۔" جین دھیرے سے بولی "ورنہ ہم سب لٹ جاتے" ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتی" جین فیصلہ کن لہجے میں بولی "مگر اب ہمارا آگے کا پروگرام بالکل بدل جائے گا۔"

"کیوں؟" جین نے پوچھا۔

"ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھو۔"

جین چپ ہو گئی مگر اگلے چار پانچ منٹ میں اس نے تین چار سگریٹ پھونک ڈالے۔

"مجھے سری نگر پہنچتے ہی ہنری کو ٹرنک کال کرنا پڑے گا اگر تم مجھے گلمرگ ہی میں یہ بات بتا دیتے تو اتنی دیر نہ ہوتی۔"

"کاہے کی دیر؟"

جین چپ رہی۔

"اور یہ ہنری کون ہے؟"

"پلیز" جین مجھ سے بولی "ابھی کچھ مت پوچھو اور سنو شکن۔" وہ شکنتلا کی طرف مخاطب ہو کر "ہمارا رویہ ماجد اور صبیحہ سے بالکل وہی رہے گا جو اب تک تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی محبت جتانی پڑے گی مگر اگلے پروگرام کا کسی کو کچھ پتا نہ چلے اب ہم پیلس ہوٹل سے ایک دن پہلے ہی رخصت ہو جائیں گے اور اس طریقے سے کہ کسی کچھ پتا نہ چلے"

شکنتلا نے غور سے جین کی طرف دیکھ کر کہا "اور اب ہمیں وہ جگہ بھی بدلنی پڑے گی اور ان لوگوں کو اطلاع بھی دینی پڑے گی کہ اب کسی نئی جگہ پر ملنا ہے۔"

جین نے کہا "اس کا بندوبست میں سری نگر پہنچ کر کروں گی۔"

کچھ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری خبر نے اُنہیں تشویش میں ڈال دیا تھا۔ جین اور شکنتلا راستے بھر زیادہ خاموش رہیں میں نے گفتگو کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ ہوں ہاں کہہ کر چپ ہو جاتیں خاموشی کے بڑے بڑے لمبے وقفے آئے پھر وہی بے سری باتیں پھر وہی خاموشی پھر میں نے ہار مان لی اور کار کے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے سفیدے کے پیڑ

گننے لگا ایک، دو، تین، چار یوں زندگی میں عورتیں تو بہت آتی تھیں مگر سفیدے کے اِن پیڑوں کی طرح ٹھہری کوئی بھی نہیں شاید جین ٹھہرے۔"

میں نے جین کی طرف دیکھا۔

جین اپنے بالوں کو گردن کی پشت پر گھما کر اُن کا جوڑا باندھ رہی تھی اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ جب کبھی ایسا کرتی ہے تو کوئی اہم فیصلہ کرتی ہے۔

شکنتلا نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی ہرے جیڈ کی ننھی سی ڈبیا اسے کھولا اب میں نے سفوف پہچان لیا پکنس کا سفوف تھا وہ اس کی چٹکی بھرنے والی تھی کہ جین نے اُسے روک دیا۔

بولی "نہیں شکن ابھی سری نگر پہنچ کر بہت کام کرنے ہیں تم چٹکی بھر کر غین ہو جاؤ گی تو کام کیسے ہوں گے پلیز، شکن رات کو سوتے وقت ابھی نہیں۔"

شکنتلا نے ایک آہ بھر کر ہرے جیڈ کی ڈبیہ بند کر دی۔

☆☆☆

سری نگر پہنچ کر ہم لوگوں نے پیلس ہوٹل کی راہ لی، وزیر سدھی رام کا سوئٹ سرکٹ ہاؤس میں بک تھا۔

پیلس ہوٹل میں جین اور شکنتلا نے ایک کمرہ لیا تھا میں نے الگ۔ ماجد اور صنیہ کا کمرہ ہمارے ونگ ہی میں تھا۔ کنور چھپال سنگھ کو کوشش کے باوجود ہمارے قریب کمرہ نہ مل سکا۔ اس کا اسے افسوس تھا مگر اُسے اس بات کی تسلی تھی کہ جین اور شکنتلا اسی ہوٹل میں تھیں دنیا امید پر قائم ہے۔

"مگر اب پروگرام کیا ہے؟" سب جھنجھٹوں سے فارغ ہو کر میں نے جین سے پوچھا

جین بولی "وزیر سدھی رام نے مجھے فون کیا تھا ہم اس کے یہاں لنچ پر جارہے ہیں"

"آپ دونوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اور ہم بیچ میں سے کٹ؟"

"بالکل کٹ؟"

''وجہ؟''

''وجہ بچکانہ ہے مگر ہمیں سوٹ کرتی ہے۔''

''کیسے؟''

''مجھے بمبئی فون کرنا ہے وہ فون میں سرکٹ ہاؤس سے کرسکوں گی یہاں سے نہیں۔''

''یہاں سے کیوں نہیں؟''

''اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو ہوٹل میں ہمارے کمروں کے ٹیلیفون کی ہر گفتگو ٹیپ ہوتی جائے گی یا کوئی دوسرا اسے سن سکے گا اس لئے میں یہاں سے بمبئی ٹیلیفون نہیں کرسکتی اور اسی لئے ہم نے وزیر صاحب کا لنچ منظور کرلیا ہے۔''

''آل رائٹ۔''

''مگر اب تم بھی بنک جا کر معلوم کرلو تمہارا روپیہ تمہارے اکاؤنٹ میں آچکا ہے کہ نہیں۔''

''اگر آچکا ہوگا تو پھر؟''

''تو پھر اسے نکلواتے لاؤ۔''

''پھر؟''

''پھر اس کے بعد کا پروگرام طے ہوگا۔''

☆☆☆

اگلا دن سنیچر کا تھا میں نے بینک سے جا کر معلوم کیا روپیہ بمبئی سے ٹرانسفر ہو کے آچکا تھا۔ میں نے بیس ہزار روپے اُٹھا کے جین کو دے دیئے۔ جین نے ہوٹل کے لاکر میں رکھوا دیئے۔

سنیچر کے دن لیڈیز نے خریداری کی ٹھانی۔ لیڈیز کی خریداری میں مَیں ہمیشہ بور ہوتا ہوں۔ اس لیے میں نے جین شکنتلا اور صبیحہ کے ساتھ وزیر سدھی رام کو لگا دیا اور میں اپنی بلڈنگوں کے خاکوں میں لگ گیا۔ ماجد کو اپنے کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔ کنور جی کچھ دیر تو کسمسائے پھر بولے ''میں بھی سنٹرل مارکیٹ میں جاتا ہوں۔ لیڈیز کے ساتھ خریداری کروں گا، وقت کٹ جائے گا!۔''

اتوار کا دن شالیمار اور نشاط کے باغوں میں کٹ گیا۔ بہت دھوم دھام تھی۔ بہت بھیڑ بھاڑ تھی۔ عورتیں بہترین ملبوس اور زیورات سے آراستہ، مرد یا تو بچے یا ٹفن کیریر اُٹھائے ہوئے تھے۔ فوارے چل رہے تھے۔ کیمرے کے بٹن کلک کئے جا رہے تھے۔ بدصورت عورتیں خوب صورت گلابوں کے پس منظر میں اپنی تصویریں کھنچوا رہی تھیں!

جین نے سوموار کے پروگرام کا اعلان کیا۔ کل صبح سب لوگ ہارون جھیل چلیں گے۔ وہاں سے ڈاچی گام۔ لنچ ڈاچی گام پر ہوگا۔ شام کو واپسی ہوگی۔"

مگر اتوار کی رات کو جین کے کہنے کے مطابق میں نے اور شکنتلا نے اور جین نے جلدی اپنے دوستوں سے پیچھا چھڑا لیا اور اپنے اپنے کمروں میں بند ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد میرے کمرے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ جین کھڑی تھی۔

بولی "تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں یوس مرگ چلیں گے۔"

"اس وقت؟ رات کے وقت؟"

"ہاں۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ چاندنی رات ہے۔ دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ میں نے ایک پرائیویٹ ٹیکسی آرڈر کی ہے۔"

"ارادہ کیا ہے؟"

جین بولی۔ "آنکھیں بند کر کے چلتے چلو۔ زیادہ باتیں مت کرو۔"

آدھے گھنٹے میں ہم لوگ یوس مرگ جانے والی سڑک پر تھے۔ میں جین اور شکنتلا۔ میں نے جین سے کہا۔

"اور ہمارے ان عزیز دوستوں کا کیا ہوگا جن کے ساتھ ہم نے کل دن بھر ڈاچی گام میں پکنک منانے کا فیصلہ کیا تھا؟"

"جین نے کہا۔ "اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو صبح ہم ماجد اور صبیحہ کو یوس مرگ پر پائیں گے۔"

"مگر ان کو ہمارا پروگرام تو معلوم نہیں۔"

"پروگرام معلوم کرنے کے دس طریقے ہیں۔ ہوٹل کے بیرے۔ ریسپشن کے کلرک۔ باہر کھڑا ہوا باوردی چوبدار جو ٹیکسی بلاتا ہے دوسرے ٹیکسی والے جو لائن میں کھڑے رہتے ہیں خود ماجد کی طرف سے ٹوہ لینے والا کوئی خفیہ جاسوس یا پولیس والا۔ہ

حالانکہ میں نے بہت احتیاط کی ہے مگر دو ایک سراغ جان بوجھ کر ایسے چھوڑ دیئے ہیں جن کا سہارا لے کر ماجد صبح تک یہاں پہنچ سکتا ہے۔"

"مگر ماجد سے ہمیں کیا ڈر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ماجد یہاں آگیا تو اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس سے بچنا پڑے گا۔"

جین نے یوس مرگ میں ایک کاٹج پہلے بک کروا رکھا تھا۔ ٹیکسی والے سے کہہ رکھا تھا کہ ہم لوگ دوسرے دن سہ پہر کو یوس مرگ سے روانہ ہوں گے۔ اسے خاصا ایڈوانس بھی دے دیا گیا تھا۔ وہ کافی خوش نظر آتا تھا۔

کھانا ہمارے لیے پہلے سے تیار تھا کھانا کھانے کے بعد مجلس مشاورت طے پائی۔

جین نے کہا۔ "آج رات بھر کوئی سوئے گا نہیں۔ دو گھنٹے کے لیے کمر سیدھی کر سکتے ہیں۔ بس......"

"کیوں؟ میں نے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتادوں گی۔"

میں چپ ہو گیا۔

رات میں دیر تک چاندنی کھلتی رہی۔ یوس مرگ ایک طرح کا چھوٹا سا گلمرگ ہے۔ وہی مخملیں گھاس کے ٹیلے اور دوب کے میدان اور چاروں طرف پائن اور دیودار کے جنگل۔ بہت قریب میں پاکستان کی چوکی بھی ہے۔ راستے میں خوب صورت گاؤں آتے ہیں اور میلوں تک پھیلے ہوئے ہوشربا جنگل اور خوشبو بھری خنک چاندنی۔ سیال چاندنی یوس مرگ کے نالے میں بہتی ہوئی۔ ہری دوب کے تلوں کے گرد چاندی کی کوٹ لگاتی ہوئی پائل کی طرح کھنکتی ہوئی۔ کہیں کہیں رک رک کر چاندی کے بھنور بناتی ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے جین نے ندی میں اتر کر اپنے بال کھول دیئے ہیں جو کھلتے کھلتے جنگل کی کمر تک جا پہنچے ہیں۔ رات کا رس پھولوں میں اترتا ہے۔ سناٹے کی سانسیں گرم ہوتی جاتی ہیں اور چاندنی کا بدن آنکھوں میں لہراتا ہے۔ پھر کوئی دروازے پر دستک دیتا ہے۔

جین دہلیز پر کھڑی ہے رات کے ساڑھے چار بجے ہیں۔

"وہ لوگ آگئے۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔"

''ماجد اور صبیحہ؟''

''ہاں۔''

وہ میرے کمرے کے اندر آ گئی۔ بولی۔

''انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ آدھے گھنٹے کے بعد جب چاند جنگل میں ڈھل جائے گا ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔''

''تو پھر ہم یہاں آئے کیوں تھے؟'' میں نے جین سے پوچھا۔

دو وجہ سے ایک تو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ماجد یہاں تک ہمارا پیچھا کرتا ہے کہ نہیں۔ دوسرے اگر وہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے تو اسے ڈاج دینے کے لیے ابھی یہاں سے رخصت ہونا پڑے گا اور پرائیویٹ ٹیکسی کو یہیں کھڑا رکھنا ہوگا۔''

''کیوں؟''

''صبح تک کافی دیر تک۔ جب تک ٹیکسی یہاں کھڑی رہتی ہے، ماجد یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ کاٹج میں آرام کر رہے ہیں۔ جب اسے ہماری غیر موجودگی کا علم ہوگا اس بیچ میں آٹھ گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''اگر ہم اس پرائیویٹ ٹیکسی میں نہیں جائیں گے تو یہاں سے جائیں گے کیسے؟''

جین بولی۔ ''میں نے دوسری کار کا بندوبست کر رکھا ہے۔''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور کہا۔ ''مجھے تو یہاں صرف اپنی ٹیکسی نظر آتی ہے یا ماجد کی پرائیویٹ مرسڈیز ٹیکسی، جسے لے کر وہ سری نگر میں گھومتا تھا۔''

''اس وقت وہ لوگ سو رہے ہوں گے۔ دو تین گھنٹے ہو گئے انہیں آئے ہوئے۔ ممکن ہے ہماری طرح سوئے بھی نہ ہوں یا اُن کا کوئی آدمی ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھنے میں مصروف ہو، اس لیے ہم چپ چاپ اس کاٹج کے پچھواڑے کے راستے سے نکل جائیں گے۔

میں نے غور سے دیکھا۔ جین نے خوب دیکھ بھال کے اس کاٹج کا انتخاب کیا تھا۔ یہ کاٹج بالکل جنگل کے کنارے واقع تھا۔ پچھواڑے میں گھنا جنگل تھا۔ پچھواڑے سے نکلتے ہی چند قدم چل کر جنگل ہمیں گھیر لیتا۔

جین نے میرے کمرے میں بیٹھ کر یکے بعد دیگرے تین سگریٹ سلگائے۔ پھر جب چاند جنگل میں اتر گیا اور دھندلی تاریکیوں کے نقاب یوس مرگ پر چھا گئے تو میں شکنتلا اور جین کاٹیج کے پچھواڑے سے اپنا اپنا سامان اُٹھائے نکلے اور چند قدم چل کر جنگل میں غائب ہو گئے۔ کسی نے ہم کو دیکھا نہ تھا!

جنگل کے اندر جین نے اگوائی کی۔ لگتا تھا کہ یہاں وہ اس سے پہلے بھی آ چکی ہے کچھ فاصلے تک اونچائی رہی پھر ڈھلان شروع ہوئی اور جنگل چھدرا ہوتا گیا اور ایک پگڈنڈی نمودار ہونے لگی۔ جو بڑھتے بڑھتے ایک کچے جیپ کے راستے پر ختم ہو گئی۔

یہاں ایک کار کھڑی تھی۔

ہم لوگ جین کے اشارے سے اس کار میں بیٹھ گئے۔ میں ڈرائیور کو ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکا کیونکہ اُس کا چہرہ اوپر اٹھے ہوئے کوٹ کے کالروں اور فلیٹ ہیٹ کے جھکے ہوئے کناروں میں اوجھل تھا۔

ہمارے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔

دھیرے دھیرے وہ کار کو جنگل سے باہر لے آیا اور چند فرلانگ اسی کچی سڑک پر چلنے کے بعد ہمیں سری نگر واپس لے جانے والی پکی سڑک مل گئی۔ یہاں پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بہت تیز کر دی۔ گاڑی کا انجن بہت عمدہ معلوم ہوتا تھا اور تقریباً بے آواز ڈرائیور بھی راستے سے واقف تھا اور بے حد مشاق معلوم ہوتا تھا۔

سری نگر پہنچ کر بھی گاڑی سری نگر نہیں رکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈرائیور کو جین کے ذریعے پہلے سے علم ہو چکا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔

اب ہم لوگ گاندربل جانے والی سڑک پر تھے۔ راستے بھر شکنتلا نے کوئی بات نہیں کی کیونکہ اس نے کار میں بیٹھتے ہی ٹرپ لے لیا تھا۔ بعد میں جین نے مجھے بتایا۔ شکن بہت نروس لڑکی ہے۔ اُس نے چٹکی لے لی۔ ٹھیک ہی کیا۔

مگر میں یہ بھی دیکھ سکتا تھا کہ خود جین بہت نروس ہو چکی ہے۔ گو اب تک وہ اپنے حواس پر قابو پائے ہوئے تھی مگر اُس کی آنکھوں میں شدید اعصابی تناؤ موجود تھا مجھے چونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس لیے میں بے حد مطمئن تھا، اب

جو ہوگا سو ہو جائے گا!

کار پرنگ پہنچ کر بھی نہ رکی۔ سون مرگ کے راستے پر ہولی۔ چند میل چلنے کے بعد ایک کچا راستہ آیا جس پر جیب آسانی سے دوڑ سکتی تھی مگر کار کے لیے مشکل تھی۔ پھر بھی چند میل تک ڈرائیور گاڑی کو لیجاتا رہا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر اُسے محسوس ہوا کہ اب وہ آگے نہیں جاسکتا تھا تو اُس نے گاڑی روک کر انجن کٹ کر دیا۔

کچھ کہے بغیر میں، جین اور شکنتلا گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ ڈرائیور نے ہم تینوں کے سوٹ کیس ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے۔ میں نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی مگر اُس نے ایک بڑا کالا چشمہ آنکھوں پر چڑھا رکھا تھا اور باقی چہرے پر داڑھی تھی۔ صرف اس کے کپڑوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ کوئی پیشہ ور ڈرائیور نہیں ہے مگر آج کل تو بہت سے ڈرائیور بھی اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔

کچھ کہے بغیر وہ گاڑی کو واپس لے گیا۔

اُس کے جانے کے بعد جین نے سوٹ کیس اُٹھا کر چلنا شروع کیا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے میرے بعد شکنتلا سے سوٹ کیس اُٹھانے میں دقت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ وہ ابھی پورے طور پر ٹرپ سے باہر نہ آئی تھی اس لیے میں نے اُس کا سوٹ کیس اُٹھالیا اور اُس نے دھیمے سے ایک لمبی آہ بھری اور ڈولتے ہوئے میرے ساتھ چلنے لگی جیسے اُس کا جی چاہ رہا ہو کہ میں سوٹ کیس کے ساتھ اُس کو بھی اُٹھا کر لے چلوں۔ اس وقت وہ بڑی تھکی تھکی اور بیزار سی معلوم ہو رہی تھی، ایک ایسی جامد اور بند خوشبو کی طرح جو کسی طرح سلگنا نہیں جانتی۔

میلوں تک ہم لوگ خاموشی سے چلتے گئے۔ اب یہاں کوئی راستہ نہ تھا۔ صرف جین کو ایک سمت کا احساس تھا۔ میدانی علاقہ ختم ہوگیا تھا اور جھاڑیوں سے بھرے ہوئے ٹیلوں کے بعد ہم ایک پہاڑ کی اونچائی پر چڑھ رہے تھے۔ بس ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ راستہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ درختوں کے جھنڈ خال خال نظر آتے تھے اور ڈھلانوں کی سلوٹوں میں اور چٹانوں کی گہری دراڑوں میں ابھی تک برف چمک رہی تھی اور جوں جوں ہم اوپر جا رہے تھے برف زیادہ ہوتی جاتی تھی اور ہوا لطیف آسمان صاف تھا اور سورج چمکیلا اور تابناک اور دور دور ہمارے سوا نہ کوئی انسان تھا نہ جانور۔ نہ گاؤں نہ آبادی!

آدھی اونچائی طے کر کے ہم لوگ ایک ایسے موڑ پر مڑ گئے جو پہاڑ کے دوسری طرف مغرب کو جاتا تھا۔

یہاں پہنچ کر اچانک خنکی کا احساس ہوا کیونکہ ادھر گہرا جنگل تھا اور سایہ۔ ایک ٹیلے پر پہنچ کر ہم نے تھرماس کھلوا کر اس میں چائے انڈیل کر اس میں برانڈی ڈال کر پی اور جسم گرما کر آگے چلے۔ کئی ٹیڑے میڑھے موڑ طے کرنے کے بعد ہم لوگ ایک ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ دیودار ختم ہوئے۔ چیڑھ کے پیڑ شروع ہوئے۔ پھر چیڑھ کے پیڑ چھدرے ہونے لگے، پھر گھاس کی لمبی لمبی ڈھلانیں شروع ہوئیں اور ہم نے دیکھا کہ دو پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی ہے جس کے بیچ میں ایک شفاف نالہ بہہ رہا ہے اور اس نالے کے کنارے کے چند خیمے لگے ہوئے ہیں اور آس پاس گھاس کے تکلوں پر سینکڑوں بھیڑ، بکریاں، گھوڑے، گھوڑیاں اور گائیں بھینسیں چر رہی ہیں!

چیل کے ایک تنے کا سہارا لے کر جین کھڑی ہوگئی اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اپنے بالوں میں گھما کر مسرت آمیز آواز میں بولی۔

”لو منزل آگئی۔“



یہ سانبل وال قبیلے کی ڈھوک تھی یعنی اس چھوٹی سی وادی میں سانبل وال قبیلے کے گوجر اپنے ڈھور ڈنگر چرا سکتے تھے۔ کسی دوسرے قبیلے کو یہاں اپنی بھیڑ بکریاں چرانے کی اجازت نہیں تھی۔ خانہ بدوش گوجروں کے قبیلے اسی طرح اپنی ڈھوکیں بانٹ لیتے ہیں تاکہ اپنے اپنے گلے چرانے میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

سانبل وال قبیلہ بغلیاز سے اپنے گلے چراتا چراتا یہاں تک آنکلا تھا۔ بارہ خیمے تھے اور ان خیموں میں رہنے والے ساٹھ ستر گوجر افراد ہوں گے۔ مرد، عورتیں، بچے.....! سردار کا نام اکبر خاں تھا اور وہ چھ فٹ کا چوڑے چوڑے ہاڑ والا انسان ہی ملیشیا کی گھیرے دار شلوار ٹخنوں سے اونچی اور اس کے اوپر ملیشیا ہی کی قمیض، گول داڑھی اور ترشی ہوئی مونچھیں اور گھٹے ہوئے سر پر ڈھیلی پگڑی!

اس کے پاس خیمے تھے۔ اس نے ایک خیمہ ہمیں رہنے کے لیے دے دیا اور میں

پہلی بار خانہ بدوش گوجروں کی قبائلی زندگی سے واقف ہوا اور مجھے محسوس ہوا کہ جو زبان یہ لوگ بولتے ہیں وہ گجراتی زبان کے قریب ہے۔ شاید ان کے بزرگ کسی زمانے میں گجرات سے ہجرت کر کے یہاں آگئے ہوں گے اور اسلام قبول کر کے کشمیر کی زرخیز چراگاہوں میں بس گئے ہوں گے۔!

شہری زندگی کے بعد قبائلی زندگی کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ یہاں خیمے سے دس قدم کے فاصلے پر صاف ستھرے نالے کا پانی تھا اور دس قدم کے فاصلے پر جنگل تھا جہاں سے گوجر لوگ کھانا پکانے کے لیے لکڑیاں اور جنگلی ساگ لے آتے تھے۔ آٹا، دالیں، کدو، نمک، مرچ، یہ راہ چلتے کسی گاؤں یا قصبے سے خاصی تعداد میں خرید کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ دودھ، دہی مکھن کی افراط تھی۔ بھیڑ بکری، مرغی اور دنبے کے گوشت کی کمی نہ تھی۔ اگر ان قبائیلیوں کے کپڑے گندے تھے تو کیا ہوا؟ یہاں کی ہوا تو صاف تھی۔ جنگل سے آنے والی جگن کی نتھری ہوئی خوشبو چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ یہاں نہ بدبودار موریاں تھیں، نہ گندے سلم، نہ غلیظ کوڑے کرکٹ کے انبار۔ یہ لوگ جنگل کی اوٹ میں کھلے آسمان کے نیچے دھرتی کی گود میں رہتے ہیں اور بہت عمدہ صحت اور لمبی عمر پاتے ہیں انہیں نہ کینسر ہوتا ہے نہ ہارٹ اٹیک...... نہ نروس نہ بریک ڈاؤن، سیدھی سادی بیماریوں کا علاج سیدھی سادی جنگلی جڑی بوٹیوں سے ہو جاتا ہے، اور اکثر تو بہت سی جسمانی بیماریاں، دن بھر کی کسرت اور محنت سے کاٹ پیٹ کے ٹھیک ہو جاتی ہیں، خود بخود! فطرت سے بڑا ڈاکٹر کون ہوگا؟ جس طرح سے انسان نے گزشتہ چار سو سال میں فطرت کو تباہ کیا ہے جنگلوں کو برباد کیا ہے۔ فضا کو گندہ کیا ہے اس سے پوری انسانی آبادی کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انسان کو پھر فطرت سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ بڑے بڑے شہر فطرت کے جسم پر کینسر ہیں۔ میں آرکی ٹیکٹ ہوں مگر آر۔ کی ٹیکٹ شاعر بھی ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ گھر صرف کنکریٹ، چونے اور گارے سے نہیں بن سکتا۔ گھر کے لیے پیڑوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور گھاس کی بھی اور بیلوں کی بھی اور پھولوں کی بھی۔ گھر کو کھلے آسمان کی چھت بھی چاہیئے اور زمین کی سوندھی خوشبو بھی اور کھلی فضا کی ہوا بھی مگر میں گھر نہیں بناتا ہوں کیونکہ مجھے تین ایکڑ زمین پر بتیس منزلہ عمارت کھڑی کرنا ہے جس میں تین ہزار آدمی رہ سکیں۔ اس

لیے میں گھر نہیں بناتا ہوں بلکہ کنکریٹ کے پنجرے اور سیمنٹ کے بھٹ اور چونے گارے کے چوہے دان جس طرح کے شہر میں چاہتا ہوں اس کے لیے انسان کو اپنی تہذیب کی ساری قدریں بدلنی ہوں گی!

ابھی رات کمسن ہے۔ اُس کے لمس میں ایک شرمیلا سا گریز ہے۔ ہوا کی نگاہیں جنگل کے پتوں کی اوٹ سے کبھی جھانکتی ہیں۔ کبھی ان کے گھونگھٹ میں چھپ جاتی ہیں خوشبوئیں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ ہمارے خیمے کے باہر کی جھاڑی جگنوؤں سے بھرگئی ہے۔ کوئی ننھا میمنہ اپنی ماں کو پکار رہا ہے!

اکبر خان کے بڑے خیمے کے باہر ایک طرف الاؤ جل رہا ہے۔ اس میں دنبے کے تکے تیار ہو رہے ہیں۔ اکبر خاں نے ہماری آمد کی خوشی میں ایک دنبہ ذبح کیا ہے جین نے یہاں میرا نام سکندر علی بتایا ہے۔ اکبر خاں نے مجھ سے پرتپاک مصافحہ کیا ہے۔

الاؤ کے دوسری طرف زمین کھود کر ایک بڑے چولہے میں لکڑیاں جل رہی ہیں۔ اس چولہے میں اکبر خاں کی بیوی حلیمہ اور اُس کی بڑی لڑکی مرجینا مکئی ٹوڈے تیار کر رہی ہیں۔ مرجینا لکڑی کی ایک بڑی پرات میں مکئی کا آٹا گوندھتی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے پیڑا بنا کر اپنی ماں کو دیتی ہے۔ اس کا چوڑا چکلا گندمی چہرہ شعلوں کی روشنی میں گلنار ہو گیا ہے۔ حلیمہ اپنی بیٹی سے پیڑا لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں تھپتھپا کر ایک بڑی گول روٹی بناتی ہے اور اسے توے پر ڈال دیتی ہے پھر وہاں سے اُٹھا کر نیچے انگاروں پر سینکتی ہے۔ ہمارے سامنے دنبے کے تکے ہیں۔ دنبے کا سالن ہے۔ لال لال مرچوں میں رچی ہوئی کدو کی بھاجی ہے۔ کسی جنگلی ساگ کی بہت ہی لذیذ کڑھی ہے اور گرم گرم سنکے ہوئی مکئی کے ٹوڈے ہیں، جو مرجینا ہمارے سامنے لا کر باری باری رکھ رہی ہے جب وہ جھکتی ہے تو اُس کے سامنے کے بالوں کی بے شمار میڈھیاں بید مجنوں کی شاخوں کی طرح سرسراتی ہیں اور سینے کے وحشی کبوتر پر تولتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے وہ نگاہ اُٹھا کر مجھے دیکھ لیتی ہے۔ اُس کی بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھوں میں مرد کا ڈر ہے اور مرد کی خواہش بھی۔ پلک جھپکتے ہی وہ لوٹ جاتی ہے، دوسری روٹی لانے کے لیے اور فضا میں ایک عجیب سی خوشبو چھوڑ جاتی ہے ہاں وہ دودھ پنیر اور مکھن سے بنی ہے۔ اُس کے سارے بدن میں مکھن کی خوشبو ہے۔

کتنا کھالیا ہے میں نے؟ کتنا کھانا کھا چکا ہوں میں؟ ایک وقت میں اتنا کھانا تو میں نے زندگی بھر نہیں کھایا کبھی نہیں کھایا۔ جین اور شکن نے بھی ڈٹ کر کھایا ہے۔ ہم لوگ پورے ایک دن کے بھوکے ہیں۔

اب مجھے نیند آرہی ہے۔ میں وہیں خیمے کے باہر ایک چٹائی بچھا کے لیٹ جاتا ہوں۔ شکن اندر لیٹ گئی ہے۔ جین، اکبر خاں سے بات کرنے اُس کے خیمے میں چلی گئی ہے۔ مرجینا نے آکر میرے آدھے بدن پر کمبل ڈال دیا ہے چند لمحوں کے لیے اُس کی انگلیاں میری انگلیوں میں زخمی کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑائیں تھیں، پر اُس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور چلی گئی مگر اُس کے جانے کے بعد کئی لمحوں تک مکھن کی خوشبو فضا میں تیرتی رہی۔

پھر آنکھوں میں تارے ناچنے لگے اور کانوں میں نالے کا پانی گنگنانے لگا اور سائیں سائیں کرتی ہوا اپنے مخملیں پردوں سے غنودگی کا مرہم لگانے لگی۔

اسی غنودگی کے عالم میں اخروٹ کے ایک پیڑ کے نیچے الاؤ کی روشنی میں قبیلے کے مرد، عورتوں کے نیم ہالے میں مرجینا کو ناچتے دیکھا مگر نیند کا ایسا غلبہ تھا کہ میں اُٹھ نہ سکا لیٹے ہی لیٹے میری آنکھوں میں اُس کا بدن تھر کتا رہا اور کسی کا دف بجتا رہا اور بھیڑ، بکریاں چوپائے اور انسان، درخت اور ہوا، پہاڑوں پر سوتی ہوئی برف اور بہتا پانی اس رقص کی روانی میں گھل گئے۔ پھر کچھ نہ رہا۔

پھر کچھ نہ رہا۔ تیسرے پہر کے سناٹے میں یکا یک میری آنکھ کھل گئی، کوئی میرے کمبل میں گھس آیا تھا اور کسی کی نازک کراہیں اور گرم گرم سانسیں اور نرم نرم انگلیوں کی بے تابی، زخمی کبوتروں کی طرح میری انگلیوں میں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''یہ کیا مرجینا۔ یہ کیا؟''

''مجھے شہر لے چلو مجھے شہر لے چلو۔'' مرجینا سسک کر بولی۔

''عجیب ہے انسانی فطرت بھی۔'' میں نے اپنے دل سے کہا۔ ''ہم شہروں سے بھاگ کر جنگل میں آتے ہیں اور جنگل میں رہنے والے جنگل سے بھاگ کر شہروں کو جاتے ہیں۔ شاید انسان ہمیشہ وہی کرتا ہے جو اسے میسر نہیں اور جو اسے میسر ہے اُس کی قدر و قیمت وقت کے گزرنے کے ساتھ اُس کے دل میں گھٹتی جاتی ہے۔''

میری انگلیاں پہلے تو اُس کی انگلیوں سے کھیلتی رہیں۔ پھر اُس کے بالوں کی مینڈھیاں سنوارتی رہیں۔ پھر اُس کے پھول ایسے رخساروں کو چھوتی رہیں۔ پھر اُس کی مخملیں گردن کا خم سلاتی رہیں پھر اُس کے مکھن سے بنے ہوئے بدن پر پھیل گئیں۔ پھر مرجینا کی میٹھی میٹھی سسکیاں تیز ہوتی گئیں...... پھر؟

پھر کچھ نہ رہا......!

☆☆☆

دوسرے دن میں نے جین سے پوچھا...... تو بولی...... ''بات چیت ابھی چل رہی ہے۔ اکبر خاں کے پاس پندرہ بوریاں پکنی کی بھری رکھی ہیں۔ خشک پکنی کی، دھوپ میں سکھائی ہوئی۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ مال عمدہ ہے مگر وہ اس کے تیس ہزار مانگتا ہے۔ پندرہ بوریوں کے میں دس ہزار قیمت لگائی۔ وہ نہیں مانا۔ میں دس ہزار سے بڑھ کر پندرہ ہزار تک پہنچی ہوں۔ وہ تیس سے اتر کر چوبیس ہزار تک آیا ہے۔ آج پھر بات ہوگی ویسے تم نے ترپ کی چال اچھی چلی ہے۔''

''کون سی ترپ کی چال؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''وہی مرجینا والی۔'' جین ایک خاص ادا سے مسکرا کر بولی۔

میں چپ رہا......!

''سمجھ دار مرد ہو۔ تمہاری ہوشیاری کی داد دیتی ہوں۔ اکبر خاں بالکل اپنی بیٹی کی مٹھی میں ہے۔ اسے بہت چاہتا ہے۔ اب تمہارے دو لفظ کافی ہوں گے۔''

''کس طرح کے لفظ؟''

''تمہیں مرجینا سے کہنا پڑے گا۔ بس اپنا کام ہو جائے گا۔''

''مگر مرجینا ہے کہاں؟ صبح سے اُس کو دیکھا نہیں!''

جین بیزار لہجے میں بولی۔ ''مرد اتنی موٹی عقل کے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا صبح تم نے اُسے جنگل کی طرف جاتے نہیں دیکھا، جب وہ ڈھور ڈنگروں کے ایک گلے کو لے جا رہی تھی۔ اس نے مڑ کر تمہاری طرف دیکھا بھی تھا!''

''میں نے نہیں دیکھا۔''

''وہ نگاہ ایک عورت کی تھی بدھو۔''

مگر وہ اب تو شام ہی کو جنگل سے لوٹے گی۔''

''ارے وہ تمہارا انتظار کرے گی جنگل میں۔ اس وقت بھی انتظار کر رہی ہے جنگل میں اور تم مجھ سے یہاں بحث کر رہے ہو۔ تمہاری دو میٹھی میٹھی باتوں سے اپنا کام نکل سکتا ہے۔''

مرجینا مغرب کو گئی۔ میں مشرق کی طرف سے جنگل میں گھسا اور کافی دور اندر جا کر میں نے سمت بدلی اور مغرب کی راہ لی۔ برف تیزی سے پگھل رہی تھی اور چھوٹے چھوٹے نالے پانی سے بھرے ہوئے تھے اور چیڑ کے جھومروں کا رنگ گہرا سبز تھا اور زمین سے ہزاروں پھولدار جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور بہار کا غالیچہ بچھانے میں مصروف تھیں اور کہیں کہیں اونچے ٹیلوں پر قد آور جھاڑیاں پھولوں کی رنگین اوڑھنیاں پہنے جھرمٹ میں کھڑی کسی میلے میں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

جب میں اُن کے قریب سے گزرا تو لگا جیسے وہ سب اپنی رنگین اوڑھنیاں ہونٹوں میں دبا کر مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہیں۔ اس ہنسی میں شرارت تو تھی مگر آواز نہیں تھی جیسے سورج کی کرنوں میں روشنی تو ہوتی ہے مگر کھنک نہیں ہوتی، ہاں کھنک کا احساس اس وقت ضرور ہوتا ہے جب کرنوں کے جھنڈ جنگل کے ڈھلانوں پر اترنے لگتے ہیں۔ دھوپ اور سایوں کی شطرنجی میں کرنوں کی پائل سی بجتی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی خاموش آوازوں کا سنگیت بلند صداؤں کے شور سے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے صرف جنگل میں یا نگاہوں کے سنگم میں یہ خاموش موسیقی سنی جا سکتی ہے۔!

وہ مجھے ایک چھوٹے سے مرغزار میں گلہ چراتے ہوئے مل گئی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور وہ گروچ کی ایک جھاڑی سے نیم اودھے گروچ توڑ توڑ کر کھا رہی تھی۔ اسے میرے بے آواز قدموں کا بہت جلد احساس ہو گیا کیونکہ گو وہ مجھے دیکھنے کے لیے مڑی نہیں۔ اس کے ہاتھ گروچ توڑتے توڑتے رک گئے تھے مگر اُس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ اسی طرح میری طرف پیٹھ کیے کھڑی رہی۔ عورتوں کو ایک خاص طریقے سے احساس ہو جاتا ہے کہ کون آ رہا ہے۔

میں نے اُس کے قریب جا کر دونوں ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال دیئے۔ وہ مڑی تک

نہیں۔ ایک لمبی سانس لے کر اُس نے سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا اور بولی۔ ’’بہت دیر میں آئے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’دیر میں اس لیے آیا کہ کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔‘‘

وہ بولی۔ ’’میں تقریباً نا امید ہو چلی تھی۔‘‘

میرے ہاتھ اُس کے جسم سے کھیلنے لگے۔ وہ آدھا مڑ کر بولی۔

’’علی تمہارا سودا ہو گیا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’نہیں تمہارا باپ زیادہ مانگتا ہے۔‘‘

کتنا؟‘‘

’’چوبیس ہزار۔‘‘

’’تم کتنا دے سکتے ہو؟‘‘

’’بیس ہزار؟‘‘

وہ ایک لمحے کے لیے رکی بولی۔ اس رقم پر سودا ہو جائے گا۔ کم پر بھی ہو سکتا ہے مگر تمہیں مجھے شہر لے جانا ہو گا۔‘‘

’’تم شہر جا کر کیا کرو گی؟‘‘

’’مجھے قبیلے کی زندگی پسند نہیں ہے۔ یہ خیموں کی زندگی بغلیاز سے سون مرگ تک یوں مارے مارے پھرنا، سات دن اس ڈھوک میں تو پندرہ دن اس ڈھوک میں، تو بیس دن کسی تیسری ڈھوک میں انگ انگ میں بھیڑ بکریوں کی بوباس رچ جاتی ہے حتیٰ کہ ہم خود اپنے آپ کو بھیڑ بکری محسوس کرنے لگتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’مگر تمہارے جسم سے تو بھیڑ بکری کی بو نہیں آتی ہے۔ اس لیے کہ میں روز نہاتی ہوں مگر ہمارے قبیلے کی سبھی عورتیں روز نہیں نہاتی ہیں۔ گندگی ہمارا زیور ہے۔ بدبو ہماری مہک۔ آوارہ گردی ہماری قسمت۔ میں اس خانہ بدوشی کی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں اور میرا باپ جس سے میری شادی کرنا چاہتا ہے، اُس سے مجھے نفرت ہے۔‘‘

اُس نے دھیرے سے اپنی انگلی کے ناخن سے میرے گال پر ایک فرضی لکیر بنائی۔ شہد بھرے لہجے میں بولی۔

’’مجھے لے چلو ناں۔‘‘

''تمہارا باپ مجھے مار ڈالے گا۔''

''اسے کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ہم دونوں بھاگ چلیں گے۔''

''کہاں؟''

''بمبئی۔''

''تم نے بمبئی دیکھا ہے؟''

''جب سے اس کی تصویریں دیکھی ہیں، میرے خوابوں میں بسا ہے۔تم کہاں رہتے ہو؟''

''بمبئی میں......''

''تب تو۔'' وہ مجھ سے لپٹ گئی۔''تب تو۔'' اس نے میرا منہ چوم لیا۔''تب تو تم مجھے ضرور لے چلو گے۔لے چلو گے ناں؟''

''ہاں۔''

''کب ،کل؟''

''کل نہیں ایک مہینہ بعد۔!''

اُس کا چہرہ اتر گیا۔''ایک مہینہ بعد کیوں؟''

''اس لیے کہ مجھے یہاں سے سری نگر جانا ہوگا اور مال کو فیکٹری تک پہنچانا ہوگا جہاں اُس کی دوا بنتی ہے پھر کہیں واپس آسکتا ہوں لیکن ایک مہینہ بعد۔''

''ایک مہینہ بعد تو ہم سون مرگ میں ہوں گے۔''

اس کی بھولی بھولی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھیں۔''سچ؟''

''سچ۔'' میں نے اُس کا منہ چوم یا۔

یکا یک وہ خاموش ہوگئی پھر اُداس ہوگئی پھر بولی۔''نہیں تم ایسا نہیں کرو گے ، سب یہی کہتے ہیں۔مگر پورا کوئی نہیں کرتا۔''

''وہ سب کون؟''

''ایک تھا انگریز وہ ہمارے قبیلے کے ساتھ آٹھ مہینے رہا۔کہتا تھا۔میں تم لوگوں کی زندگی سمجھنا چاہتا ہوں۔وہ ہمارے ساتھ آٹھ مہینے رہا۔اُس نے ہمیں انگریزی پڑھنا لکھنا

بھی سکھایا۔ اس نے مجھ سے بہت پیار کیا تھا۔ کہتا تھا۔ تمہیں نیویارک لے جاؤں گا۔ تم ہوائی جہاز میں بیٹھوگی۔ بڑی کار میں گھوموگی تم عطر لگاؤ گی اور فراک پہنوگی......اور......!''

''پھر کیا ہوا......؟''

''بدمعاش ایک رات چپکے سے بھاگ گیا۔''

ایک بڑا تکلیف دہ سناٹا۔

بولی۔ ''کہیں مل جائے تو جان لے لوں گی اُس کی۔''

میں نے پوچھا ''اور وہ کون تھا؟''

''بغلیاز کا عبدالصمد تھا۔ وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ کہتا تھا، تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ ایک بڑا گھر دوں گا تمہیں اس وحشی سے چھٹکارا دلاؤں گا۔''

''کرتا کیا تھا؟''

''سری نگر میں ڈاکٹری پڑھنے آیا تھا۔ آج کل لندن میں ہے۔''

''تمہارے قبیلے کا تھا؟''

''نہیں۔ بغلیاز کے نمبردار کا بیٹا تھا مگر وہ جھوٹا نکلا جاتے وقت وہ مجھے مل کر بھی نہیں گیا۔''

مرجینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے!

''تمہیں اُس سے پیار ہے؟''

''مجھے اونچے اڑنے والے ہوائی جہاز سے پیار ہے اور جب وہ ہمارے پہاڑوں کے اوپر اڑتے ہیں، میں بھی اُن کے ساتھ اڑنے لگتی ہوں اور بمبئی پہنچ جاتی ہوں۔ بمبئی کا سمندر کتنا بڑا ہے؟''

''تمہارے دل سے چھوٹا ہے۔''

''چل جھوٹے۔''

''سچ اچھا اور کون تھا؟''

''بس اور کوئی نہیں۔'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''دو بار میں نے غلط فیصلے کیے معلوم نہیں یہ فیصلہ بھی میرا صحیح ہے کہ نہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے اُس سے کہا۔ ''میں ضرور ایک ماہ بعد تمہیں آگے لے جاؤں گا۔''

مرجینا نے مجھ سے پوچھا۔ ’’تم بمبئی میں کہاں رہتے ہو؟‘‘

میں نے اُسے غلط پتا بتایا۔

’’کرتے کیا ہو؟‘‘

میں نے اُسے ٹھیک بتایا!

بولی۔ ’’تم ان دو عورتوں کے ساتھ کیسے آئے؟‘‘

پھر میں نے اُسے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔

وہ بولی۔ ’’پچھلے سال بھی یہ آئی تھیں۔ گلمرگ میں ہمارا سودا ہوا تھا۔ مگر جب ہمارے پاس صرف دو بوریاں تھیں۔ اس بار تو پندرہ بوریاں خشک بوٹیوں کی ہیں، جانے یہ عورتیں ان بوٹیوں کا کیا کرتی ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’اُس کے سفوف سے سر درد کی دوا تیار ہوتی ہے۔‘‘

وہ آہستہ سے ہنسی۔

میں نے کہا۔ ’’کیا بات ہے کیوں ہنسی؟‘‘

بولی۔ ’’تمہیں بتاؤں؟ کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’ہمارے گوجر لوگ اسی بوٹی سے نشہ بھی کرتے ہیں۔‘‘

’’اچھا؟‘‘ میں نے بناوٹی حیرت سے کہا۔

’’ہاں۔ مگر یہ بات باہر کے لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہے۔‘‘ وہ پھر ہنس کر بولی ’’باہر کے لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔‘‘

’’اچھا!‘‘

’’ہاں۔‘‘ مرجینا نے بڑی قطعیت سے کہا۔ ’’تم کو اگر نشہ کرنا ہو تو اِس کی تین چار پتیاں منہ میں لے کر چبا ڈالو۔‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہے؟‘‘

’’ہماری بھیڑ، بکریاں اس بوٹی کو منہ نہیں لگاتی ہیں مگر کوئی بے وقوف میمنہ یا بھیڑ بوٹی کی پتیاں چبا ڈالتی ہے تو ایک دم نشے میں آ جاتی ہے جو زیادہ کھا لے مر بھی جاتی ہے۔‘‘

''تم نے کبھی اس کا نشہ کیا ہے؟'' میں نے مرجینا سے پوچھا۔

''نہیں۔ کبھی نہیں۔ تم بھی مت کرنا۔''

''اچھا نہیں کروں گا مگر ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہے میں ایک ماہ بعد تمہارے پاس آ جاؤں گا؟''

''وہ دونوں بڑے میٹھے تھے۔'' مرجینا سوچ سوچ کر بولی۔ ''تم ترش لہجے والے مرد ہو۔ ڈانٹنے والے۔ رات کو بڑے سخت گیر تھے۔ لگتا ہے تم بات نبھانے والے مرد ہو مگر میں غلط ہو سکتی ہوں۔''

''اگر اس بار بھی تمہارا غلط فیصلہ ہوا تو؟''

''تو میں اکیلی ہی بمبئی آ جاؤں گی۔ تمہارا ایڈریس تو میرے پاس ہے۔''

میں اِدھر اُدھر دیکھا تا کہ میری نگاہیں اُس کی نگاہوں سے نہ مل سکیں۔ دھوپ کم ہو رہی تھی اور بادلوں کا ایک ٹکڑا درختوں پر اتر آیا تھا اور اپنی دھندلی انگلیاں پھیلا پھیلا کر جنگل کو ٹٹول رہا تھا۔ دھیرے دھیرے بڑی ملائمت اور محبت سے وہ انگلیاں جنگل کے بدن میں اتر رہی تھیں اور پھیلتی جا رہی تھیں۔ چاروں طرف...... میں نے پوچھا۔ ''اگر بمبئی آ کر تمہیں پتا چلا کہ میری کوئی بیوی بھی ہے؟''

''تو میں اُس کی جان لے لوں گی۔''

اُس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ پھر یکا یک ہنس دی۔

پھر ایک دم کمزور لہجے میں بولی۔ ''علی مجھ سے پیار کرو۔ دیکھو چاروں طرف سے دھند آ رہی ہے اور اس دھند میں کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا۔''

☆☆☆

جین نے مجھے ایک پکنی بوٹی دکھائی۔ یہ چھوٹی سی جھاڑی نما بوٹی تھی۔ قد دو فٹ سے اونچا نہیں اور شاخیں چار پانچ انچ سے بڑی نہیں۔ پتے موٹے کھردرے اور دندانے دار۔ بوٹی کے اوپر کی شاخ پر دو یا تین پھول ہوتے ہیں۔ نیم اودے اور کرن پھول کی شکل والے اور ان سے دھتورے کی سی تیز مہک آتی ہے۔ گوجر لوگ اکثر اس تیز مہک سے جنگل

کی ڈھلوانوں پر اس بوٹی کو تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ بوٹیاں گوجروں نے بڑی احتیاط سے کھائی تھیں۔ پتے پھول، شاخیں سب محفوظ تھے، سوکھ کر پکی بوٹی کا وزن ہلکا ہو گیا تھا!

مرجینا کی مہربانی سے اٹھارہ ہزار میں سودا ہو گیا تھا۔ جین نے مجھے دو ہزار روپے واپس کر دیئے تھے۔

اور اب ہم لوگ واپس جا رہے تھے۔

مرجینا سے جنگل میں آخری ملاقات بہت تکلیف دہ تھی۔ مرجینا زار و قطار رو رہی تھی اور بار بار مجھ سے چمٹ جاتی تھی اور اُس کا سارا بدن کانپنے لگتا تھا۔ میرے رخسار اُس کے آنسوؤں سے گیلے ہو گئے۔ یارب یہ پہاڑی لڑکیاں اس قدر بے وقوف کیوں ہوتی ہیں؟''

بڑی مشکل سے میں نے اپنا پیچھا چھڑا لیا اور سون مرگ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔

اکبر خاں نے پانچ گوجر ہمارے ساتھ کر دیئے تھے۔ ہر گوجر تین تین بوریاں اُٹھائے ہوئے تھا۔ پندرہ بوریوں میں بوٹی بھری تھی۔ طے یہ پایا تھا کہ پانچوں گوجر ہمیں ان بوریوں سمیت پرنگ کے کیمپ میں پہنچا کر رخصت ہو جائیں گے۔

مگر جین نے کچھ اور انتظام کر رکھا تھا کیونکہ جب ہم پہاڑی علاقہ سے اتر کر پرنگ کی وادی میں داخل ہوئے تو ایک موڑ پر سڑک سے کچھ دور چیری کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے سلور اور بلو رنگ کی ایک شاندار ٹورسٹ بس کھڑی دیکھی۔

ہم لوگ علی الصبح اکبر خاں کے کیمپ سے روانہ ہوئے تھے اور ابھی پو پھٹی نہ تھی کہ اس مقام تک پہنچ گئے۔ آج آسمان صاف نہ تھا اور گہرے بادل اُفق تا اُفق چھائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے صبح کے نیم اندھیرے میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ بورے اُٹھائے ہوئے گوجروں کے چہرے اس نیم اندھیرے میں اور بھی پُر اسرار ہو گئے تھے۔ جین نے اُنہیں ایک مقام پر کھڑا کیا اور خود چیری کے پیڑوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ سلور بلو بس کھڑی تھی۔!

میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ جلدی جلدی ڈرائیور سے کچھ باتیں کر رہی ہے جو بس سے نیچے اتر آیا تھا۔

چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہ اس ڈرائیور کے ساتھ واپس آگئی اور اُس نے پانچویں گوجروں کو بورے کھولنے کے لیے کہا۔ جب ڈرائیور ہمارے قریب آیا تو میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ وہی داڑھی والا ڈرائیور تھا جو ہمیں یہاں تک پہنچا گیا تھا۔ وہی بڑا سیاہ چشمہ اور کالر اُٹھے ہوئے۔ اس نیم اندھیرے میں ٹھیک طرح سے اُس کی صورت نہیں پہچان سکا کیونکہ اس نے اپنے چہرے کو چھپانے کا ٹھیک بندوبست کر رکھا تھا۔ مگر میری نگاہ دو تین بار اُس کی گردن کے بائیں طرف کے ایک تل پر گئی اور یہ تل میں نے اپنی یادداشت کی تہہ میں کہیں پر محفوظ کر لیا۔ شاید کہیں کام آئے۔!

ڈرائیور یا جو کوئی بھی وہ تھا۔ بڑے مغرور انداز رکھتا تھا اور اُس کا رویہ بھی حاکمانہ تھا۔ وہ خاکی رنگ کی بہت عمدہ سی کارڈورائے کی پتلون پہنے تھا اور اسی کپڑے کا پیٹی دار بش شرٹ نما کوٹ جس کے کالر اُس نے اُٹھا رکھے تھے۔ ہاتھوں پر خاکی دستانے پہن رکھے تھے اور تقریباً بے آواز قدموں سے چلتا تھا کیونکہ اُس نے خاکی فلیٹ کے جوتے پہن رکھے تھے۔ قد کسی طرح چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔!

گوجروں کے پاس پہنچ کر اُس نے جین کے کان میں کچھ سرگوشی کی اور جین نے سب بورے کھلوائے اور اچھی طرح سے ڈرائیور کا اطمینان کرا دیا کہ واقعی ان بوروں میں پکی بوٹی بند تھی۔!

اطمینان کر لینے کے بعد جین ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی گئی جہاں بس کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو اُس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ ڈرائیور اُس کے ساتھ ساتھ واپس آرہا تھا۔!

جین نے گوجروں سے کہا وہ سب بوریاں بس میں لادیں۔ سلور بلو بس بہت آرام دہ تھی۔ دوطرفہ بڑے بڑے کانچ لگے تھے جن میں ٹورسٹ نظارہ کر سکتے تھے۔ سیٹیں ہوائی جہاز کی سیٹوں کی طرح تھیں اور سامان رکھنے کے لیے ٹاپ کے بجائے نیچے ایک بہت بڑی ڈکی بنائی گی تھی جو بس کے پیچھے سے لے کر انجن تک چلی گئی تھی۔ اس میں ٹورسٹوں کا سب سامان رکھا جا سکتا تھا اور بس پرانی بسوں کی طرح ٹاپ سے لدی ہوئی بھدی بھی معلوم نہ ہوگی۔!

ڈرائیور نے نیچے کی ڈکی کھول دی اور گوجروں نے پندرہ بورے اس میں ٹھونس دیئے پھر جین کے اشارے پر وہ پانچوں گوجر بس کے اندر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ لگتا تھا۔ پہلی بار کسی ایسی خوبصورت بس میں بیٹھ رہے ہیں۔!

ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔ بڑا طاقت ور انجن تھا۔ چند منٹ میں ڈرائیور نے ہمیں الیکٹرک ڈیپارٹمنٹ کے گیسٹ ہاؤس کے قریب پہنچا دیا۔

یہاں ہم بس سے اتر کر گیسٹ ہاؤس کی طرف ہو لئے جب تک ہم بس میں رہے ایک عجیب طرح کی خاموشی طاری رہی۔ ڈرائیور نے بھی دو تین بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک بار تو اُس نے بس روک کر بس کے اندر آنے کا ارادہ سا ظاہر کیا۔ پھر شکنتلا کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر واپس چلا گیا۔ جین جب تک بس میں بیٹھی رہی۔ ڈرائیور کے دیئے ہوئے سوٹ کیس کو زور سے پکڑ کر تھامے رہی۔ اُس کے چہرے پر اعصابی تناؤ کے آثار نظر آتے رہے۔ ہاں جب ڈرائیور ہمیں دریائے سندھ کے کنارے اتار کر ایک عجیب غراہٹ سے ہمیں خیر باد کہہ کر گاندروال کی طرف اپنی بس بھگا لے گیا تو جین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اُس نے ہر گوجر کو پانچ پانچ روپے کی مزدوری دی اور اُنہیں رخصت کر دیا اور ہم لوگ الیکٹرک گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ گئے! معلوم ہوا کہ جین کے ہاتھ میں جو سوٹ کیس تھا وہ بڑا وزنی تھا۔ میں نے اُسے جین کے ہاتھ سے لے لیا اور جین سے کہا۔

''ہم لوگ کیا آج پرنگ میں رہیں گے؟''

جین بولی۔ ''ابھی میں نے کچھ فیصلہ نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''ہم اسی بس میں بیٹھ کر سری نگر کیوں نہیں چلے گئے۔ بڑی آرام دہ بس تھی۔''

''مگر ڈرائیور بڑا خطرناک تھا۔'' شکنتلا بولی۔

میں نے معاملے کو کسی حد تک بھانپتے ہوئے کہا۔ ''مگر کیا یہاں رات بھر اس اکیلی جگہ میں رہنا خطرناک نہیں ہے؟''

جین بولی۔ ''یہاں کون رہنے جا رہا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھائیں گے اور چل دیں گے۔''

''پیدل؟'' میں نے پوچھا۔

''سون مرگ سے ،لداخ کئی بسیں ادھر سے گزرتی ہیں۔جس میں جگہ مل جائے گی بیٹھ کر چل دیں گے۔''

''اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''سری نگر پہنچ کر بتادوں گی۔'' جین بولی۔''دعا کرو کہ سری نگر تک خیریت سے پہنچ جائیں۔''

''کیوں کس سے خطرہ ہے؟''

جین نے اکتا کر کہا۔''تم بہت سوال کرتے ہو؟''

☆☆☆

بہت سادہ کھانا تھا۔مرغ کا قورمہ، پیاز کی چٹنی اور چاول مگر شدید بھوک نے مزہ دے دیا۔ہمیں بڑی مشکل سے ایک کمرہ ملا تھا۔گیسٹ ہاؤس میں اور وہ بھی جب ہم نے کہہ دیا کہ ہم لوگ آج ہی سری نگر کے لیے رخصت ہو جائیں گے۔

کھانا کھا کر ہم لوگ گیسٹ ہاؤس کے باہر باغیچے میں چلے گئے اور چنار کے ایک پیڑ کے نیچے لیٹ کر آرام کرنے لگے۔سامنے کا پہاڑ برف سے لدا تھا اور باغیچے سے لگ کر دریائے سندھ میں بہتا تھا۔مگر یہ وہ دریائے سندھ نہیں جو پاکستان میں بہتا ہے۔یہ کشمیر کا سندھ ہے اور چھوٹا سا مگر بہت ہی خوبصورت دریا ہے۔کانوں میں دریا کی روانی اور آنکھوں میں پھولوں کی جوانی اور دل میں فطرت کی ترجمانی۔

پرنگ میں آکر اور اس چنار کے نیچے لیٹ کر جسم کے روئیں روئیں سے تھکن کا احساس غائب ہو جاتا ہے۔دھیرے دھیرے جین کے چہرے کی برف پگھلنے لگی اور شگفتلا کے رخساروں پر چیری کے شگوفے نمودار ہونے لگے اور جین لیٹے لیٹے اپنے سر کے نیچے سوٹ کیس کو رکھے، شے پی روکی ایک سوالیہ نظم سنانے لگی۔

شاید کوئی پوچھے کدھر ہے فطرت کا ادب۔
محبت کی شاعری اور اُس کا بیان۔
کب کیسے اور کیوں یہ ہوا کہ ہم
جذبے سے گھبرا گئے اور خوبصورتی سے ڈر گئے!۔

کدھر سے آیا ہے وہ اکیلا پن۔
اور تنہائی دانشورگی۔
دماغ کے خنک کنٹرول روم میں بند۔
اور کس نقطے پر ادب کے التماس ہیں۔
یہ خلیج گہری ہوئی۔
شاعر اور قاری کے درمیان؟

عجیب شدت تھی شاعر کی زبان میں اور جین کی آواز میں جیسے وہ اپنے دماغ کی ساری بند کھڑکیاں توڑ دینا چاہتی ہو۔!

بولی۔ ''جی چاہتا ہے اس سوٹ کیس کو دریا میں پھینک دوں اور صدیوں اس چنار کے نیچے لیٹی رہوں۔ حتیٰ کہ میرے جسم پر گھاس اُگ آئے اور میری آنکھوں سے گلاب کے پھول کھلیں اور میرے ہاتھ مجنوں کی طرح دریا کی سطح پر جھک جائیں!''

میں نے کہا۔ ''کیا مشکل ہے۔ تمہاری خواہش ابھی پوری ہو سکتی ہے۔ یہ چنار کا پیڑ ابھی نوجوان ہے ابھی تو یہ تین چار سو سال اور زندہ رہے گا۔ تم صدیوں اُس کے نیچے سو سکتی ہو۔''

جین کے ہونٹ بڑی سختی سے اندر کی طرف بھینچ گئے۔ پھر اُس نے کوشش کر کے اور آنکھیں بند کر کے اپنے اوپر قابو پالیا۔ ایک حزیں مسکراہٹ اُس کے لبوں پر منڈلانے لگی۔ ایک افسردہ لہجے میں بولی۔

''نہیں میں خلیج کے اُس پار ہوں۔ جہاں لفٹ ہے اور ٹیلیفون ہے اور بٹن دبا کر کھلنے والا فلیٹ ہے اور اسفالٹ کی سڑک پر چلنے والا موٹر کار کا انجن ہے۔ میرے لیے نہ پھولوں کی آغوش ہے، نہ چنار کا سایہ، نہ بہتے پانی کی راگنی۔ میں وہاں ہوں جہاں جذبے دستانے کی طرح بدل دیئے جاتے ہیں اور آخری سچائی صرف ایک چیک بک ہے۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میں نے جین کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے چند لمحوں کے لیے اُن کی آواز میں ایک پُرخلوص درد ابھر آیا تھا۔

شکنتلا جواب تک خاموشی سے سگریٹ پی رہی تھی، اس کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے۔ میں سون مرگ کی جانب سے ایک بس کو آتے دیکھ رہی ہوں۔''

جین اپنی کہنیوں پر اُٹھ کر بولی۔ ''کہاں۔کہاں؟''

شکنتلا بولی۔ ''بس ایک موڑ پر غائب ہو چکی ہے۔''

جین نے اُٹھ کر سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑ لیا۔ بولی۔

''چلو۔چلیں۔ممکن ہے یہ بس مل جائے۔''

تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہم سڑک کے کنارے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور بس روکنے کا اشارہ بھی دے دیا۔ بس رک گئی۔ شاید نہ رکتی، مگر ایک سفید فام لڑکی کو دیکھ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے تگنے پیسے لے کر سری نگر تک لے جانے کا وعدہ کر لیا۔ ہم لوگ بس میں بیٹھ گئے۔

جب بس میں بیٹھ گئے تو میں نے جین سے کہا۔ ''آج رات پرنگ میں آرام کرتے۔ گیسٹ ہاؤس سے ٹیلیفون کر کے پرائیوٹ ٹیکسی منگوا لیتے۔ آرام سے چلتے۔!''

جین بولی۔ ''آج کی رات اگر پرنگ میں رہتے تو شاید زندہ نہ رہتے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

جین بولی۔ ''اگر میرا اندازہ صحیح ہے تو تمہیں اس کا ثبوت راستے میں دے دوں گی۔''

پھر گاندربل سے چند میل ادھر ہم نے وہی سلور بلو بس دیکھی، خالی اور اس کا ڈرائیور اُسے تیزی سے چلا کر ہمارے قریب سے گذر گیا۔ پرنگ کی طرف واپس جا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ارے یہ تو وہی بس ہے۔''

''ہاں۔'' جین بولی۔ ''ہماری تلاش میں واپس جا رہا ہے جب تک ان پانچ گوجروں کا باڈی گارڈ ہمارے ساتھ تھا، وہ کچھ نہ کر سکا۔ اب وہ پرنگ کے گیسٹ ہاؤس کی طرف جا رہا ہے کیونکہ میں نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ ہم لوگ رات کو وہیں رہیں گے۔''

میں نے جین کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔

چند میل اور آگے جا کر ہم نے ماجد کی گاڑی کو پہچان لیا۔ صبیحہ گاڑی چلا رہی تھی اور ماجد اپنا پائپ سلگانے میں مصروف تھا۔ اُن دونوں نے مجھے نہیں دیکھا اور دیکھتے بھی کیسے۔ ہم لوگ تھرڈ کلاس ٹائپ کے مسافروں سے بھری ہوئی بس میں بند تھے۔!

''بیچارے۔!'' شکنتلا اپنی انگلیاں چٹخارتے ہوئے بولی۔ ''پرنگ پہنچ کر بڑے

حیران ہوں گے، جب ہمیں وہاں نہ پائیں گے۔"

میں نے "مگر یہ دونوں ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟"

شکنتلا بولی۔ "شاید ہم سے محبت کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کبھی کبھی پہلی ملاقات ہی میں ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔"

پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

میں نے کہا۔ "مجھے بہر صورت اپنے احمق ہونے کا احساس ہے جو میں اتنی جلدی معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا، مگر تیسرا پارٹنر ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی معلوم کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"تمہارا حق تمہیں سری نگر پہنچ کر مل جائے گا۔" جین نے میرا شانہ تھپتھپا کر کہا۔

میں نے باہر دیکھا۔ بس ایک یوموڑ سے نکل رہی تھی۔ سامنے اخروٹوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا ایک مندر نظر آیا۔ دو کشمیری عورتیں پوجا کی تھالی اُٹھائے مندر کے اندر جا رہی تھیں۔ پھر چند کھیت نظر آئے جن میں لبالب پانی بھرا ہوا تھا۔ پھر گوجروں کا ایک قافلہ نظر پڑا۔ ایک سانولی گوجر لڑکی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی۔ ایک میمنے کو گردن پر لٹکائے چلی جا رہی تھی...... مرجینا؟ میں نے پوچھا۔

☆☆☆

اب ہم پھر سری نگر میں تھے۔ پیلس ہوٹل میں میرے کمرے میں اور وہ سوٹ کیس ہم تینوں کے سامنے کھلا تھا۔

یہ سوٹ کیس زیادہ تر امریکی ڈالروں اور انگریزی پونڈ کے نوٹوں اور کچھ ہندوستانی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔ سبھی اعلیٰ سطح کے نوٹ تھے۔ صاف ستھرے، عمدہ اور کرکرے، ہاتھ لگانے سے طرح طرح کے جذبے اور خیال ابھرتے تھے۔ طرح طرح کی تصویریں، امیدیں اور خواہشیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ میں کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے اُن کاغذ کے نوٹوں میں فوٹوگراف کی پلیٹ کی طرح کندہ ہے۔ ہاتھ لگانے سے جذبے ابھرتے ہیں۔ خیال دوڑے دوڑے آتے ہیں۔ تصویریں بنتی ہیں اور دھنک کے سارے رنگ فضا میں بکھرنے لگتے ہیں۔ کسی اعلیٰ کمپیوٹر کی طرح یہ انسانی ہاتھ پاؤں کو...... چلانے

لگتے ہیں۔ یہ صرف ہاتھ پاؤں ہی نہیں۔ ذہن بھی چلنے لگتا ہے۔ تخیل کو مہمیز اور تصور کو رنگ ملتا ہے۔ کسی ہائی وولٹیج مشین کی طرح، ان میں بجلی سے بڑی طاقت ہے۔ میرے ہاتھ چند لمحوں تک بے اختیار ان کاغذی سطحوں پر دوڑتے رہے اور میرے دماغ میں ایک نئے ڈھنگ کی عمارت کا نقشہ ابھرتا گیا جس کی بائیسویں منزل پر میرا، ٹیرس فلیٹ تھا۔ ذہن میں اس ٹیرس فلیٹ میں رنگ بھرنے لگا...... یکا یک جین نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا بولی۔

"گن لیے؟"

"ہاں گن لیے۔" میں نے جواب دیا اور وہ بلڈنگ میرے دماغ کی سیٹ سے غائب ہوگئی اور پھر انہی کاغذی پرزوں پر میں جا کر غائب ہوگئی مگر مجھے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ بلڈنگ اور اُس کے اندر میرا ٹیرس فلیٹ انہی کاغذی پرزوں کے اندر کسی مقناطیسی ٹیپ کے طرح محفوظ تھا۔

"کتنے کے ہیں؟" جین نے پوچھا۔

"بارہ لاکھ کے ہیں۔ ہندوستانی کرنسی کے حساب سے۔"

جین نے نرمی سے میرا ہاتھ سوٹ کیس سے ہٹا دیا اور نیچے کا ایک بٹن دبایا۔ بٹن دباتے ہی نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کا تین چوتھائی خانہ اوپر اُٹھنے لگا اور اوپر اُٹھ کر سوٹ کیس کے اوپر کی سطح سے چپک گیا۔ نیچے جو خانہ برآمد ہوا اسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ یہ خانہ رنگا رنگ کے ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا!

جین کی آواز میں اور نگاہوں میں ایک قاتلانہ چمک تھی۔ بولی۔ "یہ چھ لاکھ کے ہیرے ہیں۔"

شکنتلا کی بے تاب انگلیاں ان ہیروں سے کھیلنے لگیں۔ کبھی وہ ان ہیروں کو اپنی مٹھی میں دبا لیتی، کبھی کھول کر خانے میں بکھیرنے لگتی۔ کبھی انگلیوں کے لمس سے ان ہیروں کے اندر کی پوشیدہ قوت کو جگانے کی کوشش کرتی۔ جیسے وہ ہیرے نہ ہوں، جنات کی فوج ہو جو اس کے ہاتھ کے اشارے سے حرکت میں آجائے گی اور دنیا کے نوادرات لا کر شکنتلا کے قدموں میں نچھاور کر دے گی۔

میں نے کہا۔ "بارہ لاکھ نقد اور چھ لاکھ کے ہیرے؟"

"ہاں۔" جین نے سر ہلایا۔

اور یہ اس سڑی بوٹی کی قیمت؟ اٹھارہ لاکھ؟ جیسے میرا ذہن سے باور کرنے پر تیار نہ ہو۔ "اٹھارہ لاکھ؟ اٹھارہ ہزار کے سرمایہ سے اٹھارہ لاکھ اور ایک دن میں؟ ایک جنگلی بوٹی سے بھرے ہوئے پندرہ بوروں کی قیمت اٹھارہ لاکھ؟" میں نے سوچا۔ آدمی عام آدمی کوئی ایک عام آدمی اپنے پھٹے دنوں اور تار تار راتوں کو جوڑ جوڑ کر چندی سے چندی ملا کر زندگی بھر اپنی قسمت کا جامہ تیار کرتا ہے۔ پھر بھی اس کا ایک چوتھائی ایک آٹھواں حصہ ایک دسواں حصہ بھی نہیں کما سکتا اور یہاں پر میرے سامنے ایک دن میں بلکہ ایک دن کے چند لمحوں میں چند بورے اِدھر سے اُدھر گئے اور اٹھارہ لاکھ مل گئے اور وہ لوگ محنت کرتے ہیں اور ایک ایک رگ سے خون پسینہ کشید کرتے ہیں اور کڑھتے ہیں، کراہتے ہیں، جھینکتے ہیں اور جھلاتے ہیں۔ تب بھی دن بھر صبح و شام کو نان نفقہ تک تیار نہیں کر سکتے اور یہاں آنکھ جھپکتے اٹھارہ لاکھ؟ یہ کیسی خدائی ہے؟ میرے مالک؟ میرے ذہن میں گوجر آئے جنہوں نے جنگل جنگل ڈھونڈھ کر ذرہ ذرہ شہد حاصل کرنے والی مکھی کی طرح اس بوٹی کو چنا اور پھر کسی شہد کے چھتے کی طرح ایک بوری میں بند کیا اور پھر اسے سارے شہد کو ملکہ مکھی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ملکہ مکھی...... جین تم ملکہ مکھی ہو اور وہ سب لوگ ملکہ مکھی ہیں جو اوپر کے خانے میں رہتے ہیں جن کے ہزاروں شہد کی مکھیاں دن رات غلاموں کی طرح محنت کرتی ہیں۔ آؤ وہ کھیت گنیں۔ کارخانوں اور ذخیروں کی تعداد معلوم کریں۔ ربن کی طرح کھلنے والی سڑکوں کا شمار کریں اور ان تمام گلیوں، بازاروں، چوکوں، دو کانوں تاریک مکانوں اور غلیظ جھونپڑیوں کا شمار کریں۔ جن میں انسانی مخلوق شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتی ہے اور ذرہ ذرہ شہد جمع کر کے کسی چھتے میں ملکہ مکھی کے لیے رکھ کے خود بھوکی سو جاتی ہے۔ ہم نے فطرت سے بھی غلامی ہی سیکھی۔ پھول کی طرح خوشبو اور شہد بکھیرنا نہ سیکھا۔" پکنس۔! زور کی آواز میرے کان میں آئی۔ یہ شکنتلا کی چیخ تھی اور میرے سارے سنجیدہ خیال اس آواز کی خوشی میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

اب جین اور شکنتلا کمرے کے غالیچے پر خوشی سے ناچ رہی تھیں۔ چند لمحے تو میں بیڈ پر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اتر کر اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان میں شامل ہو گیا۔ ۱۱

دونوں اب میری بغل میں تھیں اور ہم تینوں خوشی سے ناچ رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے آدھے گھنٹے میں ہم تینوں نے اپنا اپنا حصہ الگ کرلیا۔ تینوں کے حصے میں چار چار لاکھ کے نوٹ آئے جواہرات کے بھی تین حصے کرلیے گئے۔ میں نے دو لاکھ نقد ہندوستانی کرنسی کے نوٹ ہوٹل کے لاکر میں رکھوا دیئے اور فارن کرنسی کے نوٹ اپنے پاس رکھے اور جواہرات بھی۔ سوچا کل اسٹیٹ بینک جا کے باقی رقم اور جواہرات کو بھی وہاں لاکر میں رکھوادوں گا۔!

جین اور شکنتلا بھی اپنا اپنا حصہ لے کر چلی گئیں اور کوئی دو گھنٹے کے بعد واپس آئیں۔ میں نے مشورہ دیا کہ آج رات نگین جھیل پر بسر کی جائے مگر جین نے اُس کے خلاف مشورہ دیا۔ "جب اتنی رقم اپنے پاس ہو تو کمرے کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔" بات معقول تھی اس لیے یہ سوچا کہ جشن میرے کمرے ہی میں منایا جائے گا۔ پورا پراجیکٹ بڑی خوش اسلوبی سے اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ اس میں زیادہ دخل جین کی ذہانت کو تھا مگر خاموشی اور بظاہر کاہل اور کم گو شکنتلا اس کی بہترین مددگار تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اگر جین تلوار تھی تو شکنتلا اُس کی میان۔ جس طرح اُس نے ڈرائیور کی بدنیت بھانپ کر بس میں پستول نکال لیا تھا اس سے اس کی ہوشیاری کا اندازہ ہوتا تھا۔

گل مرگ کی آرگی کے بعد مجھے آرگی کا چسکا پڑ گیا مگر اس کے بعد اس کا موقع نہیں آیا۔ اس لیے آج کا جشن بہترین ہونا چاہیے کیونکہ ہم تینوں کا موڈ خوشگوار تھا۔ دل میں سکون اور ذہن میں اطمینان موجود تھا۔ میں نے جشن کا سارا انتظام جین کے سپرد کردیا کیونکہ تجربے سے معلوم ہوچکا تھا کہ وہ دعوت کا اعلیٰ ترین ذوق رکھتی ہے اور اس ذوق سے اعلیٰ ترین لطف بنانے کی حس شکنتلا رکھتی ہے۔ شکنتلا کے جسم میں جنسی تعیش کی مکمل غنائیت ہے۔ سپردگی کی موسیقی کا پورا سرگم ہے جو میں نے بہت کم عورتوں میں پایا ہے۔ عورتیں کچھ باقی رکھتی ہیں، کچھ بچالیتی ہیں۔ شکنتلا بھی ہر وقت گریز سے کام لیتی رہتی ہے۔ باقی رکھتی جاتی ہے۔ بچاتی جاتی ہے۔ پھر سب کچھ ایک لمحے میں لٹا دیتی ہے۔ دوسری طرف جین کو ہر وقت اپنے جسم کا مکمل احساس رہتا ہے۔ پورا کنٹرول رہتا ہے۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو مرد

کے سپرد کر دیتی ہے لیکن دراصل وہ ہر لحظہ اسے اپنے قابو میں رکھتی ہے۔ وہ خود سرگم نہیں بن سکتی بلکہ مرد کو ایک سرگم کی طرح بجاتی ہے۔ یہ دو عورتوں کا مختلف مزاج آرگی کی زیر و بم پیدا کرتا ہے اور اس کے تنوع اور کیف و کم میں اضافہ کرتا ہے۔

میرا کمرہ ونگ کے آخری کونے پر تھا اور ان دونوں کے کمرے کے ساتھ ساتھ ملحق تھے۔ اس لیے یوں سمجھیے کہ ونگ کا آدھا حصہ اپنے تصرف میں تھا۔ کچھ دیر تو ہم کرسیاں اور میز باہر برآمدے میں لگوا کر غروب آفتاب کے نظارے کے منتظر رہے۔ نیچے لان میں فوارے چل رہے تھے اور اوپن بار کے گرد بمبئی سے آئے ہوئے فلمی ایکٹروں اور ایکٹریسوں کا جمگھٹا تھا۔ لان کے نیچے بولے وا کی کی خم کھائی ہوئی سڑک کے کنارے ڈل کا پانی چمک رہا تھا اور غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ گلنار ہوتا جا رہا تھا۔ شفق کی شہابی خوبصورتی حسین عورتوں کے چہروں کی چمک کو دوبالا کرنے لگی اور شام کی ہوائیں پھولوں کے عطر میں ڈوبی ہوئی ان کے بدن سے اٹھکھیلیاں کرنے لگیں اور دور کہیں مدھیہ پردیش میں یا اوڑیسہ میں یا بہار میں یا مہاراشٹر میں یا آندھرا کے کسی گاؤں کے چھپر میں اندھیرا تھا اور چولہا سرد تھا اور کوئی ماں اپنے چار بچوں کو گلے سے لگائے رو رہی تھی کیونکہ ان کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا تو میں کیا کروں۔ پرانے شاستروں میں دو ہزار برس پرانے بہار کے قحط کا ذکر ملتا ہے۔ یہ تو ہندوستان کے غریبوں کی قسمت ہے۔ میں اس قسمت کو کیسے بدل سکتا ہوں جب کہ پچیس برس کی آزادی بھی ان کی قسمت کو نہیں بدل سکی۔ صرف اتنا ہوا کہ محل ہوٹل بن گئے اور مہاراجے بزنس مین اور فلمی ایکٹر مہاراجے بن گئے اور گورے زار چلے گئے اور ان کی جگہ کالے زار آ گئے۔ بھئی میں تو ان سب لوگوں سے بیزار ہوں۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔ ابھی تو صرف چھ لاکھ میری انٹی میں ہے۔ دوسرے پراجیکٹ میں دس لاکھ اور ملے گا۔ تیسرے پراجیکٹ میں بیس لاکھ ملے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ دو یا تین کمروں کے نیم تاریک فلیٹ بناتا پھروں جن میں کوئی سبرامینم، کوئی کھیمکے، کوئی مشرا کوئی اُجاگر سنگھ اپنی مفلوک الحال فیملی کو لا کر رہے گا اور صبح سے شام تک ایک بدرنگ، بے آسرا، بے ڈول، بدہیئت زندگی کے چکر میں ایک اندھے بیل کی طرح گھومتا پھرے گا۔ میرے دل میں ان بدقسمت لوگوں کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے، جو ڈھائی ہزار سال میں اپنی

قسمت نہیں بنا سکے۔ یہاں اس وقت میرے سامنے جھیل کا پانی چمک رہا ہے اور بلوری جام میں شاملی ۱۰۹ کی لطیف وائن چھلک رہی ہے اور کبھی میرے ہاتھ میں بنفشی آنکھوں والی حسینہ کا ہاتھ آ جاتا ہے اور کبھی سیاہ رات کی طرح گہری سوز میں ڈوبی ہوئی آنکھوں والی حسینہ کی گرمانے والی مومئی انگلیاں میری گردن کے خم سے کھیلنے لگتی ہیں۔ جہنم میں جائے سوشلزم اور اخوت اور مساوات کا وہ خواب جو میں نے کبھی کالج کے زمانے میں دیکھا تھا۔ جہنم میں جائیں وہ سارے آدرش جن سے کبھی میرے روح کا آتش کدہ روشن تھا۔!

پھر جب ردائے شب تاریکیاں بکھیرنے لگی اور ڈل کے پانیوں سے سرد ہوا کے جھونکے آنے لگے تو شکنتلا نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

''میرے خیال میں اندر چلنا چاہیے۔''

جین اپنی کرسی سے اُٹھ کر بولی۔ میں نے بیروں کو اندر کے لیے سب سامان لانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ اب ہم دونوں جاتی ہیں اور لباس تبدیل کر کے تمہارے کمرے میں آ جاتی ہیں۔

اتنا کہہ کر وہ دونوں چلی گئیں۔ میں اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

بیرے تمام اشیاء اور مشروبات رکھ کر چلے گئے۔ ٹراوٹ کے تلے ہوئے ٹکڑے اور کانٹی کباب اور چین کے تکے اور بھرے ہوئے سپینی زیتون اور دو بوتلیں رائیل سیلوٹ وہسکی کی۔ دنیا کی سب سے مہنگی وہسکی ایک ہزار روپے کی ایک بوتل میرا موڈ ایسا تھا کہ میں آج رات کے لیے ایک لاکھ خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔

پھر وہ دونوں آ گئیں۔ شب خوابی کا لباس پہنے ہوئے جین نے سیاہ لیس کا گون پہن رکھا تھا جس میں اُس کے بدن کی چاندنی چھن چھن جاتی تھی اور شکنتلا نے نیم اودے رنگ کی لیس کی نیکسلی جی پہن رکھی تھی۔ جین کے گون کا سینہ کھلا تھا اور شکنتلا کا لباس کمر کے نیچے سے شق ہوتا تھا جس سے میں کبھی تو جین کا سینہ اور کبھی شکنتلا کی رانیں دیکھ سکتا تھا۔!

تو پھر میں کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔!

''تو مجھے ایک تگڑا ڈرنک چاہیے۔''

اتنا کہہ کر میں نے رائیل سیلوٹ کا ایک بڑا پیگ اپنے گلاس میں انڈیل لیا۔ میں دھیرے دھیرے سرور کا عادی ہوں اس لیے وہسکی کے ساتھ سوڈا استعمال کرتا ہوں آدھا سوڈا اور آدھی بسلیری جین برف کی ٹکڑیوں پر وہسکی ڈال کر چسکی لینے لگی۔

شکنتلا نے بھی ایسا ہی کیا۔

میں نے کہا۔ ''محسوس ہوتا ہے کہ تم دونوں جلدی مستی میں آجانا چاہتی ہو۔''

جین بولی۔ ''نہیں ایسا نہیں ہے۔ رائیل سیلوٹ ایسی وہسکی کا پورا مزہ لینا چاہتی ہوں۔ اسے پانی سوڈا یا بسلیری سے مکس نہیں کروں گی۔''

شکنتلا مسکرا کر بولی۔ ''ان برف کی ٹکڑیوں کو وہسکی میں پگھلتا دیکھ کر مجھے خود اپنا بدن پگھلتا محسوس ہوتا ہے۔''

جین بولی۔ ''کاش ہم پیرس میں ہوتے، اس وقت تو بہترین فرانسیسی شراب کے ساتھ اوئے سٹر کھول کر کھاتے، مجھے اوئے سٹر بہت پسند ہیں۔''

''آخری مرتبہ تم پیرس کب گئیں تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''چند ماہ پہلے گئی تھی۔'' جین نے جواب دیا۔ ''صرف پندرہ روز کے لیے وہاں۔ ''لاسٹ ٹینگو ان پیرس۔ (Last Tango in Paris) دیکھا تھا۔''

''سنا ہے اس تصویر میں محبت کرنے والے مکھن کا بہت استعمال کرتے ہیں۔''

ہاں، مگر یہی نہیں۔ اب تو پیرس کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں نو بیاہتا جوڑوں کے لیے جو ہنی مون منانے پیرس آتے ہیں اور ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں ان کے کمروں میں پہلے سے مکھن کی ڈلیاں لا کر رکھ دی جاتی ہیں۔''

''مگر میں نے سنا ہے اس فلم کے آخر میں ہیروئن ہیرو کو گولی مار دیتی ہے۔''

''ہاں۔'' جین نے خوشی سے سر ہلایا۔

میں نے شکنتلا سے پوچھا۔ ''وہ ریوالور کیا اب تک تمہارے پرس میں ہے؟''

شکنتلا ہنسی۔ اس نے بیگ کھول کر ریوالور مجھے دکھایا بلکہ میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔ ''اسے تم آج رات اپنی الماری میں رکھ دو۔ میں نہیں چاہتی آج کی رات کسی کے دل میں کسی طرح کا شبہ پیدا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''شبہے تو بہت سے میرے دل میں ہیں اور بہت سے سوال بھی ہیں، جن کے متعلق مجھے پوچھنے کا حق ہے؟''

''اب تم پوچھ سکتے ہو؟'' جین بولی۔

''ہنری کارٹز وائیلڈ کون ہے؟''

''وہی سلور بلو بس کا ڈرائیور، ہنری کارٹز وائیلڈ تھا۔ مشہور انٹرنیشنل اسمگلر ہے۔ پکنی بوٹی کی مقدار جو اس نے ہم سے خریدی ہے اور قیمتی رقم جو اُس نے ہمیں دی ہے وہ اسے چوگنی بلکہ چھ گنی قیمت اس کی وصول کرے گا۔!''

''نہیں جان وہ ان سکھائی ہوئی بوٹیوں کو بڑی آسانی سے کسی مسکسی میں ڈال کر ان کا سفوف بنائے گا اور اس سفوف کو نیو یارک لے جا کر بیچ دے گا۔ ہو سکتا ہے بمبئی میں کسی کے ہاتھ بیچ دے۔''

''تم اس سے قدر ڈرتی کیوں تھیں؟''

''جب تک رقم ہاتھ میں نہ آجائے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

شکنتلا بولی۔ ''وہ پچھلے سال سے کوشش کر رہا ہے کہ سراغ نکالے گی کہ کہاں سے ہم بوٹی حاصل کرتے ہیں تا کہ آئندہ سال وہ ہمیں راستے سے ہٹا کر خود سپلائی کرنے والوں سے سستے داموں سودا کرلے مگر ابھی تک اسے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ پچھلے سال ہم نے اس گلمرگ میں سودا کیا تھا۔ اس سال پرنگ میں کیا ہے۔ اگلے سال ممکن ہے کھاٹ منڈو میں معاملہ ہو جائے۔ جہاں تک ہو سکے ہم اسے اُس کا سراغ ہاتھ نہ لگنے دیں گے۔''

''تم نے بس میں اس وقت پستول کیوں نکالا تھا؟'' میں نے شکنتلا سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے اس کے پاس بھی ریوالور تھا۔ پانچوں گوجر تو نہتے تھے۔ میرا خیال ہے رقم دے کر وہ واپس بس میں آ کر ہمیں ریوالور دکھا کر ہم سے رقم چھین لینا چاہتا تھا یا ممکن ہے کہ گوجروں کو ذرا دھمکا کر ان سے اکبر خاں کا پتا پوچھ لینا چاہتا ہو مگر میں پہلے سے تیار تھی۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا نشانہ سیدھے اس کے سینے کی طرف تھا۔ میرا اندازہ اُس کے لیے غیر متوقع تھا کہ وہ بروقت اپنی جیب سے پستول نہ نکال سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتا میں اسے ختم کر دیتی!''

میں نے شکنتلا کا رخسار چھو کر کہا۔ ''دیکھنے میں تو اس قدر میٹھی معلوم ہوتی ہو نرم اور ملائم۔''

شکنتلا ہنسی۔

جین بولی۔ ''مگر ہنری باز نہیں آیا۔ وہ ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کے لیے لوٹ رہا تھا۔ وہ یہ باور ہی نہیں کر سکا کہ ہم لوگ ایک معمولی کھٹارہ سی بس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ اُس کی نگاہیں کسی موٹر کار کو ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آج کی رات ہمیں الیکٹرک سٹی ڈیپارٹمنٹ کے گیسٹ ہاؤس میں پا کر حملہ کر دیتا۔ ہنری بڑا خطرناک آدمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور ماجد اور صبیحہ؟ وہ بھی تو پرنگ جا رہے تھے۔''

''ہمیں تلاش کرتے ہوئے۔'' جین نے مسکرا کر کہا۔ ''ممکن ہے ہمیں پرنگ میں نہ پا کر سون مرگ تک جائیں۔ بہرحال کل دن میں کسی وقت وہ ضرور واپس آ جائیں گے۔ کل دن میں اُن سے ملاقات ہو گی۔''

''وہ ہمارا پیچھا کیوں کر رہے ہیں؟''

جین سوچ کر بولی۔ ''دو تین طرح کے اندازے ہیں میرے۔ مگر صحیح اطلاع میں تمہیں کل ہی دے سکتی ہوں۔ ان کے واپس آنے کے بعد۔''

میں نے پوچھا۔ ''اچھا اب اگلا پروگرام کیا ہے؟''

میرے اس سوال پر دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں، دیر تک ہنستی رہیں حتیٰ کہ میں احمق سا دکھائی دینے لگا۔!

''آخری بات کیا ہے؟'' میں نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔!

''شکنتلا بولی۔'' ''ہم نے شرط لگائی تھی۔ میں ہار گئی۔''

''کس بات کی شرط؟''

''میں نے جین سے کہا تھا کہ تم اپنے حصہ لے کر الگ ہو جاؤ گے۔ جین کہتی تھی نہیں۔ اُس کے منہ کو خون لگ جائے گا۔ وہ تو دوسرے پراجیکٹ کے لیے گھٹنوں کے بل چل کر آئے گا۔''

''جین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آرکی ٹیکٹ کے پیشے میں کیا رکھا ہے۔

سال میں لاکھ نہیں تو دو لاکھ۔ وہ بھی ایک ذہین آرکی ٹیکٹ کے لیے اور اس کے لیے بھی ہزار تگڑیں کرنی پڑتی ہیں۔ ایک پراجیکٹ کے لیے دس اُمیدواروں میں مقابلہ ہوتا ہے، ایک سے ایک قابل۔ اس لیے سفارش بہت چلتی ہے۔''

جین نے پوچھا۔ ''یہاں تم نے بیس ہزار لگائے اور چھ لاکھ کمائے۔ یعنی ایک ملے میں تم لکھ پتیوں کی فہرست میں آ گئے۔ ایسا دھندا تم نے کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں۔ میرے تو خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ اتنی رقم ملے گی۔''

جین بولی۔ ''سفید دھندے میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ انکم ٹیکس ہی کمر توڑ ہے۔ ایک نمبر کی کمائی میں جینا بھی مشکل ہے۔ اس لیے دو نمبر کا دھندا دن بہ دن بڑھ رہا ہے سنتے ہیں کہ دو نمبر کی اکانومی میں بائیس ہزار ارب روپے لگا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب اگر میں ان چھ لاکھ روپوں کو سفید دھندے میں لگاؤں تو مجھے بچے گا کیا؟ اس لیے بہر حال اسے کالے دھندے میں لگانا پڑے گا۔ یعنی کسی دوسرے پراجیکٹ میں اور وہ تم بتاؤ گی کیونکہ میں اس میدان میں اناڑی ہوں۔''

شکنتلا بولی۔ ''اب پکنس بوٹی کا دھندا تو اگلے سال تک تہہ کر رکھو۔ اس سال اس میں سے جو ملنا تھا مل چکا۔''

جین بولی۔ ''میری نظر میں دو ایک دھندے اور ہیں جن میں روپیہ لگا کر اچھی کمائی کی جا سکتی ہے مگر اس کے لیے ہمیں بمبئی جانا پڑے گا اور ہنری کائنز وائیلڈ سے ملنا پڑے گا۔''

''پھر ہنری کائنز وائیلڈ؟'' میں نے پوچھا۔ ''ابھی تو تم اس کو خطرناک بتا رہی تھیں۔''

''خطرناک تو ہے وہ اور اس دھندے میں کون خطرناک نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر خدشے ہیں۔ خطرہ ہے۔ ڈبل کراس ہو سکتا ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ مگر بمبئی جانے سے پہلے میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم سنجیدگی سے ہمارے ساتھ آنے کا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''سوچ ہی نہیں رہا ہوں، ارادہ کر لیا ہے کہ آرکی ٹیکٹ کے دھندے کو خیر باد کر دوں گا اور تم دونوں کے ساتھ کام کروں گا!''

''زندگی بھر کے لیے؟''

"زندگی بھر کے لیے۔"

"ہمارے ساتھ؟" جین نے اصرار کیا۔

"تم دونوں کے ساتھ۔" میں نے شدت سے کہا۔

"ہرے، زندگی بھر کے لیے۔" جین نے گلاس اُٹھا کے کہا۔

ہم تینوں نے جام ٹکرائے اور مکھن ایسی ملائم وِسکی سے اس پارٹنر شپ کو مکمل کیا۔!

جین بولی۔ "اس کام میں ہر طرح کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ بڑے بڑے لالچ دیئے جائیں گے مگر تمہیں ہر قدم پر اپنے گروپ کے ساتھ وفادار رہنا ہوگا۔ وفاداری پہلی شرط ہے۔"

شکنتلا بیزار ہو گئی۔ "بھئی میں تو بور ہو گئی تم لوگوں کی شرط سے میری شرط یہ ہے کہ اس معاملے پر گفتگو نہ کی جائے۔ اس رات کو تباہ نہ کیا جائے" پھر میری طرف مست نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ "اب اگر مجھ سے پیار کرنا چاہتے ہو تو میرے جام سے پیو۔"

میں نے شکنتلا کے جام سے دو گھونٹ لیے۔ پھر جین کے جام سے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ پھر جین کے جام سے پیا اور اُس کا جام بھی خالی کر دیا۔ یکا یک خون کی گردش تیز ہو گئی اور جب وہ دونوں میری طرف پیٹھ کر کے میز کی طرف آگے جھک کے اپنے خالی جام بھرنے لگیں تو میں نے اُن کی پیٹھ کے زپ کھول ڈالے اور جب اُنہوں نے مجھے نہیں روکا تو میں نے اُن دونوں کے بال کھول ڈالے جین کے فلیکسن بال اور شکنتلا کے گہرے سیاہ بال لٹک کر کمر تک لہرانے لگے۔ وہ دھوپ کی کرنوں کی طرح نورانی بال اور رات کی ملائم تاریکی کی طرح سیاہ بال۔ ایک طرف دن۔ دوسری طرف رات اور اُن کے بیچ دونوں کی کمر تک ننگی جلد کا چکنا مرمر۔

مرمر...... مرمر...... مرمر......

بھنور...... بھنور...... سرور...... سرور...... بھنور...... بھنور...... دن، رات میں گم ہو گیا، اور رات احساس میں پگھل گئی، اور جب میں تربینی میں غوطے کھانے لگا۔ پھر ڈوب گیا۔ پھر ڈوب کر جو اُبھرا...... تو آنکھوں میں ترمزے ناچ رہے تھے اور رنگا رنگ دائرے ایک دوسرے کے اندر سے ابھرتے ہوئے احساس کی جلد پر بلبلوں کی طرح پھوٹ جاتے تھے۔

پھر آنکھوں میں گہری غنودگی چھا گئی۔!

پھر جب آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔!

☆☆☆

دودھیا سفید کمرہ، پلنگ پر سفید تکیئے، سفید چادریں نرس سفید لباس پہنے ہوئی اور ڈاکٹر بھی سفید کوٹ میں فضا میں ایک عجیب اجلے پن کا احساس تھا اور فنائیل کی بو جو مجھے ہمیشہ خوشبو لگتی ہے۔

ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی۔ میرے دل کا معائنہ کیا۔ میری آنکھوں کے پپوٹوں کو اندر سے ملاحظہ کیا اور مجھے خطرے سے باہر قرار دیا۔

''مگر تمہیں دو دن آرام کرنا ہوگا۔''

''مگر مجھے ہوا کیا تھا؟''

''تم یہاں بے ہوشی کی حالت میں لائے گئے تھے۔ آج سے چار دن پہلے۔'' ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔!

''آج سے چار دن پہلے؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

''ہاں اور چار دن اور چار راتیں تم بے ہوش رہے۔ تمہارے خون کے نظام میں کوئی دوا داخل تھی جس کا ہم پتا نہیں چلا سکے۔''

یکا یک مجھے پکنس کا خیال آیا اور پکنس کا خیال آتے ہی جین کی تصویر ذہن میں ابھری میں نے پوچھا۔ ''جین کہاں ہے؟''

''کون جین۔'' نرس بولی جس کا نام میگی تھا۔

میں نے جین کا حلیہ بتایا۔ اس پر میگی سر ہلا کر بولی۔ ''اس شکل وصورت کی کوئی عورت یہاں نہیں آئی۔''

''تو پھر شکنتلا آئی ہوگی۔'' میں نے میگی سے پوچھا اور اسے شکنتلا کا حلیہ بتایا۔

میگی نے سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں، اس شکل وصورت کی کبھی کوئی عورت آپ کو دیکھنے نہیں آئی۔''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ عجیب عجیب طرح کے وسوسے میرے دل میں آنے لگے۔ میں

نے پوچھا۔

"تو کیا مجھے دیکھنے کوئی نہیں آیا۔؟"

"نہیں ایک صاحب آئے تھے۔ مسلسل چار دن سے آرہے ہیں۔ اس وقت بھی باہر کے لاؤنج میں بیٹھے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب اجازت دیں گے تو بلالوں گی۔"

ڈاکٹر جس کا نام مجھے بعد میں نذیر احمد معلوم ہوا۔ بولا۔ "بلالو۔ مگر گھنٹے بھر سے زیادہ اگر وہ نہ بیٹھیں تو ٹھیک ہے اور میگی۔" ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔

"گلوکوز کی بوتل بدل دینا۔"

میں نے گلوکوز کی الٹی بوتل کی طرف دیکھا جو قطرہ قطرہ کر کے میری بائیں بانہہ کی رگ میں داخل ہورہی تھی۔ زندگی بخش گلوکوز۔!

جب ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلا تو نرس بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ چند منٹ کے بعد دروازے کا پردہ ہلا اور ماجد اندر آگیا اور میرے بستر کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے بشرے سے لگتا تھا کہ وہ واقعی میرے بچ جانے سے خوش ہے۔!

میں نے آتے ہی اُس سے پوچھا۔ "جین کہاں ہے؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔"

"مگر اب پوچھنا بے کار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جین اور شکنتلا نے صرف ہمیں ہی ڈاج نہیں دیا۔ تمہیں بھی دھوکا دیا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو اُنہوں نے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔"

تو وہ دونوں اسی دن کیوں غائب ہوگئی جس دن تم صبح بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال لائے گئے؟"

"کہاں گئیں وہ دونوں۔"

"یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی چلی گئیں۔ اتنا تو مجھے ائیر پورٹ سے معلوم ہوا۔ جب میں سون مرگ سے واپس پیلس ہوٹل آیا۔ ماجد نے بیان کرنا شروع کیا" تو تم ہسپتال آچکے تھے اور وہ دونوں عورتیں بہت جلدی میں اپنا بل چکا کے ائیر پورٹ جا چکی تھیں۔ میں جب ائیر پورٹ پہنچا تو جہاز کو اڑے ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب تم بتاؤ

کیا ہوا؟ کیا تمہاری ان سے کچھ کھٹ پٹ ہوگئی؟''

''کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔''دراصل ہمارے درمیان معاملے کی ایک بات تھی، وہ بخوبی ختم ہوگئی تو ہم نے سوچا تینوں مل کر جشن منائیں۔ اس رات ہم لوگ رات کے تین بجے تک جاگے پھر میری آنکھ لگ گئی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔''

''میرا خیال ہے اُنہوں نے تمہیں زہر دینے کی کوشش کی۔ شراب میں کچھ ملا دیا ہوگا۔''

''مگر کیوں؟ میں نے تو اُن کا کچھ بگاڑا نہیں تھا۔ اُلٹا اُن کی کچھ مدد ہی کی ہوگی۔''

''یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ معاملہ کیا تھا جس میں تم نے اُن کی مدد کی تھی ممکن ہے وہ معاملہ ایسا ہوا جس کی تہہ تک پہنچ جانے میں اُنہیں تم سے خطرہ ہو اس لیے اُنہوں نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔''

''تم چار دن تک کوما میں رہے مگر ڈاکٹر نذیر احمد کی کوششوں سے تمہاری جان بچ گئی۔''

میں چپ رہا۔

ماجد نے سٹرپ سل کی ایک میٹھی گولی منہ میں رکھ لی۔ بولا۔''کل سے گلے میں خراش سی ہے۔'' پھر ذرا رک کر کہا''تم ایک خطرناک گینگ کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ میں پچھلے سال سے اُن کا پیچھا کر رہا ہوں۔ پچھلے سال تو مجھے ذرا سا شبہ ہوا تھا مگر امسال تو وہ شبہ یقین کی حالت کو پہنچ گیا۔ میں نے گلمرگ سے سری نگر اور سری نگر سے یوس مرگ برابر جین کا پیچھا کیا۔ مگر جین مجھ سے زیادہ چالاک نکلی میں نے سمجھا اُس نے مجھ سے ڈر کر معاملے کی جگہ بدل دی ہے اور پرنگ کے بجائے یوس مرگ کا انتخاب کیا ہے مگر اُس نے معاملے کی جگہ وہی رکھی اور بیکار مجھے یوس مرگ تک لے گئی۔ یہ اُس کا سٹروک تھا۔ ایک دم بڑھیا، داد دیتا ہوں اس کی عقل کی اور پیشتر اس کے کہ میں واپس پیلس ہوٹل پہنچوں وہ کشمیر سے فرار ہوگئی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔''

میں نے پوچھا۔''تم کیا پولیس مین ہو؟''

''نہیں۔'' ماجد نے سر ہلا کے کہا۔

''پھر؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ام۔'' ماجد گولی چوستے ہوئے بولا۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ۔ میں تم کو سب بتا دوں گا بلکہ ایک اعتبار سے مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ جن دو عورتوں نے تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی، اُن کے لیے تمہارے دل میں کسی طرح کی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے کہا۔ ''مگر میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ اُنہوں نے کس لیے مجھے زہر دینے کی کوشش کی؟ ان کی یہ کوشش میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''وجہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔'' ماجد بولا۔ اس قسم کے معاملوں میں تمہارے ایسے شریف آدمیوں کو الگ کر دینا ہی کافی رہتا ہے۔''

''تو الگ کر دیتیں۔ میں خوشی سے الگ ہو جاتا۔ جان لینے کی کوشش کیوں کی؟''

''میں پہلے بتا چکا ہوں۔'' ماجد بولا۔ ''تم اس کا راز جو کچھ بھی جان گئے تھے۔ میں جان نہیں سکا مگر کچھ کچھ شبہ ضرور ہے۔ بہر حال اگر تم مجھ سے تعاون کرو گے تو معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس راز کی وجہ سے اُنہوں نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی۔''

''عجیب معمہ ہے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ پھر مجھے اپنے کمرے کا خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔

''میرے کمرے کا سامان محفوظ تو ہے؟''

''ماجد بولا۔'' جونہی مجھے معلوم ہوا کہ تم ہسپتال لے جائے گئے ہو اور وہ دونوں لڑکیاں فرار ہو گئیں ہیں میں نے تمہارے کمرے کو بند کروا کے باہر پولیس کا پہرہ بٹھا دیا ہے۔ یہ پہرہ دن رات رہتا ہے اور رہے گا، جب تک تم واپس پیلس ہوٹل میں نہیں آ جاؤ گے۔''

اب مجھے کچھ اطمینان سا ہوا۔

''لڑکیوں کے کمرے سے کچھ ملا؟'' میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سوال کیا۔

''پولیس نے بہت اچھی طرح سے اُن کے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ کوئی کام کا سراغ نہیں ملا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ لڑکیوں نے بڑی عجلت میں ہوٹل خالی کر دیا تھا۔ ایک برا ایک چپل دو تولیے ایک رومال، ایک فراگ، اور ایک سوکھی جھاڑی۔''

''سوکھی جھاڑی؟''

''ہاں۔'' ماجد اپنے ساتھ جو اخبار لایا تھا اُسے نہایت احتیاط سے کھولنے لگا۔ یہ

یکا یک ایک تیز بو میرے نتھنوں میں آئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ اخبار کے دو صفحوں کے اندر پکی کی سوکھی جھاڑ رکھی ہے۔

میرا دل کانپنے لگا۔ اگر اس وقت میں بول اُٹھتا تو میری زبان میں لکنت آ جاتی اس لیے میں کافی عرصے تک چپ رہا۔ پھر میں نے کہا۔

''تو پولیس اس جھاڑ کو کیوں نہیں لے گئی؟''

''اُنہیں خیال نہیں آیا ہوگا۔ اس سوکھی جھاڑی کو لے کے وہ کیا کرتے؟ ممکن ہے اس پر نظر نہ پڑی ہو کیونکہ میں نے اسے کمرے کے ایک کونے میں کارپٹ اور دیوار کے بیچ الجھے ہوئے دیکھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ سوکھی جھاڑی کوئی اہمیت رکھتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی مگر میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔!''

میرے جواب سے اُس کی تسلی نہیں ہوئی اتنا تو میں دیکھ سکتا تھا مگر اس سے زیادہ اسے اس وقت بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ بولا۔ ''تم دو دن آرام کرو۔ میں برابر آتا رہوں گا۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔''

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

وہ بولا۔ ''جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو پولیس تمہارا بیان لے گی۔''

''کس بات کا بیان؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ماجد نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں دیکھ لوں گا کہ یہ محض ضابطے کی کارروائی رہے۔ آخر پولیس کو یہ شبہ تو ہو سکتا ہے کہ تم نے خودکشی کی کوشش کی ہو۔''

''میں بھلا خودکشی کی کوشش کیوں کرنے لگا؟ میں ایک کامیاب آرکیٹیکٹ ہوں۔''

''وہ سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ماجد مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''میں دیکھ لوں گا۔ محض ضابطے کی کارروائی رہے گی۔ محض خانہ پری۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ کل پھر آؤں گا۔''

جب ماجد چلا گیا تو میں نے نرس کو بلایا اور اُس سے کہا۔ ''میں ڈاکٹر نذیر احمد سے

ملنا چاہتا ہوں۔ نرس بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب تو اب شام کو آئیں گے۔ ہاں اگر کوئی خاص بات ہو تو۔ کیا تم ٹھیک محسوس نہیں کر رہے ہو؟''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اُسے تسلی دلائی۔ ''ایک دو باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ شام کو پوچھ لوں گا۔''

شام کو جب ڈاکٹر آیا تو معائنے کے بعد میں نے اُس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب جو زہر مجھے دیا گیا تھا، کیا میں اس سے مر سکتا تھا؟''

ڈاکٹر کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ سوچ سوچ کے بولا۔ ''مر تو نہیں سکتے تھے، اتنا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ ہاں مگر دماغ، ماؤف ہو سکتا تھا۔ چار دن تم کوما میں رہے۔ اس کے بعد ڈیڑھ ماہ تک بیمار بھی رہ سکتے تھے۔ دس فیصدی مرنے کا چانس بھی تھا۔ یوں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آدمی شراب پی کر بھی مر سکتا ہے مگر یہ تمہارے خون کے نظام کو الکوحل کے علاوہ بھی کچھ اور چیز تھی۔ کوئی نئی ڈرگ...... شاید۔!''

مجھے وہ شام یاد آ گئی۔ مکمل طور پر حسین شام تھی۔ چھلکتے ہوئے جذبات والی رات تھی۔ سرگم کا کوئی سر غلط نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے پکنس دی گئی ہو۔ نئی ڈرگ اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اتنی مقدار میں دی گئی ہو جس سے میرا دماغ ماؤف ہو جائے۔ ہمیشہ کے لیے کچھ یاد نہ رہے۔ ہو سکتا ہے مجھے ختم کر دینے والی مقدار دی گئی ہو۔ قسمت نے بچا لیا مجھے مگر کیسی میٹھی، ملائم، محبت بھری گھات تھی اُن کی۔ اُن دونوں کی ایک تو اُن کا حُسن خطرناک تھا۔ جین کو میں ہوشیار ضرور سمجھتا تھا مگر وہ ہمیشہ مدہوش نگاہیں۔ شکنتلا کی؟ کسی طرح یہ باور کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ شکنتلا نے مجھے زہر دینے میں حصہ لیا ہو اور جس طرح جین کے بدن کا ساز میری انگلیوں کے لمس سے تھرکنے لگتا تھا۔ وہ کیا وہ سب جھوٹ تھا۔ یقین نہیں آتا۔ ہم تینوں کی تثلیث دہکتے شعلوں کی طرح فضا کو گرما رہی تھی اور ہم نے صرف زبان ہی سے نہیں آنکھوں سے رُخساروں سے، ہونٹوں سے، جسم کے انگ انگ سے۔ کہا تھا کہ ہم زندگی بھر اکٹھے رہیں گے۔ پھر کیا ہوا؟ ممکن ہے کوئی ایسی بات صبح کو ہوئی ہو جو جین اور شکنتلا کو فوراً بھاگ جانا پڑا۔ میں دل ہی دل میں اُن کی بے گناہی کے لیے راستہ ہموار کرنے لگا۔ شکنتلا نے کیسی حسرت ناک آواز میں گایا تھا۔

گلشن کا کاروبار چلے
بادِ نوبہار چلے، چلے بھی آؤ

وہ زیرِلب دھیمے دھیمے سروں میں بے ربط ٹکڑوں میں گا رہی تھی اور میں اُس کے جسم سے کھیل رہا تھا۔ کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ سب سالی مکاری؟ نہیں۔نہیں میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ آنکھ، ہونٹ، لمس، کی سچائیوں کو بھانپ سکتا ہوں۔ وہ لمحے سب سچے تھے۔ اچھا اگر وہ سب سچے تھے تو تم چار دن تک بے ہوش کیوں رہے؟ تمہیں اتنی مقدار میں اُنہوں نے پکنس کیوں دی؟ وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ دس فی صدی مرنے کا بھی چانس تھا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ پھر وہ تمہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر کیوں چلی گئیں؟ گزرگاہِ خیال میں ہزاروں وسوسے اور شبے ایک کے بعد ایک آتے گئے اور جاتے رہے ماجد نے کہا ہے۔ پولیس تمہارا بیان لے گی۔ میں کیا بیان دے سکتا ہوں۔ اگر تو زہرخورانی کا شبہ جین اور شکنتلا پر ڈالوں تو سارے معاملے کو آشکار کرنا پڑے گا۔ ممکن ہے اس صورت میں پولیس میرے حصے کے روپے اور جواہرات ضبط کر لے۔ اب میں جین اور شکنتلا کا بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے حکومت کو معلوم ہو کہ یہ دونوں لڑکیاں کسی خطرناک گروہ سے تعلق رکھتی ہیں، ممکن ہے جین مجھ سے غلط نہ ہو۔ حکومت کو پکنس کے بارے میں معلوم ہو چکا ہو کہ یہ ایک نشہ آور بوٹی ہے اور ہندوستان سے امریکہ بھاری قیمت پر جاتی ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے، مجھے سزا بھی ہو جائے۔ کچھ بھی ہو۔ مکمل ناواقفیت کا اظہار کرنا پڑے گا۔ اصل معاملے سے گریز کرنا پڑے گا اور جین اور شکنتلا سے اپنی دوستی کا اظہار کرنا پڑے گا۔ جتنی دوستی تک بھی جا سکتا ہوں، پولیس کیا کر سکتی ہے۔ یا اُسے بھی گول کر سکتا ہوں، ہاں مگر دل میں عجیب سی کسک رہ گئی ہے۔ اک حسرت ناک یاد اس رات کی۔ جین یہ تم نے کیا کیا؟ شکنتلا کیا تم نے بھی مجھے نہیں سمجھا؟ میں تو سچ مچ تم دونوں کا پارٹنر بننا چاہتا تھا۔ میرے لیے تم دونوں ایک تھیں کیونکہ تم...... تم دونوں میں ایک دوسرے کے لیے رشک و حسد کا شائبہ تک نہ تھا۔ بادِ نوبہار چلے۔ جانے کہاں اب بادِ نوبہار چلے گی اور کس کی بانہوں میں گلشن کا کاروبار آئے گا؟

دوسرے دن جب ماجد آیا تو میں نے اُس سے سوال کیا۔ ”کیا پولیس نے میرے

کمرے کی بھی تلاشی لی تھی؟"

"نہیں۔" ماجد نے جواب دیا۔ "مگر جب تم واپس ہوٹل میں جاؤ گے تو باقاعدہ تمہارے سامنے تلاشی لی جائے گی۔ دوسرے گواہ بھی موجود رہیں گے۔"

مجھے پسینہ آ گیا۔ اگر پولیس نے سوٹ کیس کھولا تو اُن کے ہاتھ وہ رقم پڑ جائے گی اور اس سے بھی خطرناک وہ ہیرے تھے جو میرے سوٹ کیس میں بند تھے۔ اتنے ہیرے میرے پاس کہاں سے آئے؟ کیا جواب دوں گا میں۔!

"کیا یہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے ماجد سے پوچھا کہ "پولیس میرے کمرے کی تلاشی نہ لے۔"

"یہ تو مشکل ہے؟ میں کوشش کر سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"اگر تم اتنا کر دو کہ جب میں ہوٹل جاؤں اور جب پولیس تلاشی لے تو اس کے درمیان مجھے دو گھنٹے کا وقفہ مل جائے۔ کیا اتنا بھی نہیں ہو سکتا؟"

"ماجد کیا نہیں ہو سکتا؟" وہ بڑے فخر سے بولا۔ مگر اس کے لیے تمہیں بعد میں مجھ سے تعاون کرنا پڑے گا۔ وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا!

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر......!

پھر میں نے کہا۔

"میں کروں گا۔"

"تو ہاتھ ملاؤ۔"

ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ اتنے میں میگی میرے لیے سوپ لے کر آ گئی۔ گلوکوز بند کر دیا گیا تھا۔ گرم گرم سوپ کا ذائقہ بہت عمدہ تھا۔ ماجد تھوڑی دیر اور بیٹھا۔ پھر جب اُس نے مجھے سو جانے کے لیے کہا۔ تو اُٹھ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے ایک دن کے لیے اور روک لیا۔ دوسرے دن جب اسے مکمل اطمینان ہو گیا تو اُس نے مجھے ہسپتال سے رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔ طے یہ پایا تھا کہ میں گیارہ بجے ہسپتال سے رخصت ہو جاؤں گا کیونکہ ساڑھے دس بجے ڈاکٹر مجھے آخری بار دیکھ لے گا۔

مگر دوسرے دن ماجد صبح آٹھ بجے ہی گاڑی لے کر آ گیا۔ میگی کو اُس نے زبردست ٹپ دیا تھا اس لیے میگی نے مجھے اس وقت جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ڈاکٹر سے سمجھ لے گی۔ اس میں کوئی مشکل بھی نہ تھی کیونکہ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میگی اور ڈاکٹر کا رومان پڑھ لیا تھا۔

''پھر بھی اس قدر جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے ماجد سے پوچھا۔

ماجد بولا ''تمہارے کمرے کے باہر کاریڈور میں ہر وقت پولیس کا ایک سپاہی ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ اس کے سامنے جاتے تو وہ ساتھ ہولیتا۔ یا اسی وقت پولیس لائن میں خبر کر دیتا۔ میں نے اُسے شاندار ناشتے کے لیے شاندار ٹپ دیا ہے۔ وہ ناشتے کے بعد آئے گا۔ کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں نے اُس سے کہا ہے کہ تم یہاں سے گیارہ بجے چلو گے۔ تین گھنٹے کا وقفہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟''

میں نے ماجد کا شکریہ ادا کیا، میگی نے مصافحہ کیا اور ماجد کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پیلس ہوٹل میں جو لوگ مجھے جانتے تھے، بیرے، ریسپشن کلرک، اسسٹنٹ مینجر سب نے مجھے مبارکباد دی۔ میں جلدی جلدی اُن کی مبارکباد قبول کرتا ہوا اپنے کمرے کی چابی لے کر اوپر کے ونگ میں چلا گیا۔ ماجد میرے ساتھ تھا، ساتھ ساتھ لگ کر چل رہا تھا۔!

کمرے کے باہر پولیس کا پہرہ تھا۔ سنتری نے آگے بڑھ کر ماجد کو سیلوٹ کیا ماجد نے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے سیلوٹ مار کر ونگ سے باہر چلا گیا۔

میں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا اور ایک قدم دروازے کے اندر رکھ کر ماجد سے کہا۔ ''بہتر ہے تم آدھے گھنٹے کے بعد آؤ۔ میں اتنے میں باتھ روم ہو لیتا ہوں۔'' ماجد نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ''تم سب کام پندرہ منٹ میں ختم کر لو تو بہتر ہے۔''

''اچھا۔''

جب ماجد چلا گیا تو میں نے بڑی احتیاط سے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پردے گرا دیئے۔ سوٹ کیس وارڈروب کے اندر سے نکال کر اس کو کھولا اور کپڑوں کی تہہ کے نیچے ٹٹولا۔

وہاں کچھ نہ تھا۔!

سارے کرنسی نوٹ اور سارے ہیرے غائب تھے۔

☆☆☆

سارا معاملہ میری سمجھ میں آ گیا۔ ان دونوں لڑکیوں نے مجھے واقعی زہر دیا تھا پکنس کی ایک بڑی مقدار مجھے کھلا دی تھی تاکہ میری بے ہوشی کے عالم میں وہ میرے چار لاکھ روپے اور ہیروں پر قبضہ کر کے رفو چکر ہو جائیں۔ خیریت گذری کہ پکنس کی اس مقدار ت میری موت واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی پوری رقم اُن کے پلے پڑی کیونکہ جین یا شکنتلا نے مجھے نصف رقم ہوٹل کے خزانچی کے پاس جمع کراتے نہیں دیکھا تھا!

مجھے رقم کے چلے جانے کا غم نہیں تھا۔ غم کچھ عجیب طرح کا تھا۔ جین اور شکنتلا کے ساتھ میرے تعلقات میں کچھ ایسی مٹھاس محبت اور انسانیت آ چلی تھی کچھ ایسا خلوص ایسی دردمندی کچھ ایسی گہری گھلاوٹ کا اظہار اس محبت میں ہوا تھا کہ میں کسی طرح اس دھوکے کے لیے تیار نہ تھا اور اب تک ماجد کے کہنے کے باوجود ان کی معصومیت پر دل ہی دل میں ایک عجیب خلا کا احساس ہوا۔ جذباتی دھچکا سا لگا۔ ذہن کے اندر ایک تار سا ٹوٹ گیا اور اس کے جھن جھنانے کی آواز رگ و پے میں گونج گئی۔ یہ رقم تو ایک طرح کے جوئے میں آئی تھی اور جوئے میں چلی گئی۔ اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ تثلیث ایک دن ٹوٹ جائے گی۔ ہم تینوں الگ الگ اپنی راہوں پر چلے جائیں گے یا شاید میں جین کے ساتھ چلا جاؤں گا یا شکنتلا کے ساتھ دل ابھی کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچا نہیں تھا مگر اب جو میرا خون کھول رہا تھا تو یہ سوچ کر میں تو ان کی زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں، اُن دونوں نے میرے ساتھ ایک کھیل کھیلا تھا۔ مجھے کھلونے کی طرح استعمال کیا اور بس جھوٹا تھا۔ ہر بوسہ مصنوعی، ہر احساس جعلی، ہر نگاہ محبت سے خالی۔ میں اُن کے سہارے کی چھڑی تھی۔ راستے کا ہوٹل، پٹرول کا ڈبہ جب اُنہیں میری ضرورت نہ رہی تو اُنہوں نے چھڑی کو توڑ دیا۔ ہوٹل کو خالی کر دیا۔ پٹرول استعمال کر لیا اور خالی ڈبے کو پھینک دیا۔ مجھے اُنہیں الزام دینے کا حق بھی کیا ہے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ وہی کیا، جو میں نے مرجینا کے ساتھ کیا۔ یہ زمانہ ہی ایسا ہے۔ یہ وقت ہی ایسا ہے۔ یہ زندگی اسی طرح چلتی ہے مصنوعی، میکانکی، مشینی آنکھوں کی بیٹری چلانے سے نگاہیں روشن ہوتی ہیں۔ ہونٹوں کا سوئچ دبانے سے بوسہ برآمد ہوتا ہے۔ دل کا ٹیپ ریکارڈ چلانے سے

محبت کا سنگیت لہرا جاتا ہے۔ جب چاہو اس محبت کے ٹیپ کو سن لو جتنی بار چاہے سن لو۔ جب چاہو ڈی میگنٹائیز کر کے خالی کر دو۔ یہی اُنہوں نے تمہارے ساتھ کیا۔ تمہیں ڈی میگنٹائیز کیا اور چلی گئیں۔ کاہے کو روتے ہو؟''

دیر تک میں ہکا بکا اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر ماجد دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آ گیا اور مجھے حیران دیکھ کر بولا۔ ''کیا بات ہے۔ پٹرول کے خالی ڈبے کی طرح تمہارا منہ کھلا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میں اس وقت بالکل ایک خالی ڈبے کی طرح محسوس کر رہا ہوں!''

''کیوں؟''

میں نے اُسے بتایا۔ ''دونوں حرافائیں میرے حصے کی رقم لے کر رفو چکر ہو گئیں۔ سوٹ کیس خالی ہے۔ اب جب چاہو پولیس کو بلا لو۔''

''کتنی رقم تھی؟''

''دو لاکھ۔'' میں نے کہا۔ ہیروں کا نام نہیں لیا۔

''اب پولیس کو کیا کہو گے؟''

''کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''اور ان دو لاکھ کا کیا کرو گے جو ہوٹل کے خزانچی کے پاس محفوظ ہیں؟''

''میرے کان کھڑے ہوئے۔'' تمہیں کیسے معلوم ہے؟''

ماجد ہنسا۔ بولا ''میں سب خبر رکھتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایک مشہور آرکی ٹیکٹ ہوں بمبئی میں اچھے آرکی ٹیکٹ کو معقول معاوضہ ملتا ہے گو اتنا تو نہیں، پھر بھی میں اس کا حساب دے سکتا ہوں۔''

''میری مانو تو اس رقم کو اسٹیٹ بنک کے لاکر میں یا میرے بنک کے لاکر میں محفوظ کرلو۔ خزانچی سے میں سمجھ لوں گا۔ وہ پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا۔ تم بے کار حساب کتاب دینے سے بچ جاؤ گے۔''

مجھے ماجد کی صلاح پسند آئی۔ میں نے اس کے بینک کے لاکر میں یعنی پنجاب نیشنل بنک کے لاکر میں محفوظ کرا دیئے۔!

جب پولیس آئی تو اُنہوں نے میرے کمرے کی تلاشی لی مگر اُنہیں تلاشی میں بھی کچھ نہیں ملا۔ ہوٹل کے خزانچی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ جرح کرنے پر میں نے صرف اتنا بتایا کہ اس رات میں شراب پی گیا تھا ممکن ہے اس کے اثر سے میرا دماغ چار دن کے لیے کوما میں چلا گیا ہو۔ ڈاکٹر چونکہ زہر کی تشخیص نہیں کر سکتا تھا اس لیے میرے بیان ہی کو زیادہ صادق سمجھا گیا۔ جین اور شکنتلا کے بارے میں مَیں نے سرسری باتیں بتائیں۔ گلمرگ میں ملاقات، پھر پیلس ہوٹل میں ملاقات، یوس مرگ میں پکنک۔ اصل معاملہ گول کر گیا ورنہ خود پھنستا ادھر غالباً ماجد نے بھی پولیس کو دے دلا کر رام کر لیا تھا۔ اُن کی جرح بھی سرسری تھی۔ لگتا تھا کہ ساری کاروائی خانہ پُری کے لیے ہے۔ اس لیے معاملہ چند گھنٹے میں رفع دفع ہو گیا۔ واقعات کو سنبھالنے میں جس طرح ماجد نے میرا ساتھ دیا تھا اس کے لیے میں اُس کا شکر گزار تھا۔

اب شکرانہ ادا کرنے کی میری باری تھی، یعنی پے منٹ...... ادائیگی اس دنیا میں چاہے وہ کوئی کام ہو یا رقم ہو یا جذبہ ہو، اس کی پے منٹ ضرور کی جاتی ہے۔ انسانیت، شرافت، دوستی، فرض، خدمات تو محض لفافہ نما الفاظ ہیں جن کے اندر پے منٹ رکھ کر ادائیگی کی جاتی ہے۔!

چنانچہ شام کو جب ہم وسکی پینے بیٹھے تو میں نے اسے سارا قصہ بتا دیا۔ جین اور شکنتلا کے ساتھ اپنے تعلقات کا اور پلنس بوٹی کی خرید و فروخت کا!

”اب اگر تم پولیس کا آدمی ہو تو مجھے گرفتار کر سکتے ہو۔ اور اگر کوئی اور ہو تو پتے میز پر رکھ دو۔!“

ماجد نے اپنا پائپ سلگایا۔ بولا۔ ”اگر میں پولیس کا آدمی ہوتا تو پولیس سے بچانے میں تمہاری مدد کیوں کرتا تم نے جو باتیں مجھے بتائیں اُن کا مجھے پہلے سے شبہ تھا اور اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں خود ایک اسمگلر ہوں، میرے ایجنٹوں نے مجھے جین کا پتا بھی دیا تھا۔ میں پچھلے سال سے اُس کی ٹوہ میں تھا مگر مجھے کامیابی نہیں نصیب ہوئی۔ اب اگر تم میرے ساتھ پارٹنر شپ میں آتے ہو تو ہم اکٹھے یہ دھندا شروع کر سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس سال تو یہ دھندا نہیں ہو سکتا۔ سارا مال ہم نے لے کر بیچ دیا اب

اکبر خاں کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بوٹی موسم سرما میں پیدا ہوتی ہے۔ بہار کے موسم میں خشک کی جاتی ہے۔ اب اگلی بہار تک اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔!''

ماجد بولا۔ ''مگر ہم اس عرصے میں اکبر خاں سے مل تو سکتے ہیں یا کسی دوسرے گوجر قبیلے کو یہ بوٹی دکھا کر۔!''

میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ میں کسی دوسرے گوجر قبیلے کو نہیں جانتا۔''

''تو چلو۔ جہاں اکبر خاں کا قبیلہ پڑا ہے وہیں چلتے ہیں۔''

میں دراصل جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں مرجینا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پھر مجھے بمبئی لے جانے کے لیے کہے گی۔ یوں تو وہ لڑکی اپنی اداؤں میں بڑی حُسین اور دلربا ہے مگر بمبئی کی جس ہائی سوسائٹی میں، میں گھومتا ہوں اس میں بالکل ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوگی۔ جنگل میں کسی چشمے کے کنارے، برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں وہ بالکل فطرت کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے مگر جہاں پر اسفالٹ کا جنگل ہو، بھیڑ بکریوں کی جگہ موٹریں ہوں اور خیموں کی جگہ کنکریٹ کے کلب ہوں وہاں مرجینا کا حُسن کس قدر غیر مناسب معلوم ہوگا اور اُس کا پہاڑی اکھڑ لہجہ نہیں صاحب نہیں۔ میں باز آیا ایسی محبت سے......!

مگر جب ماجد نے سخت اصرار کیا تو میں نے جانے کے لیے ہاں کر دی۔ پھر کوئی بہانہ کر کے مرجینا کو ٹال دیا جائے گا۔!

''کیا صبیحہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ماجد بولا۔ اُن کو تو میں نے دو دن ہوئے لکھنؤ کے لیے روانہ کر دیا تھا۔''

''لکھنؤ کے لیے۔''

''ہاں۔ وہاں ایک ادبی کانفرنس میں حصہ لینے گئی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں وہ بہت بڑی کہانی نگار ہیں۔ اُن کے افسانے ہندوستان کی بہت سی زبانوں میں چھپتے ہیں۔''

میں چپ رہا۔

ماجد وقفے کے بعد بولا۔ ''پھر جس قسم کی مہم پر جا رہے ہیں، اس میں میں اپنی بیوی کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔''

''بالکل صحیح فیصلہ ہے۔'' میں نے ماجد سے کہا۔



دوسرے دن ہم پرنگ گئے۔ پرنگ سے سامنے کے پہاڑی درے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف وادی میں پہنچے جہاں پر اکبر خاں کے قبیلے نے اپنے خیمے گاڑے تھے۔

مگر آج وہاں پر کوئی خیمہ نہ تھا۔ کوئی قبیلہ بھیڑ بکریوں کے کسی گلے کا نام ونشان نہ تھا۔ میں چکرا سا گیا۔ یہ کیا ماجرا ہے؟

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے وہ سون مرگ گئے ہوں، مرجینا نے مجھ سے کہا تھا۔''

ہم لوگ سون مرگ کی طرف ہو لیے۔ وہاں بھی اکبر خاں نہ کسی دوسرے گوجر قبیلے کا پتا چلا۔

''ممکن ہے وہ بغلیاز لوٹ گیا ہو۔ اپنے گھر اٹھارہ ہزار روپے ایک رقم ہوتی ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے ماجد سے کہا۔ ''وہ سردیوں سے پہلے اپنے گھر نہیں لوٹے گا۔ ڈھوک پر وہ اور اُس کا قبیلہ اپنی مویشی نہیں چرائے گا کیا؟''

''تو پھر اسے کہاں ڈھونڈیں؟'' ماجد نے مایوس ہو کر پوچھا۔

''اندھیرے میں ٹکریں مارنے سے کیا حاصل؟ کیا جانے وہ آج کس ڈھوک پر ہے۔ کس پہاڑ کی ڈھلان پر ہے۔ کس برفیلے پانی کے نالے کی وادی پر ہے اس نے خیمے گاڑے ہیں۔ میں نے ماجد سے کہا۔ ''بہتر یہ ہے کہ واپس چلے جائیں اور سردیوں میں یا خزاں کے اواخر میں بغلیاز جا کر اس سے بات چیت کریں یا کسی دوسرے گوجر قبیلے سے...... پکنس بوٹی تو تمہارے پاس ہے نا؟''

''ہاں۔'' ماجد مسکرا کر بولا۔ ''اسے تو اب میں جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا میرے خیال میں تمہارا مشورہ زیادہ صحیح ہے۔ ہمیں سری نگر واپس چلا جانا چاہیے۔''

سری نگر پہنچ کر میں نے دوسرے دن کے ہوائی جہاز پر بمبئی کے لیے اپنی سیٹ بک کرائی۔ اب سری نگر میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ ایک خواہش ناتمام تھی جو مجھے بمبئی کی طرف کھینچے لیے جا رہی تھی۔ ماجد نے میرا پتا نوٹ کر لیا اور مون سون کے دنوں میں بمبئی آنے کا وعدہ کیا۔

''مگر آج کی رات تم میرے مہمان ہو گے۔'' ماجد نے کہا۔ ''پہلے ادپن میں پہنچیں

گے۔ پھر احدو کے یہاں جا کر کھانا کھائیں گے۔ فرسٹ کلاس واز جان۔"

میں نے منظور کر لیا۔

وہسکی پیتے پیتے ہم نے ستمبر کے اواخر میں پھر کشمیر آنے کا پروگرام بنالیا اور کشمیر آ کر بغلیاز جانے کا۔ اس بیچ میں باقاعدہ خط و کتابت ہوتی رہے گی اور ماجد بمبئی آ کر مجھ سے ملتا رہے گا۔

سب پروگرام طے کر کے ہم لوگ احدو میں گئے اور کھانا کھا کر واپس پیلس ہوٹل آ گئے۔!

ہوٹل آ کر سونے سے پہلے میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا کیونکہ مجھے بہت سویرے ہوائی اڈے پر پہنچ جانا تھا۔!

ابھی میں نے پوری طرح سامان باندھا نہ تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا۔

سامنے ماجد کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ رچھپال سنگھ تھا۔

☆☆☆

رات دیر تک دور چلا یہ خالص مردانہ محفل تھی۔ پہلے وہسکی کا دور چلا، پھر مان ہٹن کاک ٹیل کا۔ کنور رچھپال سنگھ خبر لایا تھا کہ رامبن اور بٹوٹ کے بیچ دریائے چناب کے کنارے ایک سنگلاخ پہاڑ کے اندر ہیرے کی ایک کان دریافت ہوئی ہے۔ وہ ابھی تجرباتی دور سے گذر رہی ہے۔ اس لیے کشمیر گورنمنٹ نے اس کی دریافت کو صیغہ راز میں رکھا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے بہت اعلیٰ انتظام کیا ہے۔ کان کے گرد چاروں طرف لوہے کا خاردار جنگلہ ہے، جس میں بجلی کی رو دوڑتی ہے۔ اس لیے کوئی کان کن جنگلے کو کاٹ کر یا اسے پھلانگ کر ہیرے چوری کر کے نہیں لے جا سکتا۔ کان کے اندر جانے اور باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور اس پر پولیس کا کڑا پہرہ ہے جو دن رات قائم رہتا ہے اور اس دروازے کے اوپر سرچ لائٹ کا انتظام بھی ہے۔ غرض یہ کہ اس کان کے اندر ہم رات کو بھی نہیں جا سکتے۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر کنور جی ایسی بیوقوفی کی باتیں ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟ جب

کان کے اندر خفیہ طریقے سے جانے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ نہ باہر نکلنے کی تو ہیروں سے متعلق گفتگو کرنا لا حاصل ہے۔''

''لا حاصل نہیں ہے۔'' کنور میرے قریب ہو کر رازداری کے لہجے میں بولا۔''میں نے کان کے چیف انجینئر گنگا سہائے کو پٹا لیا ہے''

''اکیلا گنگا سہائے کیا کر سکتا ہے؟ وہاں پولیس کا عملہ ہے جو ہر آنے جانے والے کی تلاشی لیتا ہوگا۔ روز جو ہیرے نکلتے ہوں گے، ان کو تول کر الگ کسی سیف میں رکھا جاتا ہوگا۔ اس محکمے کا انچارج الگ ہوگا۔ کام کی شیٹ ہر روز بنتی ہوگی۔ اس کا انچارج الگ ہوگا۔ اتنے لوگوں کو ایک ساتھ پٹانا بڑا مشکل ہے جناب۔ گورنمنٹ بھی اس قدر بے وقوف نہیں ہے۔''

ماجد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ سب انتظام ہو جائے گا۔ بس اتنا بتا دو۔ کیا تم اس مہم میں ہمارے ساتھ ہو؟''

''کتنا سرمایہ لگانا پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

کنور جی بولے۔''ہم تینوں کو ایک ایک لاکھ لگانا پڑے گا۔!''

''تب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے یوں سوچ کر کہا کہ ایک لاکھ چلے جانے کے بعد بھی ایک لاکھ بچ گیا تو بھی بہت ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ پکنس کی طرح اس میں خاصا منافع ہو۔

''ڈن۔'' ماجد نے خوش ہو کر پوچھا۔

''ڈن۔'' میں نے کہا۔

ماجد۔ کنور رچھپال اور میں۔ ہم تینوں نے زوردار مصافحہ کیا اور اپنا کاک ٹیل خالی کر دیا۔

ماجد نے مجھ سے کہا۔''اب تم بمبئی جانے کا۔ پروگرام ملتوی کر دو۔ ہم لوگ پنی ٹاپ چلیں گے جہاں رچھپال نے ایک کاٹیج بک کرالی ہے۔''

میں نے پوچھا۔''پنی ٹاپ تو بٹوت کے قریب ہے اور کان رام بن کے قریب تو کیا رام بن میں کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔''

''مل تو سکتی ہے۔'' رچھپال سنگھ نے کہا۔ مگر رام بن میں آبادی ہے اور پٹنی ٹاپ کے جنگلوں میں کھرے ہوئے کاٹیج زیادہ محفوظ ہیں۔''

''او کے۔'' میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگر صبح چلنا ہے تو بہتر ہے ایک ایک نیند لے لیں۔'' پھر میں کنور رچھپال کی طرف مڑا اور بولا۔ ''کنور جی آج معلوم ہوا آپ کی رائیسی کیسے قائم ہے؟''

پہلے تو رچھپال ذرا سا جھینپا۔ پھر اُس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ بولا ''ریاست گئی تو کیا عادتیں بھی چلی گئیں۔ ان عادتوں کو سنبھالنے کے لیے روپیہ چاہیے کہ نہیں؟ اب تو ان عادتوں کو تم بھی اختیار کرتے جا رہے ہو؟ ایسی عادتیں کس کو بری لگتی ہیں کہ سرشار حسینوں کا جھرمٹ ہو۔ عمدہ وہسکی۔ بڑھیا کھانا ہو۔ خوب صورت بنگلہ ہو۔ پورچ میں گاڑی ہو۔ بینک میں لاکھوں پڑا ہو۔ کون یہ خواب نہیں دیکھتا ہے؟ فرق ہے کہ کچھ لوگ صرف خواب دیکھتے ہیں۔ کچھ لوگ ممکن وسیلہ اختیار کر کے اس خواب کو پورا کر لیتے ہیں۔ میرا نام ایسے ہی لوگوں کی فہرست میں آتا ہے میں زیادہ ایمان دار ہوں۔ حقیقت پسند ہوں کہ بزدلوں کی طرح ان خوابوں کو محض حسرت ناک نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ آگے بڑھ کر ان پر حقیقت کا جامہ پہناتا ہوں۔ ہر شے کی ایک قیمت ہے۔ جین کی بھی ایک قیمت ہے۔ گو میں اس وقت وہ قیمت ادا نہیں کر سکا تھا مگر ایک دن میں اُس کی چیک پر سائن کر دوں گا وہ میری ہو جائے گی۔''

''تو تم جین کو بھولے نہیں ہو؟'' میں نے کنور سے پوچھا۔

وہ اپنے گیلے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''ایسی طرح دار عورت کو کون آسانی سے بھول سکتا ہے؟''

ماجدر چھپال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''صبح ملیں گے۔''

اُن کے جانے کے بعد میں وارڈ روب کے قد آدم آئینے کی طرف مڑا اور اس سے کہنے لگا۔ ''بس یہ آخری بار ہے جو روپیہ میں نے کھویا ہے اور جو ہیرے میں نے گنوائے ہیں۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اور بس یہ آخری بار ہے ورنہ میں اسمگلر نہیں بننا چاہتا۔ بلیک مارکیٹر نہیں بننا چاہا تا۔ ڈوپ سیلر نہیں بننا چاہتا۔ میرے اندر

آرکی ٹیکٹ کی روح ہے۔ وہ روح جو ایسے شہر کے خواب دیکھتی ہے جس میں صرف دو منزلہ
بنگلے ہوں اور دور دور تک میلوں تک پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان
پھولوں کی کیاریاں اور سبزہ زار جنگل، درختوں سے ڈھکی ہوئی سڑکیں اور پارک اور پارک
میں جھیلیں اور جھیلوں میں مچھلیاں اور جھیل میں آبی سطح پر بچوں سے لدی کشتیاں اور چاروں
طرف فطرت اور فطرت کی گود میں انسان۔ میں ایک انسان ہوں جو شہر اور فطرت کے
درمیان ایک حسین امتزاج پیدا کرنا چاہتا ہے۔ میں اسمگلر نہیں بننا چاہتا۔ بس یہ آخری بار
ہے پیارے۔!

☆☆☆

گنگا سہائے کوتاہ قد تھا۔ چہرے کی رنگت سبزی مائل زرد تھی جیسے اُس کے بدن
میں خون کے بجائے کلوروفل گھومتا ہو۔ چھوٹی چھوٹی سنکے نما تیزی سے گھومتی ہوئی آنکھیں
تھیں اور بچوں کی طرح گول گول رخسار کسی قدر لٹکے ہوئے۔ اگر آنکھیں جھکا لیتا تو اُس کا
چہرہ بچوں کی طرح معصوم دکھائی دینے لگتا مگر یہ اُس کی آنکھیں تھیں جو اُس کا سارا راز کھول
دیتی تھیں۔

وہ کسی سرکاری کام سے جموں جا رہا تھا۔ صرف چند گھنٹوں کے لیے پٹنی ٹاپ رُکا تھا
''آج ہی جموں چلا جاؤں گا۔ جموں کا بول کر آیا ہوں تو جموں ہی جاؤں گا۔'' اس
کی آواز میں سرگوشی اور مکاری تھی۔ ''میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔ جواہرات تولنے
والے ڈلا رام کو ساتھ ملا لیا ہے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا تول کم کیا جائے گا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ جو
ہیرے تولے نہیں جائیں گے انہیں الگ رکھ دیا جائے گا۔ دس دن کے بعد مقدار میں جتنے
ہیرے جمع ہوں گے وہ آپ کو دے دیئے جائیں گے۔''

''مگر ہیروں کو کان سے باہر کیسے لاؤ گے؟'' ماجد نے پوچھا۔

گنگا سہائے بولا۔ ''اگر جرار حسین ساتھ مل جاتا تو بڑے آرام سے یہ سب کام
ہوسکتا تھا مگر میں جرار حسین کو جانتا ہوں۔ وہ ہماری پولیس چوکی کا ہیڈ ہے۔ بے حد دیانت
دار ہے۔ وہ ہمارا کام نہیں کر کے دے گا۔ اس کی موجودگی میں ہیروں کو کان سے باہر لانا
ناممکن ہے۔ ایسے ہی لوگ پولیس کے پیشے کو بدنام کرتے ہیں۔'' گنگا سہائے نے کہا۔

ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''پھر کیا سوچا ہے؟'' رچھپال سنگھ نے اُس سے پوچھا۔

گنگا سہائے نے ایک کاغذ پر کان کا نقشہ سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو یہ رام بن ہے۔اس پہاڑ کی سلوٹ میں کان ہے۔ نیچے چناب بہتا ہے۔ پیچھے لکرائی کا پہاڑ ہے۔ کچا پہاڑ۔ بارش میں چٹانیں گرتی رہتی ہیں اور لکرائی کا نالہ بھی زور سے بہتا ہے اس لیے ادھر سے بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ جہاں پر پکی سڑک ختم ہوئی ہے وہاں پر کان کا بڑا دروازہ ہے یہاں پر پولیس چوکی ہے۔ رات کے وقت چوکی کے اوپر تیز روشنی والی ہیڈ لائٹیں لگی ہیں۔ چاروں طرف آہنی خاردار باڑھ لگی ہے جس میں بجلی دوڑتی ہے اور الارم لگا ہے باڑھ کو چھونے سے ہی آدمی مر جائے گا۔ کسی طرح باڑھ کو کسی جگہ سے کاٹ دیا جائے تو فوراً چوکی میں الارم بجنے لگتا ہے۔

''فول پروف۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' گنگا سہائے بچوں کی طرح مسکرا کر بولا۔ ''مگر غور سے دیکھو کان کے عقب میں جدھر کچے پہاڑ سے لکرائی نالہ بہتا ہے، یہاں آوالانش سے گری ہوئی بہت سی چٹانیں جمع ہو گئیں ہیں۔ ان چٹانوں کی اوٹ میں تم لوگ چھپ سکتے ہو۔ میں بھی چھپ سکتا ہوں۔''

''کاہے کے لیے؟'' ماجد نے بیزار ہو کے کہا۔

''سنو سنو'' یہ گنگا سہائے بڑی نرمی سے بولا۔ ''میری ترکیب بہت سہل ہے۔ نہ تم کان کے اندر آؤ گے نہ میں کان کے باہر جاؤں گا مگر ہیرے تم تک پہنچ جائیں گے۔''

''خیالوں میں؟'' میں نے طنزاً پوچھا۔

''خیالوں میں نہیں۔ واقعی آج سے دس دن بعد تم لوگ خاردار آہنی باڑھ کے باہر چٹانوں کی اوٹ میں چھپے ہو گے۔ میں باڑھ کے اندر کی طرف کی چٹان کی اوٹ میں ہیروں کی پوٹلی لے کر بیٹھا رہوں گا۔ پانچ بجے کان کا کام بند ہو جاتا ہے۔ چھ بجے کا وقت ٹھیک رہے گا۔ اس وقت جنگل کے سائے نیچے اتر آتے ہیں۔ ایسے میں چھ بجے تمہاری طرف سے جنگل کی طرف سے گیدڑ کے بولنے کی آواز سنائی دے گی۔ کیا تم میں سے کوئی

گیدڑ کی بولی بول سکتا ہے؟''

''ماجد بولا۔'' گیدڑ کی بولی بولنا کون سا مشکل کام ہے اور دس دن تک ہم کریں گے بھی کیا، گیدڑ کی بولی بولنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔''

گنگا سہائے نے کہا۔'' جونہی تم میں سے کوئی گیدڑ کی آواز لگائے گا میں چٹان کی اوٹ سے اُٹھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ تم روپئوں کی تھیلی میری طرف پھینک دو گے یعنی باڑھ کے اوپر سے باڑھ کو چھوئے بغیر۔ میں تھیلی کھول کر اپنی تسلی کر کے ہیروں کی تھیلی باڑھ کے اوپر سے تمہاری طرف پھینک دوں گا۔ نہ باڑھ کٹے، نہ چوکی کو خبر ہو۔ نہ کسی تلاشی کی ضرورت تمہیں ٹکرائی کے جنگل کی طرف سے نیچے کان کی طرف آتے ہوئے اس جگہ کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ جہاں سے نہ صرف تم اوٹ میں رہو بلکہ پولیس چوکی بھی اوجھل رہے۔ ایسی ایک جگہ ہے۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا ہے مگر ہے ذرا پُر خطر۔ پیچھے ٹکرائی نالہ بہتا ہے اور بارش کے دنوں میں کچے پہاڑ سے کبھی کبھی چٹانیں، گرتی ہیں مگر آج کل نہیں۔ اگر موسم صاف ستھرا رہا تو کسی طرح کا خطرہ نہیں ہوگا مگر پھر خطرے کا امکان تو ہمیشہ رہتا ہے اس لیے ادھر گشت کرنے والے سنتری ڈر کے مارے کبھی نہیں جاتے۔ اس لیے ایک لحاظ سے یہ جگہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔''

ہم تینوں نے اچھی طرح غور کیا گنگا سہائے کی اس تجویز میں کوئی نقص نظر نہیں آیا۔ اس لیے ہاں کر دی اور اسے ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس بھی دے دیا۔ گنگا سہائے خوش خوش وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دس دن ماجد نے گیدڑ کی بولی کی مکمل نقل کرنے میں صرف کیے۔ کنور رچھپال سنگھ نے بمبئی کے ایک جوہری سے ناطہ جوڑا اور جس دن ہمیں ہیرے ملنے والے تھے یعنی ہیروں کی پہلی قسط کے دوسرے دن اسے جموں ہوٹل میں آکر ٹھہرنے کو کہا۔ اس کے علاوہ جموں میں اور بھی کئی انتظام کرنے تھے۔ میں نے یہ دس دن کان کے عقبی زاویوں کی کھوج میں صرف کیے۔ گنگا سہائے نے کہا تو ٹھیک تھا۔ ٹکرائی پہاڑ کا نالہ کان کے قدموں تک آتا تھا مگر صرف دائیں بائیں ورنہ پورا کچا پہاڑ آدولانش سے کٹا ہوا تھا اور سینکڑوں ٹن چٹانیں کان کے عقب میں گری ہوئی تھیں۔ ٹکرائی کا نالہ ان دنوں تقریباً

خشک تھا اور پانی کی ایک پتلی سی دھار پہاڑ پر سے پھسلتی ہوئی نیچے کی چٹانوں میں غائب ہو جاتی تھی اور پھر کئی ہزار فٹ نیچے نشیب میں جا کر چناب میں مل جاتی تھی۔ باقی دو طرف ننگے پہاڑوں کی سلوٹیں تھیں۔ بڑی بڑی سخت چٹانوں سے گھری ہوئیں جن پر کوئی درخت اور جھاڑی نہ تھی۔ کان کے سامنے بڑا گیٹ تھا۔ اسی گیٹ سے مزدور باہر نکل سکتے تھے یا اندر آ سکتے تھے ورنہ چاروں طرف آہنی باڑھ میں بجلی کی رو دوڑتی تھی اور چوکی پر آتے جاتے، دونوں وقت تلاشی ہوتی تھی۔ میں نے سوچا یہ کان واقعی بڑی محفوظ جگہ پر واقعہ ہے اور واقعی عقبی چٹانوں میں چھپنے کی بجائے اور کوئی ترکیب بھی نہیں ہو سکتی۔

میں نے کافی وقت لیا اور بہت سے دن ٹھیک جگہ کا انتخاب کرنے میں، میں نے اس کام کے لیے سب سے پُر خطر جگہ چنی جو آوالانش کی سیدھی زد میں تھی۔ یہاں نالہ سیدھے اوپر پہاڑ سے آ کر نیچے چٹانوں میں گھس جاتا تھا اور کبھی کبھی دو چار پتھر بھی گڑ گڑاتے ہوئے نیچے گر جاتے تھے اس لیے ادھر کوئی پہریدار نہیں آتا تھا یہاں پر دائیں طرف بڑی بڑی چٹانوں کے بالکل قریب چیڑھ کے پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا اور اونچی نوکیلی چٹانوں سے پرے کان کی آہنی باڑھ تھی۔!

میں نے یہاں کی ایک چٹان پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ دس قدم کے فاصلے پر آہنی باڑھ تھی مگر یہاں کا زاویہ ایسا تھا کہ پولیس چوکی میری نظروں سے اوجھل تھی جہاں سے میرے پیچھے ایک طرف چیڑھ کے پیڑوں کا کنج بھی بہت قریب کے فاصلے پر تھا۔

کئی دن تک اپنا اطمینان کرنے کے بعد میں نے یہ جگہ ماجد اور رچھپال سنگھ کو بھی دکھا دی۔ اُنہوں نے بھی اسے پسند کیا۔

دسویں دن ٹھیک چھ بجے ہم لوگ اس جگہ چٹانوں کی اوٹ میں تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ ماجد چیڑھ کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو کر گیدڑ کی بولی بولے گا۔ میں باڑھ کے قریب ترین ایک چٹان پر کھڑا ہو کر گنگا سہائے کو اپنا منہ دکھاؤں گا۔ پھر جب گنگا سہائے کو اطمینان ہو جائے گا تو میں اس کی طرف کرنسی نوٹوں سے بھری تھیلی پھینک دوں گا۔ باڑھ کے اوپر سے اور وہ ہیروں کی پوٹلی میری طرف پھینک دے گا جسے میں فوراً اچک لوں گا اور اچک کر اپنے پیچھے رچھپال سنگھ کی طرف پھینک دوں گا اور وہ اسے ماجد کی طرف چلتا

کر دے گا۔ اس ریلے ایکشن میں صرف دو منٹ صرف ہوں گے۔ اول تو کوئی پہریدار ادھر آئے گا نہیں، اگر آیا تو ماجد کا پستول اُس کے لیے کافی ہوگا۔

مگر پستول چلانے کی نوبت نہیں آئی۔ سارا کام واقعی دو منٹ میں سرانجام پا گیا۔ دو تھیلیاں یکے بعد دیگرے باڑھ کے اوپر گیند کی طرح اڑیں اور ایک دوسرے کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ بس اب اگلے دسویں دن ہمیں آنا تھا۔ دوسری قسط کے لیے پھر اس کے دس دن کے بعد بس ایک مہینے میں یہ کام ختم ہو جائے گا۔!

☆☆☆

ہیروں کی پوٹلی لے کر ہم لوگ عقب سے جنگل جنگل چلتے ہوئے چند میل کے فاصلے پر وہاں آئے جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ وہاں سے ہم سیدھے جموں کے لیے روانہ ہوئے۔!

ماجد اور رچھپال سنگھ کو ہیروں کی خالص پرکھ تھی۔ جیپ میں اچھی طرح اُنہوں نے پوٹلی کھول کر اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے ناتراشیدہ ہیروں کو پرکھا۔ کچھ یاقوت کے ٹکڑے تھے اور اعلیٰ قسم کے کہ ناتراشیدہ ہونے کے باوجود محبوب کی آنکھ کی طرح چمکتے تھے۔

رات کو ہم جموں ہوٹل میں رہے۔ یہیں پر بمبئی کے جوہری بشیشر پرساد مانکیا سے ملاقات ہوئی۔ باغ و بہار آدمی تھا اور دنیا دیکھے ہوئے اور انگوٹھی میں ایک بڑا الماس پہنے ہوئے عمدہ وضع کی اور عمدہ عورت کا شوقین بمبئی سے ہی ایک کال گرل اپنے ساتھ لایا تھا۔

''کون جانے جموں میں اپنی پسند کا مال نہ ملے۔'' بشیشر پرساد اپنی کال گرل کی پیٹھ تھپتھپا کر ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس لیے میں اپنی رانو کو اپنے ساتھ لے آیا۔''

رانو نے مسکرا کر ایک گھونٹ اپنے عاشق کے جام سے لے لیا۔

وہ سب میرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ بزنس بھی ہو چکا تھا۔ بشیشر پرساد کو ہیرے بہت پسند آئے تھے مگر اُس نے اُن کے دام ساڑھے تین لاکھ لگائے تھے۔ بڑی مشکل سے وہ پانچ لاکھ دینے پر راضی ہوا۔

''مگر مجھے اس بات کی بڑی حیرت ہے کہ اس علاقے میں لعل کہاں سے آ گئے۔ کشمیر تو اپنے نیلم کے لیے مشہور ہے۔'' بشیشر پرشاد نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی ناکام

کوشش کی۔

کنور رچھپال سنگھ بولا۔ ''یہ ہیرے کشمیر کے نہیں ہیں۔''

بشیشر پرشاد کو اس جواب سے تسلی تو نہیں ہوئی مگر وہ چپ ہو کر رہ گیا اور اس نے پانچ لاکھ کی رقم ادا کر دی۔

بعد میں جب ہم سب بیٹھے پی رہے تھے اور اس کی رانو بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہماری پارٹی میں شامل ہو گئی۔ رانو مجھے نیپالن لگتی تھی۔ چمپئی رنگت، نوکیلی آنکھیں اور بروکیڈ کا چینی گون۔ بڑی شستہ انگریزی بولتی تھی۔ وہ مجھے ایسی لڑکی معلوم ہوتی تھی جس نے صرف پیسے کی خاطر ہی نہیں بلکہ سیکس کی خاطر بھی کال گرل کے پیشے کا انتخاب کیا ہو۔ اپنے پتلے کٹیلے سرخ ہونٹوں پر جب وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ لا کر ترچھی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتی ہے تو جذبے کی رو چلنے لگتی ہے کچھ اس طرح کی لڑکی جس کے لئے کال گرل کا پیشہ فطری ہے وہ ایک بار جام پیش کرتے وقت یا نقل کی پلیٹ سامنے رکھتے وقت جب اُس کی انگلیاں میری نگاہوں سے چھو گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ اُس کی انگلیاں کس قدر گرم ہیں۔ ایسی لڑکیاں مرد کا ہاتھ لگتے ہی بھڑک جاتی ہیں۔ پھر ان کے جذبے کو کوئی روک نہیں سکتا۔

رانو جب سرور میں آ گئی تو بار بار اپنے جوہری کو چومنے لگی۔ جوہری نے اس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے اُس سے کہا۔ ''جاؤ تم اپنا لباس بدلو۔ کمرہ ٹھیک کرو ...... میں آتا ہوں۔''

''جلدی آؤ۔'' کہہ کر رانو اپنی جگہ سے اُٹھ کر اور ہم چاروں پر نظر ڈال کر رخصت ہو گئی۔ اس کی نگاہ جیسے کہہ رہی تھی۔ جب تک جوہری نہیں آتا کیا تم میں سے کوئی دوسرا میرے ساتھ نہیں چل سکتا۔

رانو کے جانے کے بعد بشیشر پرشاد مانکیا کیف آور لہجے میں بولا۔ ''سالی تتیا مرچ ہے تتیا مرچ۔''

ماجد اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''بشیشر پرشاد جی، ہم لوگ جو وقتی طور پر کنوارے ہیں، اپنے اپنے کمرے میں جانے کی اجازت چاہیں گے۔''

بشیشر پرشاد نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں جانے سے روک دیا۔ بولا۔ ''کیوں

نہ ہم لوگ مل کر ایک لمبا دھندا کریں؟"

"وہی تو ہو رہا ہے۔" کنور رچھپال سنگھ نے کہا۔"اس کے بعد بھی ہیروں کی فروخت کے لیے ہم آپ کو ہی تکلیف دیں گے۔"

"چھوڑیئے ہیروں کی بات۔" بشیشر پرشاد نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ہم آپ کو اس سے بہتر دھندہ بتاتے ہیں۔"

"کون سا؟ ہیروں سے بہتر کون سا دھندا ہو سکتا ہے؟"

"چاول کا۔"

"چاول۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی جناب۔ آج چاول کے دھندے میں جو منافع ہے، وہ ہیروں کی فروخت میں نہیں ہے۔ کچھ معلوم ہے آپ کو آج بمبئی کے جتنے بڑے اسمگلر ہیں، وہ سونے، چاندی، ہیرے، کپڑے سب کا دھندا چھوڑ کر چاول کا دھندا کر رہے ہیں۔ چاول جموں میں ڈھائی روپیہ کلو ملتا ہے۔ اچھا عمدہ باسمتی اور ڈبائی اور بحرین میں یہی چاول ستائیس روپے کلو بکتا ہے اور بمبئی اور مدھ اور کونکن اور گوا کے علاقوں میں عرب کشتیاں یہی باسمتی چاول بھر بھر کر لے جاتی ہیں۔ ڈھائی روپے کلو میں خریدو اور ستائیس روپے میں اسمگل کر دو۔ اس سے بڑھیا دھندا کیا ہوگا؟"

"مگر جموں سے چاول جائے گا کیسے؟ اور یہاں اتنا چاول ملے گا بھی کہاں؟"

کھانے کے لیے کم ہے بیچنے کے لیے بہت ہے۔" بشیشر پرشاد مانکیا نے جواب دیا۔"دلی سے ویگن کا کوٹا ملتا ہے۔ ساٹھ ویگن پر دو لاکھ دینے پڑتے ہیں۔"

"مگر جموں سے ساٹھ ویگن چاول ملے گا کہاں سے؟"

"ساٹھ ویگن نہیں ملے گا تو دس ویگن تو ملے گا۔ دس ویگن نہیں ملے گا تو چار ویگن تو ملے گا۔ باقی جموں سے براستہ پنجاب جاتے ہوئے اور پھر پنجاب سے ہریانہ جاتے جاتے ساری ویگن راستے میں فل ہو جائیں گی۔ اس کا بندوبست میں کر لوں گا کروڑ پتی بننا چاہتے ہو، دو سال میں کروڑ پتی بننا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔"

سب نے ایک ایک لاکھ ڈال دیا۔ پانچ لاکھ کا پول تیار ہو گیا۔ دو لاکھ ویگنوں

حاصل کرنے میں خرچ ہوں گے۔ باقی دو لاکھ جموں پنجاب سے بمبئی تک سمندر کے ساحل تک عربوں کی کشتیوں میں خیریت سے چڑھانے تک صرف ہو جائیں گے۔

پوری اسکیم تیار ہوگئی۔ اگر سب ٹھیک رہا تو اگلے سال تک دو کروڑ روپیہ میری جیب میں ہوگا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ پھر کھلا اب کی بار دروازے پر رانو کھڑی تھی۔ سپید لیس کے جالی دار گون میں اپنے گلابی بدن کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے بڑے غصے سے بولی۔ ''تم تو ابھی آرہے تھے بشیشر۔

بشیشر نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اسے فوراً کمرے سے باہر لے گیا۔ رچھپال سنگھ بولا۔ ''اس لڑکی کا ٹیلیفون نمبر لینا پڑے گا۔''



دس دن کے بعد ہیروں کی دوسری قسط بھی مل گئی۔ جموں ہوٹل میں اس دفعہ پہلے سے بھی شاندار اور مزیدار دعوت رہی۔ بشیشر پرشاد اس بار ایک کے بجائے تین لڑکیاں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ایک تو وہی تھی نیپالن جسے وہ رانو کے نام سے پکارتا تھا۔ دوسری ایک اطالوی لڑکی تھی۔ مارسیا تیسری ایک شعلہ رخ پنجابن تھی جسے وہ چمک کور کہتا تھا کیونکہ یہ پنجابن ذرا سی بت پر آگ بگولہ ہو کر دھوبی پڑا دکھانے لگتی تھی۔ جموں ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ایک پارسی لڑکی اور اُس کی اماں سے رچھپال سنگھ نے دوستی کر لی تھی۔ اس لیے اس بار ہماری دعوت جو مسلسل تین دن تک چلی، نسائی ساز و سامان کی کوئی کمی نہ رہی۔ مگر مسرت کے لمحے بھی ایک خاص طوالت کے بعد اکتا دیتے ہیں۔ احساس تھک جاتے ہیں اور جذباتی ردعمل شدت سے نیوٹرل کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

تین دن کے بعد لڑکیوں کو جموں ائیر پورٹ سے روانہ کر دیا گیا اور پھر ہمارا دوسرا بزنس مشن شروع ہوا۔ بشیشر پرشاد کچھ اچھی خبریں لایا تھا۔ دلی میں اس نے ساٹھ ویگن کی منظوری حاصل کر لی تھی۔ چند ویگن جموں سے مل جائیں گے۔ لوکل اسمگلروں سے اس نے بات کر لی تھی اور اس بات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے میں کنور رچھپال سنگھ نے بھی اُس کی مدد کی تھی۔

بشیشر پرشاد اس بار بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ میں بمبئی نہیں جاؤں گا۔ چھ سات دن ٹھہر کر دیگنیں اپنے سامنے لوڈ کرا کے جاؤں گا۔"

"سات دن کے بعد ہم بھی ہیروں کی تیسری قسط لے کر آ جائیں گے۔" میں نے اُس سے کہا۔

مگر ہمارا جوہری اس بار ہیروں سے اس قدر مرعوب نہیں معلوم ہوتا تھا پچھلی بار اس نے یہ معلوم کرنے کی ناکام کوشش کی تھی کہ ہم لوگ ہیرے کہاں سے لاتے ہیں مگر اس بار وہ ہیروں کو اتنی وقعت بھی دینے کو تیار نہ تھا کہ ان کے سلسلے میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولا "ہمارے خاندان میں پانچ پشت سے جوہری کا بیوپار چلا آ رہا ہے مگر جناب آج کل باسمتی چاول کا جو ایک ننھا سا دانہ بھی ہے نا، وہ کسی ہیرے سے کم نہیں ہے۔ دیکھ لینا۔ اس چاول کے دھندے میں ہم لوگ ایک سال میں کروڑ پتی ہو جائیں گے۔"

اُس کی منطق شاید صحیح ہوگی مگر چاولوں کے متعلق اُس کے بڑھتے ہوئے اشتیاق سے میں کچھ بور ہونے لگا تھا۔ اب تک میں باسمتی چاول بڑے شوق سے کھاتا تھا مگر جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ انہیں عرب ملکوں میں اسمگل کر کے لاکھوں کی ہیرا پھیری کی جا رہی ہے، میری بھوک چاولوں کے لئے بہت کم ہوتی جا رہی تھی۔ سفید چاولوں کی پلیٹ میز پر دیکھ کر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک روپے کے دانے دار کر کرے نوٹ پلیٹ میں بڑے ہیں اور نوٹوں سے بھری پلیٹ کو کون کھا سکتا ہے۔ اب لگتا ہے کہ جب چیزیں کرنسی میں بدلتی ہیں تو ان کا ذائقہ بھی بدل جاتا ہے بلکہ اندرونی شکل بھی بدل جاتی ہے اور ان کا استعمال بھی بدل جاتا ہے۔

ہم سات دن بعد پھر ملنے کا وعدہ کر کے بشیشر پرشاد سے رخصت ہوئے مگر ماجد وہیں جموں میں مزید انتظام کرنے کے لیے بشیشر کے اصرار پر ٹھہر گیا۔

میں اور رچھپال سنگھ بشیشر پرشاد کو الجھاوے میں رکھنے کے لیے جموں سے دلی گئے۔ بشیشر پرشاد کے ایجنٹ ہیروں کی کان معلوم کرنے کے لیے ہمارا تعاقب نہ کریں۔ اس لیے ہم دلی سے بذریعہ طیارہ سری نگر گئے۔ سری نگر سے بذریعہ کار بٹوت آئے اور

بنوت سے پٹنی ٹاپ۔

اب تیسرا دسواں دن آ پہنچا تھا۔ اس بار گنگا سہائے نے ہمیں ہیروں کی تیسری اور آخری اور سب سے بڑی قسط دینے کا وعدہ کیا تھا۔

وہ خلاف توقع بادلوں سے ڈھکا ہوا دن تھا۔ بادل پٹنی ٹاپ کے جنگلوں میں اتر آئے تھے اور بنوت کی طرف جا رہے تھے۔

چاروں طرف ایک خنک دھند چھائی ہوئی تھی اور یہ دھند لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

کنور رچھپال سنگھ نے متفکر نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔

بولا۔ ''اس موسم میں تو ایسا موسم ہوتا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں آج کل موسم بھی غیر یقینی ہے۔''

''جلدی چلنا چاہیے۔'' رچھپال سنگھ نے مشورہ دیا۔

ہم نے سوئیٹر، برساتی، وسکی ساتھ لے لی۔ گرم چائے اور سینڈوچ ساتھ رکھ لیے۔ جیپ نکالی اور چل دیئے۔ ہر بار ہم لوگ کسی مختلف مقام پر جیپ کو کھڑا کر دیتے تھے۔ اس بار تین میل اِدھر ہی ایک ایسے خفیہ مقام پر جیپ کھڑی کر دی۔ وہاں سڑک پر سے وہ جیپ کسی کو آسانی سے نظر نہ آ سکتی تھی۔ اس کے بعد جنگل جنگل ہو لیے۔ قدم بڑھاتے بڑھاتے کان کے عقب میں پہنچ گئے۔

موسم بڑا غیر یقینی تھا۔ بنوت سے کافی نیچے تک ہمیں دھند ملی تھی اور بادلوں کے مرغولے۔ پھر رام بن کی طرف جاتے جاتے یکایک مطلع صاف ہو گیا اور سورج چمکنے لگا۔ پھر تین میل کی جنگلی چڑھائی میں سورج ہمارے ساتھ رہا اور دیودار اور چیڑھ کے درختوں کی آڑ سے ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔

مگر کوئی پانچ بجے کے قریب آسمان پھر ابر آلود ہو گیا اور بادلوں کے غول کے آسمان سے جنگلوں پہ اترنے لگے اور خنکی بڑھتی گئی۔ جب ہم کان کے عقب میں پہنچے تو دھند اوپر کے جنگل سے نیچے کو آ رہی تھی۔ نہایت خاموشی سے سبز رنگ شاخوں پر سفید سہانے ڈالتی ہوئی نیچے آ رہی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ پھر پیچھے مڑ کر اوپر دیکھا۔ ٹکرائی

نالے کی آواز تیز ہو رہی تھی۔ شاید اوپر تکرائی پہاڑ کی چوٹیوں پر بارش ہو رہی تھی۔

میرے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی اور دل میں ایک نامعلوم خطرے کا احساس جاگتا گیا۔ دھند، بارش، پہاڑی نالے کی روانی، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ آج ہمیں جلدی اپنا کام ختم کر کے چلا جانا چاہیے۔ اگر دھند اور نیچے آ گئی یعنی چٹانوں تک تو پھر آج کی ساری محنت اکارت جائے گی۔ نہ میں گنگا سہائے کو دیکھ سکوں گا۔ نہ گنگا سہائے مجھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دھند نہایت تیزی سے مگر انتہائی خاموشی سے کسی چالاک مجرم کی طرح بے آواز قدموں سے جنگل کے نیچے اتر رہی تھی۔ ابھی تین منٹ باقی تھے۔!

مگر میں نے چانس لیا۔ ایک چٹان پر کھڑا ہو کر کان کی طرف دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ادھر گنگا سہائے بھی عجلت میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنی خفیف جگہ سے باہر آ کر بالمقابل چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کرنسی نوٹوں کی بھری ہوئی تھیلی اُس کی طرف پھینکی۔ جس کو اُس نے فوراً دبوچ لیا۔ پھر اُس نے ہیروں سے بھری تھیلی میری طرف پھینکی جسے میں نے ہوا میں کیچ کر لیا۔

اور اب میں اس اپنی جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ کسی پستول کی نال کو میں نے اپنی پیٹھ پر محسوس کیا اور کسی نے اپنی شیریں نسوانی آواز میں مجھ سے کہا "یہ تھیلی مجھے دے دو۔"

میں نے آواز پہچان لی۔ یہ جین کی آواز تھی۔ میں نے اُسے تھیلی دے دی۔

"خبردار۔" کنور رچھپال سنگھ کی آواز آئی اور اس نے یہ کہتے ہوئے جین کو اپنے ریوالور کے نشانے میں لے لیا۔ "تھیلی اِدھر لاؤ۔"

اب جین کے لیے کوئی چارہ نہ تھا اس نے وہ ہیروں سے بھری تھیلی رچھپال سنگھ کی طرف بڑھا دی۔

رچھپال سنگھ نے تھیلی لے کر اپنی اندر کی جیب میں رکھ لی۔ جیب میں رکھ کر اُس نے جین سے پستول مانگا جو جین نے اُس کی طرف پھینک دیا۔ رچھپال سنگھ جین کی پریشانی دیکھ کر ہنسا۔ بولا۔ "مادام یہ کام عورتوں کا نہیں ہے۔"

اب دھند نیچے تک آ چکی تھی اور ہمارے اِردگرد گھوم رہی تھی۔ ہمارے چہرے دھندلانے لگے تھے۔ رچھپال سنگھ نے جین کا ہاتھ پکڑا۔ بولا۔ "آج قابو میں آئی ہو"

ساری کسر نکال لوں گا۔ چلو ہمارے ساتھ۔"

مگر میں نے دیکھا جین برابر مسکراتی رہی تھی۔ وہ رچھپال سنگھ کے کہنے پر قدم بڑھانے لگی۔ میں اس کی مسکراہٹ سمجھ نہ سکا۔

رچھپال سنگھ چٹانوں پر کودتا ہوا چند قدم ہی گیا ہوگا کہ دھند میں اس کے عقب میں ایک چہرہ ابھرا اور اُس نے رچھپال سنگھ کو ایک ایسی پٹخنی دی کہ رچھپال سنگھ چٹان سے گر کر نیچے نالے کے پانی میں آ رہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حملہ آور بھی رچھپال سنگھ کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میں نے اسے رچھپال سنگھ کی اندرونی جیب سے تھیلی نکالتے ہوئے دیکھا۔ معاً رچھپال سنگھ داؤ لگا کر اس پر جھپٹ پڑا اور دونوں میں کشتی ہونے لگی۔

عین اسی وقت میں نے دور اوپر ٹکرائی کے پہاڑ کی چوٹی سے چٹانوں کے گڑگڑانے کی آواز سنی۔

ایوالانش چل چکی تھی۔

ہزاروں، کروڑوں من چٹانوں، درختوں، مٹی اور پتھروں کا ملبہ لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ اور وہ دونوں لڑ رہے تھے اور اب جین بھی اس لڑائی میں شامل ہو چکی تھی۔ یکا یک بجلی کوندی۔ پھر بادل زور سے گرجا۔

بجلی کی روشنی میں، میں نے حملہ آور کا چہرہ دیکھ لیا اور اس کی گردن کا تل، یہ ہنری کا ٹز وائیلڈ تھا۔

"ایوالانش۔ ایوالانش۔" میں زور سے چلایا اور دوسرے لمحے میں، میں نے دونوں ہاتھوں سے لڑتی ہوئی جین کو دبوچ لیا اور چھلانگ مار کر انتہائی تیزی سے دوڑتے ہوئے ایوالانش کی زد سے باہر ہوگیا۔

مگر ہنری کا ٹز وائیلڈ اور کنور رچھپال سنگھ کے کانوں میں بہت دیر سے وہ اطلاع آئی اور جب وہ مٹی اور پتھر اور چٹان اور درختوں اور جھاڑیوں کا عفریت ایک خوفناک گولے کی صورت میں نیچے اترتا ہوا انہیں اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا انتہائی تیزی سے نیچے چناب کے پانیوں میں اتر گیا۔ پھر دور دور تک زمین کانپی۔ چناب کا پانی بلیوں اُچھلا۔ پھر چند لمحوں کے لیے جیسے کائنات کا سانس رک گیا۔ پھر ٹکرائی نالے کی پرشور روانی میں چٹانوں کے

گڑگڑانے کی آواز جیسے ایک ساتھ ہزاروں بم پھٹ رہے ہوں۔ پھر ایک دم خاموشی۔

میں کچھ نہیں کہہ سکتا کب تک جین کو اپنی بانہوں میں اُٹھائے دوڑتا رہا۔ بھاگتا رہا، ہانپتا رہا، رک رک کر پھر تیزی سے چلتا رہا۔ میرے اندر سمت کا صرف ایک ہی احساس تھا۔ مجھے جلد سے جلد کسی نہ کسی طرح ایوالانش کے پہاڑی علاقے سے رخصت ہو جانا چاہیئے۔!

جین میری بانہوں میں بے ہوش تھی۔

بہت دور چلنے کے بعد مجھے اپنی جیپ نظر آئی۔ اب کہیں کہیں بادل پھٹنے لگے تھے۔ کہیں کہیں ٹکڑیوں میں آسمان پر تارے بھی نظر آنے لگے تھے۔ میں نے وہسکی کا ایک بڑا پیگ جین کے گلے میں انڈیل دیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں اور سر کو سہلانے لگا۔

یکایک جین نے آنکھیں کھول دیں اور میرے لیے فضا میں دور دور تک بنفشے کے پھول کھل گئے۔!

اور اب ٹِنی ٹاپ کی آرام دہ کاٹج میں ہم دونوں ایک ہی بستر پر ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے دیر سے باتیں کر رہے تھے۔ رات بہت ہو چکی تھی مگر ہمیں اس کا احساس نہ تھا۔ باتیں ختم ہی نہ ہوتی تھیں۔

”شکنتلا کہاں ہے؟ یہ تو میں پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔“

”بڑی کابل لڑکی تھی۔ اپنا حصہ لے کر اپنے شاعر خاوند کے پاس چلی گئی۔ جب تک وہ اور اُس کا شرابی شاعر روپے ختم نہ کرلیں گے، وہ واپس نہ آئے گی۔“

میں نے جین کے بالوں میں گرہ لگائی۔

”اور ہنری کارٹرز وائیلڈ نے تمہیں، مجھے دھوکا دینے کے لیے کیسے مجبور کر دیا؟“

”وہ۔“ جین نے کسی طرح ہچکچا کر کہا۔ پھر چپ ہوگئی۔

”شاید اسے تمہارے بہت سے راز معلوم ہوں گے۔“

”ہاں۔“ جین نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ”مگر وہ میرا شوہر بھی تھا۔“

”ارے۔ وہ ویت نامی جنگ کا ہیرو؟“ میں نے چلا کر پوچھا۔ ”وہ تو مر گیا تھا نا؟“

”وہ جو میرا ہیرو تھا۔ کالج کا آدرش وادی نوجوان۔ وہ تو ویت نام کی جنگ میں ختم ہو گیا مگر اس کے جسم میں ایک دوسری شخصیت نے جنم لیا۔ وہ شخصیت جو جنگ کی طرح ہی

ظالم تھی اور وحشی اور لالچی اور بربریت پسند۔ ایک دن وہ ویت نام سے بھاگ آیا اور کسی طرح اُس نے چالاکی سے اپنا نام مردوں کی فہرست میں لکھوا دیا۔ ویت نام کی قتل گاہ میں میرا جان کہیں کھو گیا اور اُس کے بجائے ایک ظالم اور سخت گیر، جنگ کی طرح جابر ہستی میرے ہاتھ آئی۔ جنگ سے بھاگ کر وہ ہندوستان آ گیا۔ یہیں پر پھر میری اُس کی ملاقات ہوئی مگر وہ بالکل بدل گیا تھا۔ اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس سے محبت کرتا تھا جو میں اُس کے لیے کر سکتی تھی۔ میرا اور اس کا کئی بار جھگڑا ہوا۔ کئی بار الگ بھی ہوئے مگر پھر مل گئے۔ تم اسے عادت کہہ سکتے ہو۔ میں بھی تو وہ معصوم امریکی لڑکی نہیں رہی۔ زندگی کے کمپس کالج کے کمپس سے بہت الگ ہے۔ بہت مختلف ہے۔ بہت ہی کمینہ ہے۔'' وہ تلخی سے ہنسی۔

پھر اُس نے اپنی چھنگلیا سے میرے ہونٹوں کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ایک بات بتاؤں۔''

''ہاں۔''

''وہ ہیروں سے بھری تھیلی میرے پاس ہے۔''

مین اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تمہارے پاس کیسے؟''

''میں نے اُسے ہنری کی جیب سے نکال لیا تھا۔ دکھاؤں؟''

''دکھاؤ۔''

وہ پلنگ سے اُٹھ کر ایک تپائی کی طرف گئی جہاں اُس کا بیگ رکھا تھا۔ بیگ کھول کر وہ تھیلی نکال لائی بلاشبہ وہی تھیلی تھی۔ سبز مخمل کی بھری بھری تھیلی، سرخ رنگ کی ڈوریوں سے کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ جین پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ بچوں کی طرح پرشوق لہجے میں بولی۔ ''آؤ ہیرے گنیں۔''

اس نے ڈوری کھینچ کر تھیلی کھولی اور پھر اسے ہم دونوں کے درمیان پلنگ کی چادر پر اُلٹا کر دیا۔

ہیرے لڑھک کر ہم دونوں کے درمیان بستر کی چادر پر گرتے گئے مگر وہ ہیرے نہ

تھے محض پتھر تھے......چھوٹے چھوٹے پتھر......

جین کی آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔اس کے چہرے کی مایوسی دیکھنے کے لائق تھی۔
میں بھی چند لمحے بالکل خاموش رہا۔پھر میرے ہونٹوں سے جو ہنسی چھوٹی ہے وہ کس طرح بند ہونے میں آتی تھی۔جین نے بار بار میرا کندھا ہلا کر کہا۔''کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا ہوا تمہیں؟''میں نے کسی طرح اپنی ہنسی روک کر کہا۔آخری داؤ گنگا سہائے کے ہاتھ رہا۔اس نے روپے بھی کمائے اور اپنی نوکری بھی بچالی۔آج وہ جرار حسین کو توال اور اپنی کشمیر گورنمنٹ دونوں کے سامنے سرخرو ہو گیا۔واہ......واہ......واہ......!

''اب تم کیا کرو گے؟''جین نے رک کر مجھ سے پوچھا۔''ماجد کو کیا منہ دکھاؤ گے؟''

''کون ماجد کو منہ دکھانا چاہتا ہے......الوداع ماجد۔''میں نے ہوا میں ہاتھ ہلا کر کہا۔

''اور تمہارے اس حصے کا کیا ہوگا جو تم نے چاولوں کو سمگل کرنے کے دھندے میں لگایا ہے؟''

''اس سے بشیشر پرشاد اور ماجد کی تجوری بھر جائے گی۔''

''کیوں۔''

''کیونکہ مجھے چاولوں سے بڑی محبت ہے۔میں انہیں بڑی رغبت سے کھاتا ہوں مگر جس دن سے میں نے چاولوں کی اسمگلنگ شروع کی ہے۔میں چاول کے دانوں کو ہیرے کے ریزوں کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔چاول کے لیے میری بھوک ہی جاتی رہی ہے۔''

''تم عجیب وغریب آدمی ہو۔''

''نہیں۔میں بہت ہی معمولی آدمی ہوں۔بہت معمولی سی خواہش ہے میری چند لمحوں کے لیے میں بھٹکا۔چند دنوں کے لیے بہکا تھا۔پھر راستے پر آگیا۔''

''اب تم کیا محسوس کرتے ہو؟''

''گندا،ناصاف۔میلا،چیکٹ بھرا۔نہانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔''

''تو پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''پھر سے اپنا وہی پیشہ اختیار کروں گا۔آرکی ٹیکٹ کا مگر فی الحال بمبئی نہیں جاؤں گا۔ابھی جی چاہتا ہے کہ زندگی کی سادہ چیزوں کے ساتھ لگ کر رہوں جیسے جنگل میں

چرتی ہوئی بھیڑیں۔ جیسے اڑتے پرندے، جیسے بہتا پانی جیسے......'' میں جین کی طرف دیکھ کررک گیا۔

''جیسے عورت کی محبت۔'' جین نے اپنا گال میرے گال پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سنو جان۔ رمیش علی جو کوئی بھی تم ہو۔ میں زندگی بھر تمہارے ساتھ ایک خیمے میں رہوں گی اور دونوں وقت تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے کھانا بناؤں گی۔ کسی پاکیزہ معصوم جھرنے کے کنارے جو مجھے وہی معصومیت اور پاکیزگی دے سکے جو مجھ سے کھوئی گئی ہے...... سچ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟''

میں نے جین کے بالوں میں ایک اور گرہ لگائی۔ آخری۔

پھر اسے اپنی چھاتی سے لپٹایا اور کہا۔''ہاں ایسا ہوسکتا ہے۔''

محبت بھی، قیامت بھی
(ناول)

گاڑی جب بھنسارا جنکشن پر رکی تو میری برتھ کے سامنے والی برتھ پر نیم دراز آدمی نے مجھ سے کہا۔

"بابو یہ کون سا اسٹیشن ہے؟"

حالانکہ وہ خود ذرا سا اٹھ کر اور کھڑکی کی طرف جھک کر باہر پلیٹ فارم کے ایک کھمبے پر لگے ہوئے جنکشن کے بورڈ کو پڑھ کر معلوم کر سکتا تھا کہ کون سا اسٹیشن ہے مگر وہ آدمی اس قدر موٹا تھا، اس قدر پھیلا ہوا بھدا اور پلپلا تھا کہ اسے ذرا سا اٹھنے اور اٹھ کر گردن گھما کر کھڑکی کی طرف جھکنے میں اتنی ہی تکلیف ہوتی جتنی کسی تگڑے آدمی کو دو من کا بوجھ اُٹھانے میں۔

راستے بھر وہ مجھ سے خدمت لیتا آیا تھا اور میں اس کی ڈیوٹی بجاتا آیا تھا حالانکہ نہ میں اسے جانتا تھا نہ اس یک نام سے واقف تھا نہ دور دور تک میں کہیں اس کا رشتہ دار تھا۔ تو بھی اسے آرام پہنچانا میں نے اپنا فرض سمجھا کیونکہ وہ اس قدر موٹا آدمی تھا کہ یقین ہوتا تھا کہ وہ خود ٹرین تک چل کے نہ آیا ہوگا بلکہ کرین سے اُٹھوا کر یہاں تک پہنچایا گیا ہوگا۔

اس کا رنگ بھینس کا سا تھا، اسی طرح بے ہنگم اور بھدا تھا آواز بھی ویسی تھی، منہ مارنے اور چرنے کا ویسا ہی شوق رکھتا تھا اور کھاتے ہوئے اسی طرح جگالی بھی کرتا تھا۔

مجھے اسے دیکھ کر سخت کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس پر بھی جو میں اس کی خدمت پر آمادہ کر دیا گیا تھا تو محض اس کی مجبوری اور لاچاری دیکھ کر، ذرا سا ہلنے سے، محض ایک بازو کی جنبش جو ایک تھرماس کو اٹھانے میں درکار ہوتی ہے، محض اس ہلکی سی جنبش سے جس طرح بازو کی جنبش سے جو ایک طرح اس کا سانس پھولنے لگتا تھا، اس سے مجھے سخت تکلیف ہوتی تھی میں اُس کی خدمت اس طرح کر رہا تھا جیسے ایک ڈنگر ڈاکٹر کسی زخمی جانور کی خدمت کرتا ہے۔

میں نے اسٹیشن کی دیوار سے لکھے ہوئے پہلے حروف کو دیکھ کر کہا۔

''یہ بھنسارا جنکشن ہے۔''

یہ نام سنتے ہی اُس کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔ چھوٹی چھوٹی چوہے کی سی آنکھیں بجلی کے بلب کی طرح چمکنے لگیں۔

بولا...... ''یہاں کے وہی بڑے بے حد مزیدار ہوتے ہیں، بابو مہربانی کرکے میرے لیے ایک روپے کے دہی بڑے لینا۔''

اس نے بڑی مشکل سے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپے کا نوٹ برآمد کیا۔

میں نے کہا ''دو روپے کے کیوں نہ لے لوں، بعد میں پھر مانگو گے!'' اب تک مجھے اس کے چٹورپن کا اندازہ ہو چکا تھا۔

میں اُس کے چہرے کی کشمکش پڑھنے لگا میری بات اسے پسند آئی تھی، لیکن جیب سے دوسرا روپیہ نکالنے میں دشواری تھی، وہ اس دشواری سے بچنا چاہتا تھا۔ دو روپوں کے دہی بڑوں کی چاہت اور جیب سے دوسرا روپیہ نکالنے کی کوفت، دونوں احساس اس کے چہرے پر دھوپ چھاؤں کی طرح کھلنے لگے۔

میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا ''بعد میں دوسرا روپیہ دے دینا، میں اپنے پاس سے لے آتا ہوں۔''

موٹے آدمی کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے آثار نمودار ہونے لگے، مگر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے فوجی کے چہرے پر غصے اور تناؤ کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس نے موٹے آدمی سے کہا۔

''دوسروں سے کام لیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی اگر خود اپنا کام کرو تو شائد اتنے موٹے نہ رہو۔''

''تم کو کیا ہے؟'' وہ موٹا آدمی جز بز ہو کر بولا، تم سے تو کوئی کام کو نہیں کہہ رہا ہوں جس سے کہہ رہا ہوں وہ اگر خوشی سے کر دیتا ہے تو تمہارا کیا بگڑتا ہے؟''

''مجھ سے کوئی کام کہہ کے تو دیکھو۔'' وہ فوجی برافروختہ ہو کر بولا۔

اس کے بعد اس نے خاموشی سے اپنی رائفل کے کندھے کو ہاتھ لگایا اور بولا

''تمہارے جیسے چوروں نے اس دیش کی حالت بگاڑ رکھی ہے، کام کریں گے نہیں بس بیٹھ کے کھائیں گے اور دوسروں پر حکم چلائیں گے۔'' موٹے آدمی نے اخبار منہ پر رکھ لیا۔

فوجی بولا۔ ''ایسے ہی خدمت کرانے کا شوق ہے تو کسی نوکر کو ساتھ لائے ہوتے۔''

موٹے آدمی نے اخبار منہ سے ہٹا کر کہا

''میری بیوی اگلے اسٹیشن سے سوار ہوگی۔'' اتنا کہہ کر اس نے اخبار پھر منہ پر رکھ لیا۔

میں کوپے سے باہر نکل گیا۔ کوریڈور سے گزر کر بوگی سے باہر نکل کر دہی بڑے والے کے ٹھیلے تک بڑی مشکل سے پہنچا، وہاں بہت بھیڑ لگی تھی مگر دو روپے کے دہی بڑے کی بات سن کر ٹھیلے والے نے بہت سے گاہکوں سے پہلے مجھے ایک کلھڑ میں دہی بڑے تھما کر دو روپے لے لیے جب دہی بڑے والے سے رخصت ہوا تو کئی گاہک غصے سے میری طرف دیکھ رہے تھے اتنے میں ریل نے سیٹی دی۔

گاڑی چلنے لگی۔ کسی نہ کسی طرح دوڑتا، ہانپتا ہوا میں اپنی بوگی میں سوار ہو ہی گیا۔

واپس کوپے میں پہنچا تو فوجی کے ماتھے پر بدستور بل تھے اور گہرے ہو گئے تھے۔

موٹا آدمی بے حد زور کر کے اور کسی حد تک میری مدد سے اُٹھ کر اور ٹیک لگا کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند منٹ تک اس کا دم پھولتا رہا لیکن جب تک اس کا دم پھولتا رہا، برابر اُس کی نگاہیں دہی بڑوں سے بھرے ہوئے کلھڑ پر جمی رہیں۔

جب اس کے دم میں دم آیا، اس نے نگاہوں کے اشارے سے مجھے دونوں برتھ کے درمیان کھڑکی کے نیچے لگی میز سے کلھڑ اُٹھانے کو کہا۔

موٹے آدمی کے ہاتھ میں کلھڑ دے کر میں فوجی کے قریب بیٹھ گیا۔ ہم دونوں موٹے آدمی کو دہی بڑے کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ جس انہماک سے وہ دہی بڑے کھانے میں جٹا ہوا تھا۔ اب وہ نہ میری طرف دیکھ رہا تھا نہ فوجی کی طرف......

فوجی نے مجھ سے پوچھا ''یہ تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''کوئی دوست؟''

میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

''کوئی جان پہچان والا؟''

میں نے مسکرا کر فوجی سے کہا''اسی ٹرین میں اس سے ملاقات ہوئی۔''

''تو پھر اس محنت سے اس کی خدمت کر رہے ہو؟''

''محض انسانیت کی خاطر۔''

فوجی نے ایک دم بھڑک کر کہا''تو انسانیت کی خاطر میری جوتوں پر پالش بھی کرو''

فوجی نے پاؤں میری طرف بڑھایا۔

میں نے اُس کے پاؤں کو زور سے ٹھوکر ماردی۔ فوجی کا ہاتھ لپک کے قریب ہی کھڑی رائفل پر گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے اٹھالیتا، موٹے آدمی نے خالی کلھڑ کی طرف دیکھ کر بڑے حیرت سے کہا۔

''یہ تو......یہ تو......بہت کم رہا......''

بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔ فوجی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔ اس کا ہاتھ رائفل سے اُٹھ کر تہدیدی انداز میں موٹے آدمی کی طرف بڑھ گیا۔

''اتنا مت کھاؤ، مت کھاؤ۔'' فوجی کی انگلی موٹے آدمی کے پیٹ کی طرف اشارہ کرنے لگی''پیٹ پھٹ جائے گا، مر جاؤ گے۔''

موٹا آدمی بولا''میرا جسم تم دونوں کو ملا کر بھی تم دونوں سے چوگنا بڑا ہوگا اس کو اتنی خوراک چاہیے۔''

''اور ملک میں قحط ہے۔'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

فوجی بولا''اور اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر ہے''

فوجی نے مجھ سے کہا''تمہارے جیسے دھرماتما لوگ ہی ان سیٹھوں کی عادتیں بگاڑ کے رکھ دیتے ہیں اب اس موٹو کو دیکھو انگلیوں میں قیمتی ہیروں کی تین انگوٹھیاں پہن رکھی ہیں، کوئی انگوٹھی بھی چالیس ہزار سے کم نہ ہوگی مگر ایک نوکر ساتھ نہیں رکھیں گے۔''

سیٹھ بولا۔''اگلے اسٹیشن پر میری بیوی آئے گی''

فوجی بولا''وہ بھی تم سے کچھ کم نہ ہوگی، دس من کی لاش''

سیٹھ کا چہرہ غصے سے تپنے لگا، چوہے جیسے گھٹی گھٹی چمکتی آنکھیں، بجلی کی لپک بن

گئیں، ہونٹ اندر کو بھینچ گئے۔ فوجی اسے ستانے کی خاطر بولا ''میں نے دیکھا ہے کچھ عرصے کے بعد موٹے آدمیوں کی بیویاں بھی اپنے شوہروں کی طرح موٹی گل گوتھنی ہو جاتی ہیں۔'' سیٹھ کے ہونٹ کپکپانے لگے مگر کچھ نہیں بولا کیونکہ فوجی نے پھر اپنا ہاتھ رائفل پر رکھ لیا تھا۔ میں نے فوجی سے کہا ''غصہ تھوک دو اگلے اسٹیشن پر اس کی بیوی آ رہی ہے وہ اسے سنبھال لے گی۔''

''مگر جب تک بھی یہ کوئی کام کہے مت کرو، اسے خود کرنے دو۔''

''ٹھیک ہے، اب ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے فوجی سے کہا اور پھر لہجہ بدل کر چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس سے پوچھا ''کہاں سے آ رہے ہو؟''

''دو ماہ کی چھٹی پر گھر جا رہا ہوں۔''

فوجی کا چہرہ گھر کی مسرتوں کے خیال سے چمکنے لگا۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

''تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میں'' کلکتے سے آ رہا ہوں ایک اخبار میں ایڈیٹر تھا مگر اخبار بند ہو گیا۔''

''ہاں آج کل کلکتے میں بڑی گڑبڑ ہے؟'' فوجی بولا۔

''اجی گڑبڑ کا کیا پوچھتے ہو۔'' وہ موٹا آدمی ہماری گفتگو میں دلچسپی لے کر بولا ''میں خود کلکتے سے بھاگ کر آ رہا ہوں، نکسلیوں نے ناک میں دم کر دیا میں نے خود کلکتے کا سارا کاروبار ٹھپ کر دیا ہے اب نئی فیکٹری بھوپال میں لگاؤں گا، کلکتے میں تو جینا بھی مشکل ہے، ہمارے تو آٹھ دس بھائی بند کلکتے سے ہمارے ساتھ بھاگے، کوئی بمبئی گیا، تو کوئی مدراس تو کوئی ترادنکور، تو کوئی کانپور، میں بھوپال جا رہا ہوں'' ذرا تھرماس سے پانی پلانا''

موٹے آدمی نے میری طرف عاجزی سے دیکھ کر کہا۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ فوجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ موٹے آدمی نے فوجی کا عندیہ سمجھ کر مجھ سے دوبارہ کچھ نہیں کہا، چند ثانیے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے قریب کی دیوار سے لٹکا ہوا تھرماس اتار لیا اور اسے کھول کر غٹا غٹ پانی پینے لگا۔

تھرماس آدھا خالی کر کے اُس نے اسے دوبارہ بند کیا اور اس خوف سے متاثر ہو کر کہ کہیں دوبارہ پیاس نہ لگے اس نے تھرماس کو قریب اپنی سیٹ پر ہی رکھ لیا۔ اس ساری کاوش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی اور چہرہ پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی آستین سے منہ کا پسینہ پونچھا پھر اخبار پڑھنے میں لگ گیا۔

کافی دیر تک ڈبے میں سناٹا رہا گاڑی کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کرتی ہوئی چلتی رہی، موٹے آدمی کو اخبار پڑھتے پڑھتے اونگھ آنے لگی۔ فوجی اس کی طرف غصے سے دیکھتا رہا۔

موٹا آدمی بے بس ہو کر بولا "مجھ نیند آرہی ہے مجھے برتھ پر لیٹ جانے دو۔"

"تو لیٹ جاؤ۔" فوجی بولا۔

"خود سے نہیں لیٹ سکتا اس بابو کو بولو میری مدد کرے۔"

"نہیں، یہ تمہاری مدد نہیں کرسکتا تم خود اپنی کوشش سے اپنی برتھ پر لیٹ جاؤ۔"

موٹے آدمی نے اپنے اِرد گرد پھیلے ہوئے گوشت کی تہوں کو دیکھا۔ پھر لیٹنے کی کوشش کو اپنے لیے ناممکن سمجھ کر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا، فوجی کا ہاتھ میرے کندھے پر بڑی مضبوطی سے رکھا ہوا تھا۔ میں موٹے آدمی سے نگاہیں پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

کوئی اسٹیشن قریب آرہا تھا آؤٹر سگنل گزر گئے گاڑی کی رفتار دھیمی ہوتی گئی، گاڑی اسٹیشن کے وارڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ پھر اسٹیشن کا پہلا وارڈ نگاہوں سے گزر گیا۔

"منگل کٹھا۔" اس اسٹیشن کا نام تھا، سنگِ مرمر کی بڑی بڑی سلیں اور تختے لکڑی کی شہتیروں کی طرح ایک دوسرے پر جٹے ہوئے تھے۔

شور، حرکت، گہما گہمی، آوازیں ایک دوسرے سے لڑتی ہوئیں!

چند منٹ کے بعد دو قلی سامان اٹھائے ہوئے ہمارے کوپے کے سامنے رک گئے۔ ان کے ساتھ ایک دس بارہ برس کا لڑکا بھی تھا۔

"آؤ آؤ کمل۔" ہمارے کوپے کے سیٹھ نے اُسے اشارہ کر کے کہا۔

"میں یہاں ہوں اس کوپے میں۔"

پھر چند ثانیوں کے بعد اس کوپے میں ہڑبونگ سی مچ گئی کمل اپنے چاچا جی کے

پاؤں چھور ہا تھا اور قلی کوپے میں سامان رکھ رہے تھے اور ہم لوگ اچانک حیرت زدہ ہو کر ایک نازک اندام جوہی کی کلی کی طرح سفید رنگت والی، بڑی بڑی آنکھوں والی، دھانی ساڑھی پہنے ہوئے ایک نوجوان عورت کو دیکھ رہے تھے جو سیٹھ کے قدموں پر جھکی جارہی تھی۔اس کا نازک شانہ سیٹھ کے بھاری بھرکم ہاتھ کے بوجھ سے لچک لچک گیا۔

''ٹھیک تو ہو سوگندھی؟'' سیٹھ خوشی سے منمنایا۔

کچھ پتا نہیں چلا کب قلی گئے، کب وہ دس بارہ سال کا لڑکا رخصت ہوا، کب گاڑی چلی، بس اتنا محسوس ہوا کہ گاڑی کب کی اسٹیشن سے نکل چکی تھی اور ہمارے سامنے سیٹھ کے پاؤں کے قریب وہ خوبصورت عورت کھڑی تھی بوٹا سا قد، ماتھے پر جھومر، سر پر پلو شرم و حیا کی تصویر مگر کتنی خوبصورت، ایسی خوبصورتی دیکھنے سے، دیکھنے کی بھوک اور بڑھتی ہے۔''

میں اور فوجی دونوں اس عورت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔

''تو یہ تھی سیٹھ کی بیوی۔''

سیٹھ نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا ''بیٹھ جاؤ سوگندھی''

سوگندھی نے سامان کا جائزہ لیا۔تھرماس کو قرینے سے لٹکا دیا۔ناشتے دان کو میز کے نیچے ہتھی کے سہارے سے لٹکا دیا اوپر کی سیٹ کی طرف مڑ کر اوپر رکھے ہوئے سامان کو سلیقے اور قرینے سے ٹھیک کرنے لگی اور نظر آئیں اُس کے ہاتھوں میں پھولوں کی طرح کھلنے والی انگلیاں، اس کی کمر کا خم اور کولہوں کے لوچ، پھر ایک دم پلٹ کر اس نے ساڑھی برابر کی جیسے اسے اس بات کا احساس ہو کہ یہ دو غیر آدمی اُس کے حُسن سے متاثر ہو کر اسے متواتر گھورے جارہے ہیں۔

پھر وہ سمٹ کر اپنے شوہر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔سیندور کا ایک بڑا سا ٹیکہ اس کے ماتھے پر دمک رہا تھا۔

''سوگندھی'' سیٹھ نے تھکے ہوئے لہجے میں اپنی بیوی کو پکارا۔''مجھے اس برتھ پر لٹا دو۔''

پیشتر اس کے کہ سوگندھی اپنی جگہ سے اٹھتی، میرے اور فوجی کے ہاتھ سیٹھ کی بغل میں آچکے تھے اور ہم دونوں کوشش کرتے ہوئے سیٹھ کو بڑے احتیاط سے اس کی برتھ پر لٹا رہے تھے۔

☆☆☆

”کسے معلوم تھا اس بڈھے سیٹھ کی بیوی اتنی خوبصورت ہوگی؟ فوجی نے کہا اس کا اشارہ کھلے طور پر ہمارے کوپے میں لیٹے ہوئے موٹے سیٹھ اور اس نوجوان بیوی کی طرف تھا، میں اور فوجی دونوں اپنے کوپے سے نکل کر باہر کوریڈور کے ایک کونے میں سگریٹ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے سیٹھ کو اس کی برتھ پر لٹا دیا گیا تھا۔ سیٹھانی کے لیے فوجی نے نچلی برتھ خالی کر دی تھی تا کہ رات کو اس خوبصورت عورت کو بار بار اوپر سے نیچے آنے جانے کے لیے اٹھنا چڑھنا نہ پڑے۔ دو تھرماس پانی سے بھروا کر سیٹھ کے قریب رکھ دیئے گئے تھے اور کینٹین سے گرم گرم کھانا دونوں میاں بیوی کے لیے منگوا دیا گیا تھا اور ایئر کنڈیشنڈ کلاس کے اٹنڈنٹ کی خوشامد کر کے دو تکیے سیٹھ اور سیٹھانی کے لیے منگوا دیئے گئے تھے۔

باہر چاندنی غضب کی تھی اور دھندلے اشجار اور دھندلے کھیت اور کسی، کسی گھر میں کہیں کہیں کوئی ٹمٹماتا ہوا بلب کسی موہوم امید کی طرح دل میں روشنی کرتا ہوا گزرتا جاتا تھا۔

ہم دونوں بہت عرصے سے گفتگو کر رہے تھے۔ فوجی نے اپنا نام رونق سنگھ بتایا تھا کل صبح نو بجے وہ شہد پارہ نام کے اسٹیشن پر اتر جائے گا، وہ شادی کرنے جا رہا تھا، دو مہینے اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا اس نے سنا ہے کہ ساوتری، اس کی ہونے والی بیوی خوبصورت ہے، اس سیٹھانی کی طرح تو شاید خوبصورت نہ ہو، اس عورت کو تو بھگوان نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔“

”مگر بنا کر کس کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔“ میں نے کہا ”اس کی بدقسمتی تو دیکھو۔“

”مگر اپنی بدقسمتی کا اسے بالکل احساس نہیں ہے۔“ فوجی بولا۔ ”ایسی ہوتی ہیں ہماری ہندوستانی عورتیں، شرم و حیا کی پتلیاں، وہ شوہر کا جسم نہیں دیکھتی ہیں اس کے نام پر زندہ رہتی ہیں، تم نے دیکھا نہیں وہ عورت کس طرح اپنے سیٹھ پر نچھاور ہو رہی تھی، کس طرح اس کی خدمت میں سچی لگن سے کام کر رہی تھی۔ ایسی ہوتی ہیں ہمارے دیش کی عورتیں“

میں نے کہا ”اس وقت وہ دونوں کوپے میں کیا کر رہے ہوں گے؟“

رونق سنگھ ہنس بولا ”ہاں یہ ایک بڑی مشکل ہے میرا خیال ہے سیٹھ تو سو گیا ہوگا وہ تو ہمارے سامنے ہی خراٹے لینے لگا تھا۔“

”اور وہ کامنی سی عورت؟“ میں نے پوچھا۔

رونق سنگھ کے منہ سے بے اختیار ایک آہ، نکل گئی، آہستہ سے بولا ''شائد وہ بھی سو گئی ہو گی؟''

''کیا تمہارا دل نہیں چاہتا ک ک کہ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر فقرہ نا تمام چھوڑ دیا میری آنکھوں میں شرارت تھی۔

وہ مسکرایا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ''اگر کوئی اور زمانہ ہوتا اگر میری شادی نہ ہونے کو ہوتی تو شائد میں تمہارے سیٹھ کے سامنے اُس کی سیٹھانی کو اغوا کر کے لے جاتا مگر اب تو میں خود شادی کرنے جا رہا ہوں، کسی کے گھر میں ڈھولک بج رہی ہو گی، کسی نے میرے نام پر بالوں میں خوشبو لگائی ہو گی، جانے وہ کیسی ہو گی؟

رونق سنگھ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ اس وقت یہاں نہیں ہے، چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر چاندنی میں نہاتے ہوئے کھیتوں اور ٹیلوں کو پھلانگ کر وہ شاید کہیں اور اپنی ساوتری کے گاؤں کو نکل گیا تھا صرف اُس کا جسم میرے سامنے کھڑا تھا، مگر اس کے اندر کی بے قرار روح کہیں بہت دور جا چکی تھی۔ اور مجھے کلکتے کی مے فیئر کی کافی بار میں اپنے کٹے ہوئے بالوں کو بار بار جھٹکانے والی آبھا مکر جی یاد آئی جو میری طرح ''کلکتہ سن'' میں ملازم تھی فرق صرف اتنا تھا کہ میں ایڈیٹر تھا اور وہ میری اسسٹنٹ ایڈیٹر یہ ہماری آخری ملاقات تھی کیونکہ ''کلکتہ سن'' بند ہو گیا تھا اور میں کلکتہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔

مے فیئر بار کے نیم اندھیروں میں میں آبھا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ سانولی سے ذرا کھلتی ہوئی رنگت، تنگ دہانہ اور ہونٹ ذرا ذرا سے کھلے ہوئے، جیسے کسی بوسے کے لیے بے قرار اور آنکھیں حیران حیران سی، پھر یکا یک پھلجھڑی کی طرح لمبی ہنسی جو آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی چونکا دے اور دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے ہماری طرف دیکھنے لگ جاتے۔ پھر خاموشی اور ایک نہ معلوم گہری اداسی جیسے آبھا کے سینے پر کسی گہرے غم کا دباؤ دھیرے دھیرے بڑھتا ہوا اور ایک گھونٹ کافی کے بعد کاجو کا ایک دانہ جیسے کوئی اتھاہ جھیل میں کنکر پھینک دے۔ کب سے آبھا کنکر پھینک رہی تھی میری طرف اور میں اس کے ہونٹوں کے ساحل کے قریب کھڑا اس کے غم سے متاثر تھا۔

''تم کیوں جا رہے ہو؟'' آبھا نے پانچویں بار پوچھا۔

میں نے پانچویں بار کہا" کیونکہ جس شاخ پر آشیانہ تھا وہ ٹوٹ چکی کلکتہ سن بند ہو گیا
میں کلکتہ رہ کر کیا کروں؟"

"کیا کلکتے میں سن کے علاوہ تمہاری اور کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" آبھا نے اٹھ کر پوچھا۔
آبھا کی آواز پتلی اور کٹیلی نہ تھی گہری اور گداز تھی لگتا تھا اس کی آواز کی انگلیاں
میرے چہرے کو چھو کر، آہستہ آہستہ مجھے ایک مخملیں لمس کا احساس دیئے جا رہی تھی، دھیرے
دھیرے کسی جھرنے کی طرح بہنے والی آواز...... آبھا کی آواز مجھے پسند ہے لگتا ہے سوز وساز
کی کئی گہری پرتیں اس آواز میں گھل رہی ہیں۔

"نہیں ایسا تو نہیں ہے۔" میں نے اس سے کہا" کلکتے میں ایک لڑکی رہتی ہے،
اُس میں مجھے دلچسپی ہے اور شائد اُسے بھی ہو۔"

"پھر......۔" آبھا کے ہونٹ تھوڑے سے اور کھلے۔

"مشکل یہ ہے کہ وہ لڑکی مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔"

آبھا نے ایک قاطع حرکت سے اپنے بال جھلائے بولی۔

"وہ لڑکی شادی کو ایک ڈھونگ سمجھتی ہے۔"

"اور ساتھ رہنے میں یہ برائی ہے کہ کسی دن وہ لڑکی مجھ سے ادب کر بھاگ جائے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے۔" آبھا بولی" کہ وہ مرد اس لڑکی سے ادب کر بھاگ جائے۔

میں نے کہا" اسے بھاگنا ہوگا تو شادی سے پہلے بھاگے گا۔"

ہمارے آس پاس کی میزوں سے دو جوڑے اٹھ کر چلے گئے باہر کا دروازہ ذرا سا
کھلا دوپہر کی جھلملاتی دھوپ چند لمحوں کے لیے ہم تک آئی پھر ہم سے تیر کے نیم اندھیروں
اور اس کی خنک فضا میں کھو گئی۔

آبھا ذرا سا آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر بولی۔

"ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے سات سال تک تم کلکتہ سن کے ایڈیٹر رہے ہو پانچ
سال تک میں اسٹنٹ ایڈیٹر رہی ہوں ہم لوگ دونوں مل کر ایک رسالہ کیوں نہ نکالیں اکھٹے
رہیں، اکھٹے کام کریں۔"

"اور اکٹھے بتاہ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

''تم ہر بات کو منفی رنگ میں لیتے ہو۔'' آبھا نے شکایت بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''آج کل کلکتے پر منفی رنگ غالب ہے، اسی لیے میں بھی اسی رنگ میں بات کرتا ہوں شخصی توڑ پھوڑ پائپ کی بندوقیں، ٹیگور سے انکار، انقلاب تو عوام کی انگوٹھی میں، ہیرے کے نگ کی طرح جڑا ہوتا ہے، وہ عوام سے دس میل آگے جا کر بھاگنے سے حاصل نہیں ہوتا، آبھا ڈارلنگ۔''

''مگر وہ نوجوان کتنے سچے اور بہادر ہیں، یہ تو مانو گے۔''

''مانتا ہوں۔''

''ان کے دل میں تبدیلی کی جوالا دہک رہی ہے تو کیا وہ چپ چاپ بیٹھے رہیں ناانصافی کے سامنے سر جھکا دیں، طاقت ور لوگوں کی لوٹ کھسوٹ کو ایک آرے کی طرح اپنے سینے پر چلنے دیں؟ ظلم کی تلوار کو میان سے نکلتے دیکھ کر کلکتے سے بھاگ جائیں۔''

''تم نے مجھے غلط سمجھا ہے آبھا کبھی کبھی دیئے کو اپنے چھپر کے بہت نزدیک رکھ دینے سے اپنے ہی گھر میں آگ لگ جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی غلط تدبیر خلوص اور سچ کے سینے میں تلوار کی دھار کی طرح اتر جاتی ہے۔ لوگوں کو ساتھ لیے بغیر آج تک کوئی انقلابی کوشش کامیاب نہیں ہوئی......!''

''یہ غلط ہے۔ ہم کوشش کرتے جاتے ہیں کامیاب ہوں یا ناکام، اس کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مگر کوشش فرض ہے۔ اگر ۱۹۰۵ کا انقلاب نہ ہوتا تو ۱۹۱۶ء کا انقلاب کیسے آتا؟''

''مگر وہ انقلاب تو ہو۔!''

''تم بزدل اور بھگوڑے ہو۔''

میں چپ رہا۔!

''تم نے پھر کس لیے اپنے گھر میں انقلابیوں کو پناہ دی۔ مہینوں تم نے نکسلیوں کو اپنے گھر میں چھپا کر رکھا اور پولیس نے تم پر کبھی شبہ نہ کیا، کیونکہ تم نے ہمیشہ سن میں نکسلیوں کی کاوشوں کا مذاق اڑایا میں سمجھتی تھی تم دل سے ہمارے ساتھ ہو۔!''

''میں دل سے تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں اس کے قریب جھک کر بالوں سے کھیلنے لگا۔ اس وقت مے فیر میں کوئی نہ تھا۔ کرسیاں میزیں خالی پڑیں تھیں دو ویٹر ایک کونے میں

اونگھ رہے تھے۔ کاؤنٹر کلرک پنسل کا ایک سرا منہ میں لیے بلوں کی رسید بک پر جھکا ہوا تھا۔!

''پھر تم کیوں جا رہے ہو۔'' آبھا نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

''مجھے یہ شہر پسند نہیں۔ مجھے کوئی شہر پسند نہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں ہر شہر سے جا رہا ہوں۔ میں اخباروں سے دور بھاگنا چاہتا ہوں۔ اگلے دس سال تک میں کوئی اخبار نہیں پڑھوں گا۔ سب لفظ بے کار اور ساری خبریں پرانی ہیں۔ میں کسی گاؤں میں جا کر رہوں گا اور کھیتی باڑی کروں گا یا کسی غار میں جا کر ایک بھالو کی طرح رہوں گا اور کسی شہد کی طرح میٹھی دیہاتن کو اغوا کر لوں گا۔ مجھے اس سے ے فیر سے ٹھنڈی کافی کے اس گلاس سے، ایرکنڈیشنڈ کمرے کی نقلی خنکی سے نفرت ہو چکی ہے۔ میں ایک کھلے آسمان کے نیچے پیڑوں بھری زندگی میں رہنا چاہتا ہوں۔ جہاں آنکھ کھلے تو اصلی ہوا ملے۔ پنکھے کی ہوا نہ ملے۔ زمین پر چلوں تو کھیتوں کی بھربھری مٹی میرے تلوے سہلائے۔ غالیچے کا مخملیں لمس نہیں اور جب رات میں کسی کے جھکے ہوئے چہرے پر دبی دبی محبت کا پرتو دیکھو۔ فلم زدہ محبت کی نقلی شاعری نہیں۔ا''

یکا یک ایک زور سے چانٹا میرے گال پر پڑا۔!

دیوار سے لگے لگے اونگھتے ہوئے ویٹر یکا یک جاگ گئے اور کاؤنٹر پر کھڑا ہوا کلرک بھی چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔ پھر پنسل منہ میں لے کر چبانے لگا۔

آبھا میز پر سر ٹیک کر رونے لگی۔

وہ دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ دیر تک میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ دیر تک کافی کا گلاس ٹھنڈا ہوتا رہا۔ دیر تک میں سوچتا رہا۔ یہ کس طرح کی محبت ہے، جذبے نہیں ملتے، جسم نہیں ملتے، فکر نہیں ملتی، پھر بھی کشش کی ایک ڈوری ہے جو ایک روح سے دوسرے کی روح تک پنہاں ہے۔!

آبھا یکا یک میز سے اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب واپس آئی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں اور چہرہ نئے میک اپ سے آراستہ اپنی کتنی ہی نا آسودگی کو عورت ایک نئے میک اپ سے چھپا لیتی ہے۔ مرد کو ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔!

واپس آ کر وہ میز پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی بڑے سپاٹ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

تو تم میرے ساتھ نہیں رہو گے۔''

''اگر شادی کرو گی تو رہوں گا مگر کلکتے میں نہیں۔''

''شادی ناممکن ہے۔ مجھے اپنی آزادی بہت پیاری ہے اور مجھے کلکتہ بھی بہت پسند ہے۔ تمہیں کلکتہ میں ہی رہنا پڑے گا۔ تمہیں شہر اس قدر ناپسند کیوں ہیں۔ انسان نے ساری ترقی شہر بسا کر ہی کی ہے۔ سائنس، کلچر، ادب، معاشیات، تہذیب، سماجیات، سب کا دامن شہر سے بندھا ہوا ہے۔ میں مانتی ہوں، قدرت کے حُسن پر اضافہ ہے۔ قدرت نے خوبصورت جنگل بنائے، انسان نے تاج محل، قدرت نے چلتے پانی کی موسیقی دی۔ انسان نے تان سین کی راگنی قدرت نے ہوا میں پھلانگتے ہوئے ہرن کی قلانچ، انسان نے جیٹ ہوائی جہاز، قدرت نے بھوج پتر دیا۔ انسان نے اس پر کالی داس کی شکنتلا لکھی شہر سے بھاگ کر کیا تم پھر جنگلی بننا چاہتے ہو؟''

''ہاں۔!''

''کیوں؟''

اس لیے کہ میں شہروں کے ظلم وستم سے عاجز ہوں۔ مجھ کو اب کنوارے پہاڑوں کی ہوا چاہیے۔ کسی کی نگاہ کی طرح افق پر کوندتی ہوئی بجلی، تمہارے بالوں کی طرح گھنیری گھٹا ٹوپ بدلیاں۔ یاد ہے جب دارجلنگ میں ہم دونوں کے سامنے یکا یک بادل ہٹ گئے تھے۔ دھیرے سے اسٹیج کے پردوں کی طرح سرک گئے تھے اور ان کے بیچ کنچن کا چہرہ یوں ابھر آیا تھا جیسے کوئی نئی دلہن اپنے چہرے سے گھونگھٹ سرکا دے۔ یہ تو صحیح ہے کہ شہروں نے قدرت کے حسن پر اضافہ کیا ہے لیکن حسین عورتوں نے اپنی اداؤں کا ہر انداز قدرت سے سیکھا ہے۔''

''تو تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپا لیا اور نہ صرف اس کے بالوں میں لگی ہوئی خوشبو بلکہ اس کے جسم کی خوشبو بھی میرے اردگرد لپٹنے لگی مگر میں نے اپنے ہوش وحواس مجتمع کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''مجھے جانے دو اس وقت جانے دو ممکن ہے میں کبھی واپس آ جاؤں گا مگر اس وقت

مجھے جانے دو۔!''

اس کے نیم وا ہونٹوں میں دانت جوہی کے غنچے کی طرح چمک اٹھے اور اندھیرے میں بہنے والے جھرنے کی طرح اس کی پتلیاں بھیگ گئیں۔ ایک دبی دبی سی آہ اس کے سینے سے نکلی یکایک اس نے اپنا ہاتھ بلاؤز میں ڈال کر ایک پرزہ نکالا اور اسے میرے سامنے میز پر پھینک کر چلی گئی۔!

میں نے پرزہ کھولا۔ خط نہ تھا۔ اس کی نئی انگریزی نظم تھی۔

''جو قدم اٹھتا ہے

سمجھتا ہے ہوا میں ہے

پھر دھرتی پر آتا ہے

وہیں سکون ہے

میں دھرتی ہوں

کشش

دامن

مرکز

مدار

پھر لوٹ کے آؤ گے اڑنے والے۔

کیونکہ میں دھرتی ہوں۔!''

ریسٹورنٹ کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔

میں نے چونک کر فوجی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی کہیں باہر تھا کسی شہنائی کی آواز پر دوڑا جا رہا تھا۔ ریل گاڑی سے بھی تیز۔ میں نے اپنے سگریٹ کی طرف دیکھا وہ میری آشاؤں کی طرح بجھ چکا تھا۔

میں نے سوچا فوجی شہنائی کی آواز پر دوڑا جا رہا ہے اور میں اس آواز سے دور جا رہا ہوں۔ آبادی سے پرے کسی جنگل کی تلاش میں آدمی شہر سے تو بچ سکتا ہے لیکن کیا وہ عورت سے بھی بچ سکتا ہے۔

میں کھڑا سوچتا رہ گیا۔ کوریڈور کے شیشوں پر آبھا کا چہرہ ابھرتا گیا اور گاڑی کی رفتار تیز ہوتی گئی۔

☆☆☆

آدھی رات کا وقت ہوگا۔ سیٹھ خواب غفلت میں تھا اوپر کی سیٹ پر فوجی کی سانس دھیرے دھیرے آرام سے چل رہی تھی۔ لگتا تھا گہری نیند میں ہے مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ خوبصورت سیٹھانی دھیرے سے اپنے برتھ سے اٹھی۔ کھڑکی سے برستی چاندنی میں اس کا شطاط بدن شب خوابی کے کپڑوں سے چھن گیا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

وہ ایک لوٹا لے کر باہر نکل گئی۔

سب سو رہے تھے۔!

میں جاگ رہا تھا۔!

دس منٹ گزر گئے پندرہ منٹ گزر گئے آدھ گھنٹہ گزر گیا اتنی دیر وہ کہاں کیا کر رہی ہے۔ جب پون گھنٹہ گزر گیا تو میں دھیرے سے سانس روکتا ہوا اپنی اوپر والی برتھ سے اترا اور خاموش قدموں سے باہر کوریڈور میں جا پہنچا۔ دونوں طرف نظر دوڑائی، کہیں پر کوئی نہ تھا۔ سب کمرے اندر سے بند تھے! کوریڈور کے آخر میں دونوں طرف باتھ روم تھے۔ یکا یک مجھے ایک باتھ روم پر زور زور سے تھپتھپانے کی آواز آئی۔

میں بے آواز قدموں سے تیز چلتا ہوا اس باتھ روم تک جا پہنچا۔ ایک نسوانی آواز گھبرائی ہوئی ٹائلیٹ کا دروازہ تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''مجھے باہر نکالو۔ باہر نکالو!''

میں نے کہا۔ ''اندر کا کھٹکا کھول کر باہر آ جاؤ۔!''

''وہ نہیں کھلتا'' آدھے گھنٹے سے کوشش کر رہی ہوں۔''

میں نے آواز پہچان لی۔ وہی اپسرا تھی۔

میں نے ٹائیلٹ کے دروازے کی طرف غور سے دیکھا عین بیچ میں کرومین کی چمکتی موٹھ تھی جو دائیں بائیں دونوں طرف گھومتی تھی۔ بائیں طرف گھمانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ دائیں طرف گھمانے سے دروازہ اندر سے بند ہو جاتا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ موٹھ

بائیں طرف ذرا سا گھوم کر جام ہوگئی تھی اور دندانے زنگ آلود تھے اس لیے حرکت نہ کرر ہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تھپتھپانا چھوڑ دو میں چند منٹ میں تمہیں باہر نکالے لیتا ہوں۔''

اُس نے اندر سے تھپتھپانا بند کردیا۔

میں نے جیب سے چاقو نکال کر دندانوں کو زنگ سے صاف کیا۔ اس کے بعد جو بائیں طرف پیچ گھمایا تو دروازہ کھٹ سے کھل گیا۔

سیٹھانی باہر نکل کر میری بانہوں میں بے ہوش ہوگئی۔

اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور پتلی ساڑھی جا بجا بدن سے چپکی ہوئی تھی۔

میں اسے بانہوں میں اٹھا کر دوسرے ٹائلٹ میں لے گیا۔ پہلے ٹائلٹ میں اس لیے نہیں لے گیا کہ کہیں اگر پھر سے دروازہ بند ہوگیا تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوگا۔

دوسرے ٹائیلٹ میں اس کے چہرے پر پانی کی دھاریں پھینک پھینک کر اسے ہوش میں لایا۔

یکا یک اس کی بڑی بڑی آنکھیں یوں کھلیں جیسے سطح آب پر کنول کھل جائیں۔

وہ کمزور آواز میں بولی۔ ''میں تو سمجھتی تھی کہ آج ساری رات ٹائیلٹ میں بند رہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں ٹائیلٹ جاتے دیکھا تھا۔ جب دیر تک تم نہ آئیں تو باہر کاریڈور میں آ گیا۔

''میں تو چلاتے چلاتے مر جاتی۔ کب سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔

یکا یک وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں اور میرے بازؤں کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی۔

میں اس کے چہرے پر جھک گیا اور میرے تپتے ہونٹ، خشک ہونٹ اس کے گیلے ہونٹوں سے مل گئے۔ وہ ہونٹ بالکل نرم بالائی تھے، لکھنؤ کی نمش۔! وہ دیر تک میرے بوسے میں کھلتی رہی اور اس کا سارا بدن کانپ کانپ کر مجھ سے زور سے چمٹ چمٹ گیا جیسے وہ صدیوں کی بھوکی تھی۔

اس کے بالوں کی ایک لٹ بھیگ کر اس کے رخسار سے آ لگی تھی میں نے اس لٹ

سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ تم کس جانور سے شادی کر رہی ہو؟''

''مجھے معلوم تو تھا۔''

''تو پھر کیوں۔''

اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ پھر اس نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھا کے میری تھوڑی کو چوم لیا۔

بولی ''مت پوچھو مجھ سے پیار کرو۔''

میں نے کہا ''میں تو پوچھوں گا۔''

وہ بولی ''ہم سات بھائی بہن ہیں۔ باپ اندھا ہے، ماں بوڑھی ہے سب سے بڑا بھائی انجینئرنگ کر رہا ہے، اس سے چھوٹا بھائی ڈاکٹری کا کورس کر رہا ہے۔ اس سے چھوٹا ٹیلی ویژن کا کورس کر رہا ہے۔ مجھ سے چھوٹی بہن کی شادی ہوگئی دو چھوٹی بہنوں کی شادی ہونے کو ہے۔ سارا خرچ سیٹھ اٹھاتا ہے۔ ایک ایک پائی۔''

میں نے سوچا۔ اس عورت کی وفا کتنی نازک لیکن مضبوط ڈوریوں سے سیٹھ کے موٹے بدن سے چپکی ہوئی ہے۔

''تمہیں کراہیت نہیں آتی۔''

''آتی ہے مگر اس پریوار کو کون سنبھالے گا۔''

''کوئی بچہ بھی ہے۔''

''نہیں سیٹھ نامرد ہے۔''

''تو پھر بچہ نہیں ہوگا۔''

''نہیں بچہ تو ہوگا۔''

''کیسے؟''

ہم لوگ بھوپال جا رہے ہیں، نیا بزنس کھولنے کے لیے بھوپال سے بیس میل دور باوا گوری سہائے کی سمادھی ہے۔ سنا ہے وہاں کا باوا رنگی رام داس بہت پہنچا ہوا ہے۔ اس کے آشیرباد سے بچہ ہو جائے گا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں کئی سادھو بچہ پیدا کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔''

"اب جو کچھ ہوگا سو ہوگا۔" خوبصورت سیٹھانی بولی۔ "ان کو بچہ چاہیے بچہ مل جائے گا ان کو۔"

"مگر وہ سیٹھ کا بچہ نہ ہوگا۔"

"کہلائے گا تو اسی کا۔" وہ کڑوے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ "یہ تمہارے بدن سے کیسی اچھی خوشبو آ رہی ہے، جوہی کی......"

وہ بولی "ہاں پیدا ہونے کے وقت ہی سے میرے بدن سے یہ خوشبو آنے لگی اس لیے میرے باپ نے میرا نام سوگندھی رکھ دیا۔ کبھی کبھی وہ مجھے دبوچ لیتے ہیں اور بار بار میرا بدن سونگھتے ہیں اور سونگھ سونگھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دیوار سے ٹکر مار لیتے ہیں۔

میرے دل میں سیٹھ کے لیے تھوڑی سی جگہ پیدا ہوئی پھر ابکائی سی آنے لگی۔ نہیں نہیں اس موٹے کو اس خوبصورت عورت کو چھونے کا حق بھی نہیں ہے۔ "سوگندھی، کیا تمہاری دوسری بہنیں بھی تمہاری طرح سندر ہیں۔"

"نہیں" وہ قطعیت سے بولی۔ وہ سب معمولی شکل وصورت کی ہیں۔ ایک مجھے ہی بھگوان نے اتنا سندر بنا کے اتنا بدقسمت بنا دیا۔"

وہ ذرا سی سسکی۔

میں اس کی موم کی شفاف گردن پر بوسے ثبت کرتا گیا۔ اس کی سسکیاں بڑھتی گئیں۔ اس نے اپنا چہرہ میرے سینے میں چھپا لیا۔

"سوگندھی میرے ساتھ چلوگی۔"

"کہاں؟"

"دور ہماچل کے کسی گاؤں میں یا کسی جنگل کے کنارے میں زمین خرید کر فارم بناؤں گا۔ کھیتی باڑی کروں گا۔ تم میری بیوی بن کر رہوگی۔ پھر ہمارے بچے ہوں گے اور وہ بڑے خوبصورت بچے ہوں گے۔"

میں بولتا چلا گیا اور وہ ہنستی چلی گئی اور خواب سے خواب اور امید سے امید ملتی چلی گئی اور زندگی کی شطرنجی بنتی چلی گئی۔ جیسے صبح کی دھوپ میں شبنم آلود دیواروں کے نیچے دوب پر سنہری شطرنجیاں بکھرتی چلی جاتی ہیں۔ میں اس کی حیران آنکھوں میں وہ سارا

تصویریں دیکھ رہا تھا جو مجھے کلکتے سے جنگل کی جانب لے جا رہی تھیں۔ وہ سپنے جنہوں نے مجھے آبھا سے چھڑا دیا تھا! پھر جیسے ہوا کے ایک جھونکے سے ان حیران آنکھوں سے کی ساری تصویریں تاریکی میں غائب ہوگئیں۔

وہ بولی۔ ''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں تو بیاہتا ہوں۔''

''نامرد سے فوراً طلاق مل سکتی ہے۔ اتنا قانون میں جانتا ہوں۔ دراصل یہ شادی ہی قانون کی نظر میں ناجائز ہے۔''

اس کے چہرے پر محبت، نور، اجالے کے نئے رنگ آئے۔ پھر اس نے افسردہ ہوکر سر ہلا کر کہا۔

''ہو نہیں سکتا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''وہ میرے دونوں بھائی کیا کہیں گے۔ ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ چھوٹا جو اسکول میں پڑھتا ہے اس کی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن ان دونوں بہنوں کا کیا ہوگا جن کی شادی کا سارا جہیز میرا پتی دے گا۔ پھر میرا اندھا باپ اور بوڑھی ماں اور میں خود۔''

''ہاں تم خود۔'' میں نے پوچھا۔

''سیٹھ نے مجھے ہر طرح کا آرام دے رکھا ہے۔ ہیرے جواہرات سے لاد دیا ہے۔ میں چاہوں تو روز ایک زیور خرید سکتی ہوں۔''

''یعنی ایک آرام طلب زندگی؟''

''ہاں نوکر چاکر، گھر، گاڑی، دولت مجھے کیا میسر نہیں ہے۔''

''سوائے ایک کے......'' میں نے اسے معنی خیز نگاہوں سے تاکتے ہوئے کہا۔

''جو قسمت میں نہیں ہے اس کا کیا ہوگا۔ صبر کرنا پڑے گا۔''

''تم کوئی عاشق کیوں نہیں ڈھونڈھ لیتیں۔''

''یعنی تم؟''

''مجھے نہیں تمہارے میرے خواب نہیں ملتے لیکن تم اپنے جسم کی پکار کے لیے کوئی عاشق تو ڈھونڈھ سکتی ہو۔''

اس کا چہرہ فق ہو گیا گہرے غم زدہ لہجے میں بولی۔ ''تم سچ کہتے ہو مگر کیا کروں مجھ پر
کڑی پابندی ہے۔''

''میکے میں بھی...... عام طور پر تمہاری ایسی عورتیں جب اپنے مائیکے جاتی ہیں تو ا
کھل کھیلتی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ جلدی جلدی اور بار بار میکے جاتی رہتی ہیں۔

''وہ حربہ بھی میں آزما کر دیکھ چکی ہوں سیٹھ بہت کائیاں ہے اس نے ایک ملازمہ
میرے لیے رکھی ہے وہ ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے جہاں میں جاؤں حد یہ ہے کہ
ٹائیلٹ کے دروازے تک میرے ساتھ جاتی ہے، چاہے سسرال ہو یا مائیکا سارے راستے
بند ہیں میرے لیے وہ پھر سسکنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مگر آج کی رات تو وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''کیونکہ میں سیٹھ کے ساتھ ہوں اور وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھی ہے۔''

''اس وقت تم سیٹھ کے پاس نہیں ہو۔ میرے پاس ہو۔''

وہ چپ رہی میرے کھلے کرتے کے اندر ہاتھ ڈال کر میرے سینے کے بالوں میں
دھیرے دھیرے انگلیاں گھمانے لگی۔ دھیرے دھیرے میرے سارے بدن میں
چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور میں اس کی صراحی دار گردن کے لمبے خم کو بار بار پاگلوں کی طرح
چومنے لگا۔

پھر ریشم پر ریشم بالائی پر بالائی پرتوں پر پرتیں۔
اور ساری فضا جوہی کی خوشبو سے بھر گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن صبح ہی سے میں نے سیٹھ کو باتوں میں لگا لیا باتوں ہی باتوں میں اس
نے باوا گوری سہائے کی سمادی پر جانے کا تذکرہ کیا۔ تو میں نے کہا۔

''عجیب بات ہے۔''

''کیا عجیب بات ہے جی؟'' وہ میری طرف دیکھ کر اپنی بھیانک آواز میں بولا۔

''عجیب بات یہ ہے سیٹھ جی کہ اس معاملے میں، میں آپ کی بہت مدد کر سکتا ہوں۔''

''کس طرح جی؟''

''میرے پاس ایک سدھی ہے۔''

''کیسی سدھی؟''

''ایک سادھو مہاتما نے مجھے دی تھی۔ اس کی ایک چٹکی کھلا کر منتر پڑھنے سے ٹھیک نو مہینے کے بعد بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔''

''تمہیں یہ سدھی یہ چٹکی کہاں سے ملی؟''

''میں نیپال کے جنگلوں میں بہت گھوما ہوں۔ بدھ سادھوؤں، مہاتماؤں کی سدا سے خدمت کرتا آیا ہوں۔ وہاں مجھے سوامی گولک ناتھ ٹرنکاری کے درشن کرنے کا موقع ملا۔ دو سال کی خدمت کے بعد انہوں نے مجھے یہ سدھی بخش دی۔ جس عورت کے چاہوں بچہ پیدا کر دوں۔''

''تم اس سدھی کا کیا لیتے ہو جی۔'' سیٹھ نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ لینا پاپ ہے۔''

''پھر بھی۔''

''بوجو دیا سیٹھ جی مجھے میرے گرو نے بتایا تھا کہ اگر تم نے اس سدھی کے لیے کہیں بھی مول بھاؤ کیا تو یہ سدھی تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے گی۔''

''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم مول بھاؤ نہیں کرو گے مگر جو ہم اپنی خوشی سے دیں گے وہ لے لو گے۔''

''نہیں کچھ بھی تو نہیں لے سکتا سیٹھ جی ایک پیسہ نہیں ایک پائی نہیں بالکل مفت کا بچہ پیدا کر دوں گا۔''

''کیسے۔''

میں اس کے لیے صبح سے تیار تھا۔ تیل کی ایک چھوٹی سی بوتل کو صاف کر کے اس میں میں نے سگریٹ کی راکھ بھر لی تھی۔

''تمہارے پاس کوئی مٹھائی ہو گی۔''

''ہاں قلاقند ہے۔''

''قلاقند بھی چلے گا۔'' میں نے کہا۔

''چٹکی مجھے کھلاؤ گے۔'' سیٹھ نے پھر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ایسی سدھی ہے جو کھائے اس کے بچہ پیدا ہو جائے گا۔'' فوجی ہنسنے لگا۔ سوگندھی کے نیم متبسم لب چمکنے لگے۔

''تم مذاق کرتے ہو۔''

''مذاق نہیں سیٹھ جی بالکل سنجیدہ ہوں۔''

اتنا کہہ کر میں نے سوٹ کیس کھولا۔ اس میں سے سگریٹ کی راکھ والی شیشی نکالی اور اسے سیٹھ کو دکھلا کر تمہاری سیٹھانی کو تمہارے سامنے کھلا دیتا ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو ٹھیک نو ماہ بعد بچہ پیدا ہوگا۔ کسی سادھو کی سمادھی پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک پائی خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تک بارہ بے مراد عورتوں کو بامراد کر چکا ہوں۔ گرو گولک ناتھ شری سوامی ٹرنکاری جگت دھاری بال براہمچاری کی کرپا سے تمہاری سیٹھانی کی گود ہری ہو جائے گی۔''

سیٹھ کا چہرہ امیدوں سے کھل گیا بولا۔ ''تو اماری سیٹھانی کو چٹکی دے دو۔

سیٹھانی نے قلاقند کا ایک ٹکڑا اسٹین لیس اسٹیل کے ایک ڈبے سے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھا۔ میں نے تیل کی شیشی سے سگریٹ کی راکھ کی چٹکی لے کر قلاقند میں ملا دی اور اسے اپنے ہاتھ پر رکھ کر یوں بولنا شروع کیا۔

''اوم شری شری ۱۰۸ سوامی گولک ناتھ ٹرنکاری جگت دھاری برہمچاری مہا اپکاری کی دیا درشٹی سے یہ بھسم کھلاتا ہوں۔ ردے پر رداچڑھاتا ہوں۔ جو ناری یہ چٹکی کھائے سوامی ناتھ کی اپار رشتی سے گربھوتی ہو جائے۔

کالا کھیرا، ماتا چیرا، ڈبل اوم بڑبونگ گونگ وسل وسل جھونک۔

میں سوگندھی کا منہ آہستہ سے کھول کر اس کی طرف دیکھ کے ایک آنکھ میچ کے اسے یہ قلاقند کھلا دی۔

فوجی کا مارے ہنسی کے برا حال تھا لیکن میں، فوجی اور سوگندھی تینوں اپنی ہنسی روکے ہوئے تھے، سیٹھ بے حد سنجیدہ ہو کر اس پورے عمل کو دیکھ رہے تھے۔

چٹکی کھا کر سیٹھانی سیٹھ کے قدموں کی طرف بیٹھ گئیں اور لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا۔

شاید اس نے خاموشی سے ہنسنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔

''تو بچہ سچ مچ پیدا ہوگا؟''

''ٹھیک نو مہینے بعد۔'' میں نے سیٹھ سے کہا۔ ''آزمائی چٹکی ہے۔ یقین نہ آئے تو پانچ ہزار کی شرط لگاتے ہو۔

گویا سیٹھ کو اطمینان آ گیا بولا ''نا بابا۔ شرط ورط ہم نہیں لگاتے مگر ہم کو اب اطمینان ہے۔''

میں نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیا۔ ''اس میں میرا نام لکھا ہے، اگر ٹھیک نو ماہ بعد بچہ پیدا نہ ہوا تو مجھے نو ہزار گالی لکھ کر بھیجنا۔''

سیٹھ نے کارڈ اپنی سیٹھانی کو رکھنے کے لیے دے دیا۔ سوگندھی نے پڑھ کر احتیاط سے رکھ لیا۔

سیٹھ بولا۔ ''تم نے میرا بھلا کیا ہے تو ایک بھلا میں بھی کر دوں۔'' میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں۔'' سیٹھ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ابھی باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ تم ہماچل پردیش میں زمین خریدنے جا رہے ہو اور ایک فارم کھولنے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

''مگر ہماچل پردیش میں زمین بہت مہنگی ہے۔ تین چار ہزار روپے فی ایکڑ سے کم نہیں ملے گی۔ میں تمہیں تین سو روپے ایکڑ میں زمین دلاتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''بنجر ہوگی۔''

وہ بولا۔ ''بنجر ہے؟۔ بڑی زرخیز ہے''

پھر اتنی سستی کیوں مل رہی ہے؟''

''وہ ایک اجاڑ ویران جگہ پر واقع ہے۔ تین طرف جنگل ہے اور پہاڑیاں ہیں۔ بیچ میں تیس ایکڑ کا یہ ٹکڑا ہے۔ بارش وہاں کافی ہوتی ہے۔ ایک کنواں بھی ہے، جو بارہ مہینے پانی سے بھرا رہتا ہے اور ایک ندی بھی ہے۔''

''پھر اس کا مالک مجھے اتنے سستے داموں پر زمین کیوں دینے لگا۔''

''تم پوری بات تو سنتے نہیں ہو۔'' سیٹھ ذرا کڑوے لہجے میں بولا۔ ''وہ زمین دراصل ایک بیوہ کی ہے۔ آس پاس کوئی گاؤں نہیں کوئی آبادی نہیں تیس کوس پیدل چل کر ایک ریلوے اسٹیشن آتا ہے۔ بس وہ بیوہ اس زمین کی اکیلے دیکھ بھال نہیں کر سکتی اور آبادی نہ ہونے سے کوئی اس زمین کو خریدنے پر تیار نہیں، کون جنگل میں جا کر رہنا پسند کرے گا۔''

''وہ بیوہ اس زمین کو بیچ کر کیا کرے گی؟''

وہ اپنی لڑکی کی سسرال چلی جائے گی۔ اس بیوہ کی ایک ہی لڑکی ہے اور کسی دور دراز کے گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ یہ بیوہ، یہ زمین بیچ باچ کر اپنی لڑکی کے پاس چلی جائے گی۔

''تمہیں یہ سب قصہ کیسے معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لڑکی کی سسرال ہمارے قصبے کے قریب ہے۔ میں اس لڑکی کے گھر والے کو جانتا ہوں وہی یہ سودا لے کر میرے پاس آیا تھا۔ معاملہ تین سو روپے ایکڑ پر پٹ گیا۔ میں جا کر زمین دیکھ بھی آیا مگر جب یہ دیکھا کہ آس پاس دور دور تک کوئی گاؤں نہیں، کوئی آبادی نہیں تو میں نے اس زمین کو خریدنے کا خیال چھوڑ دیا۔

''مگر مجھے تو ایسی ہی جگہ پسند آئے گی۔''

''ہاں۔ سمجھو بھگوان نے یہ جگہ اب تک تمہارے لیے ہی رکھی تھی۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ زمین اب تک بک نہیں گئی ہوگی۔''

''تین ماہ پہلے تو بکی نہیں تھی۔ اب کہاں بکی ہوگی۔ کون نکلا تمہارے ایسا اس جنگل میں جا کے رہے گا۔''

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے اس کا اتا پتا بتاؤ۔''

سیٹھ بولا۔ ''دو اسٹیشن چھوڑ کر شیرا جنکشن آئے گا۔ ادھر چھوٹی لائن کی گاڑی بھی جاتی ہے۔ تم وہاں اتر جاؤ اور دھولیا قصبے کا راستہ پوچھ لو۔ جب دھولیا قصبے کو پہنچو گے تو وہاں سے کواڑی قلعے کا راستہ پوچھ لینا۔ وہ قلعہ اب پرانا کھنڈر ہے شکستہ حالت میں ہے جنگل میں ہے کوئی وہاں جاتا نہیں ہے۔ وہ دھولیا قصبے سے تیس کوس کے فاصلے پر ہے۔ اس قلعے کے شمال میں کوئی آدھے میل کی چڑھائی پر اس بیوہ کا مکان ہے اور اس کے چاروں طرف وہ زمین ہے۔ تیس ایکڑ کے قریب زمین ہوگی۔ ایک کنواں بھی ہے۔ صاف ستھرا جنگل کا

ماحول ہے۔ تمہیں بہت پسند آئے گی وہ جگہ۔''

''وہاں ندی بھی ہے۔''

''میں تو اس سے اس کے خواب دیکھنے لگا ہوں۔'' میں نے ہنس کر سیٹھ سے کہا۔

''ہاں مگر اس بیوہ کا نام کیا ہے۔

''سروجا اس کا نام ہے۔ بڑی سندر بیوہ ہے۔''

فوجی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں تمہیں راستہ بتادوں گا۔''

''تم کیسے بتاؤ گے۔ کیا تم وہاں کبھی گئے ہو؟''

''نہیں، وہاں تو کبھی نہیں گیا۔ نہ مجھے اس بیوہ کے مکان کا کوئی علم ہے۔ مگر میں شہ پارا اسٹیشن پر اتروں گا۔''

''شہ پارا نہیں شپرا'' سیٹھ نے جلدی سے کہا۔

''شپرا نہیں، شہ پارا۔'' فوجی بولا۔ ''صرف گنوار لوگ شپرا بولتے ہیں۔''

سیٹھ کے نتھنے پھڑک اُٹھے۔ مگر وہ چپ رہا۔

فوجی بولا۔ ''تم میرے ساتھ شہ پارا جنکشن پر اترنا۔ وہاں سے ہم اکٹھے ساتھ چلیں گے پارپیا قصبے کو۔ مَیں پارپیا قصبے کا رہنے والا ہوں، وہاں سے میں تمہیں کواڑی قلعہ کا راستہ بتادوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سنگ جاؤں گا شپرا اسٹیشن سے پارپیا۔''

''شپرا نہیں۔ شہہ پارا۔'' فوجی بولا۔

یکا یک سوگندھی نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

سیٹھ نے پوچھا۔ ''کیا ہے۔''

سوگندھی بولی۔ ''سر میں چکر آرہے ہیں۔''

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''سیٹھ جی مٹھائی کھلاؤ۔ تمہاری سیٹھانی گربھ وتی ہوگئی ہے۔'' سیٹھ نے پہلے تو میری طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہوں۔

''اتنی جلدی یہ چمتکار۔''

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھت کی طرف اُٹھا کر کہا۔ ''دھنے ہو بھگوان تم دھنے ہو۔''

سیٹھانی نے ایک لمبا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا۔ اس گھونگھٹ کی آڑ سے وہ کبھی کبھی چنچل شریر نگاہوں سے میری طرف دیکھ لیتی تھی اور کبھی کبھی میں بھی آنکھیں چرا کر اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دل شاد اور سیراب چمک آ رہی تھی بھرپور اور شاداب جیسے بارش کھل کر برس گئی ہو......

☆☆☆

فوجی مجھے آہستہ سے بتانے لگا۔ ''سربھنی کی پہاڑیاں ہمارے گاؤں سے قریب ہیں اور کواڑی قلعہ تو صرف دس کوس پر ہے۔ میں تمہیں وہاں تک چھوڑنے کے لیے کوئی آدمی ساتھ کر دوں گا مگر ایک شرط ہے۔ تمہیں میرے گاؤں چلنا پڑے گا۔ میری شادی میں شریک ہونا پڑے گا۔''

''جانے کب ہے تمہاری شادی۔'' میں نے پوچھا۔

''اب کل ہو گی میری شادی۔'' رونق سنگھ خوشی سے چہکتے ہوئے بولا۔ پھر اپنی ران کھجانے لگا۔

''دوسرا ایک راستہ بھی جاتا ہے۔ سربھنی کی پہاڑیوں کو اسٹیشن سے دھولیا، اور وہ چھوٹا اور سیدھا راستہ ہے۔'' سیٹھ بولا۔ ''ایک ٹپ اور۔''

رونق سنگھ جلدی سے بولا۔ ''تم اپنی ٹپ رہنے دو۔ سیٹھ میں اس بابو کو ضرور اپنی شادی پر لے جاؤں گا۔ اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ رکھ دیا۔

ایک تو فوجی دوسرے ساتھ میں رائفل، تیسرے بالکل نئی جگہ جانے وہ سربھنی کی پہاڑیاں کدھر ہیں؟ وہ کواڑی نام کا قلعہ کدھر ہے؟ وہ سروجا بیوہ کہاں رہتی ہے۔'' ضرور مجھے اس فوجی کے ساتھ اس کے گاؤں جانا پڑے گا۔

''کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا۔'' سیٹھ نے رونق سنگھ سے پوچھا۔

''پارپیا۔''

سیٹھ نے شبہے سے سر ہلایا اور جیسے کہنا چاہتا ہوں، کبھی نام نہیں سنا، اس گاؤں کا مگر فوجی نے نخوت بھرے چہرے کو دیکھ کر چپ ہو گیا۔

جب شپارا کا اسٹیشن آیا تو سوگندھی ابھی تک سو رہی تھی۔ گہری آسودہ نیند کی دھانی

ساڑھی کے پتلے گھونگھٹ میں ماہتاب سو رہا تھا۔ میں نے بہ حسرت و یاس ایک نگاہ اس کے مخمور حسن پر ڈالی، پھر سیٹھ سے ہاتھ ملا کر اسی چار برتھ والے کوپے سے باہر نکل آیا۔ پیچھے پیچھے رونق سنگھ بھی چلا آیا۔

میں نے اپنا سامان اسٹیشن کے لگیج آفس میں رکھوا دیا۔ اپنے ساتھ صرف ایک ہنڈ بیگ لے لیا۔

رونق سنگھ کے پاس دو ٹرنک تھے۔ ایک ہنڈ بیگ ایک رائفل اور اس کا گاؤں یہاں سے بیس کوس دور تھا۔

''میں اتنا سامان خود تو اُٹھا کے چل نہیں سکتا، ایک مزدور کرنا پڑے گا۔''

''مزدور کہاں سے ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''سمری انتظام کر دے گی!''

''سمری کون ہے۔''

وہ بولا۔ ''ایک حلوائن ہے۔ اس کا گھر والا دو سال ہوئے مر گیا۔ ایک بچہ ہے اس کا آٹھ سال کا، دونوں مل کر دوکان چلاتے ہیں۔''

''مگر ہمیں اس کی دکان سے کیا لینا؟''

''بابو بیس کوس کا سفر ہے۔ پوری بھاجی سے پیٹ بھر کر چلیں گے، ورنہ راستے میں میں بول جاؤ گے۔''

سمری ایک سیاہ فام عورت تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں لال لال ڈورے، گھٹا ہوا جسم، طاقت ور جسم، بجلی کی سی شعاعیں نکلتی تھیں۔ اُس کے جسم سے جیسے کوئی مقناطیسی رو نکل کر اس کے جسم کے چاروں طرف گردش کر رہی ہو۔ ایسی گہری نظروں سے نوجوان گاہکوں کو دیکھتی، جیسے پنجہ مار کر دبوچ لے گی۔ مجھ پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے مجھے چھوڑ دیا جیسے کہہ رہی ہو۔ یہ شہری نزاکتوں کا مارا ہوا حُسن میرے کس کام کا۔ پھر اس کی نگاہیں رونق سنگھ کے تگڑے ڈیل ڈول پر جم گئیں۔ وہ زور سے ہنسی۔ ایک بھدی گنوار ہنسی۔ اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور اس میں کس قدر مردانہ پن تھا۔

''آ گئے سنگھ جی۔ شادی کرانے؟''

''ہاں سمری آ گیا۔ اب جلدی سے گرم گرم پوری بھاجی ڈال دو اور ایک مزدور کا بندوبست کر دو۔ دور اپنے گاؤں جانا ہے''

''مزدور کا بندوبست بھی ہو جائے گا مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے، ذرا اس مٹکی سے پانی لے کر ہاتھ منہ دھولو۔ کھا پی کر اس پیپل کے پیڑ کے نیچے گھڑی دو گھڑی آرام کر لو۔ پھر چلے جانا۔''

''نہیں سمری۔ اب ہاتھ منہ گھر جا کر ہی دھوئیں گے۔ بیس کوس کا سفر ہے۔ پیپل کے نیچے کھٹیا ڈال کے سو گئے تو گھر کب پہنچیں گے؟''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' سمری کس قدر اداس ہو کر بولی پھر اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''اے بیٹا لپک کے گھمرو کو بلا لا کہنا بیس کوس پار پیا جانا ہے اچھی مجوری ملے گی۔ صوبیدار رونق سنگھ شادی کرانے اپنے گھر جا رہا ہے۔''

وہ پھر زور سے ہنسی وہ ٹھنڈے برف کے ٹکڑوں میں بکھرتی ہوئی ہنسی میرے جسم میں ایک کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ کیسی مردمار عورت ہے۔ ''مگر ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔'' رونق سنگھ نے دھیرے دھیرے سرگوشیوں میں مجھے بتایا۔ جب تک بھوگلا حلوائی زندہ رہا، یہ اس کی وفادار رہی۔ کوئی بات نہیں سنی گئی اس کی ہاں حلوائی کے مرنے کے بعد جب اسے اپنے چھوٹے سے بچوں کو پالنا پڑا اور یہ دکان سنبھالنی پڑی اور جب اسے باہر کی دنیا سے واسطہ پڑا تو یہ تبھی شکاریوں کی دنیا میں شکار بن گئی۔ بننا پڑتا ہے۔ بابو اسٹیشن پر سب لوگ اسے جانتے ہیں۔ قصبے میں سب لوگ اس سے تھراتے ہیں۔ پولیس والوں کو اس نے مٹھی میں کر رکھا ہے اور کئی ڈاکوؤں سے بھی اس کا تعلق ہے۔ بڑی جھٹکے دار عورت ہے۔''

''جھٹکے دار سے کیا مطلب تمہارا؟'' میں نے پوچھا۔

رونق سنگھ میری طرف دیکھ کر چند ثانیے چپ رہا۔ پھر ایک شریر ہنسی اس کی آنکھوں میں ابلنے لگی۔ یہ ہنسی جو اس کے لبوں سے لے کر اس کی آنکھوں تک پھیل گئی تھی مگر وہ چپ رہا۔ کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی میں سب سمجھ گیا تھا۔

''شاید اسی لیے تمہیں دوپہر کے لیے روک رہی تھی۔'' میں نے اس سے دھیرے سے پوچھا۔

رونق سنگھ سے اس کی ہنسی روکی نہیں گئی۔ ایک زوردار اچھو کے ساتھ منہ کا لقمہ باہر آ رہا۔
سمری ڈپٹ کر بولی۔ ''کسی کی برائی کرو گے تو یہی ہوگا۔''
اور جب ہم پیسے دے کر چلنے لگے تو اس نے پھر گہری نگاہوں سے رونق کو تاکتے ہوئے کہا۔ ''مگر جاؤ گے کہاں سنگھ جی دو ماہ بعد تو لوٹ کے آؤ گے ہی اس اسٹیشن پر پھر ہاتھ پکڑ لوں گی۔''

اتنا کہہ کر سمری نے رونق کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ہاتھ چھڑاتے چھڑاتے رونق کا منہ لال ہو گیا۔ دیر تک سمری ہنستی رہی اور ہمارے جانے کے بعد بھی اس کی ہنسی کی لہریں دور تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں دور تک رونق کا چہرہ لال رہا اور اس نے مجھ سے آنکھ نہیں ملائی۔

دوپہر تک ہم نے بارہ کوس طے کر لیے۔ پھر آرام کرنے کے لیے راستے میں ایک گاؤں سے باہر کنویں کے پاس بانسوں کے جھنڈ میں لیٹ گئے۔ یہاں کچھ آم کے پیڑ تھے، کچھ جامن کے دو درختوں سے املتاس کی سوکھی پھلیاں لٹک رہی تھیں۔ اس کے پاس ہی ایک ٹیلے پر ناگ پھنی کی جھاڑیاں تھیں، بانسوں کے جھنڈ کے قریب رہٹ چل رہا تھا اور ایک کسان لڑکا ہاتھ میں بانس کی پتلی چھڑی لیے بیلوں کو گھما رہا تھا اور کھیتوں میں پانی دیئے جا رہا تھا صدیوں پرانا منظر رہٹ کی روں روں میں گہری شانتی، سو جاؤ کچھ نہیں بدلا سو جاؤ کچھ نہیں بدلا۔ ذرا پرے درختوں سے گھرے ہوئے ایک گاؤں کی چھتیں، کچھ کچے مکان، کچھ پکے کہیں پر چھپر، کہیں پر کھپریل۔

''وہ آخری سرے پر مکان دیکھتے ہو؟'' یکایک رونق سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔''
''وہ کنگروں والا؟''
''ہاں وہ مکان ساوتری کا ہے۔''
میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔
''تو تم نے ساوتری کو دیکھا ہے۔''
''ہاں شپارا کے ایک میلے میں۔''
''کیسی ہے؟''

''تمہاری شہری ایکٹریس۔ فلم ایکٹریس جوان اور خوبصورت اگر دیہاتی کپڑے پہن لے کے تو کیسی لگے گی؟''

میں نے اپنے ذہن میں دو تین ایکٹرسوں کو وہ کپڑے پہنائے اور دیکھا اور دیکھ کر کہا۔ ''معلوم ہو گیا کیسی لگے گی۔''

''بس ویسی ہے میری ساوتری۔''

''کچھ بات بھی ہوئی اس سے میلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس بس دو تین جھلکیاں یاد ہیں میلے کی۔ وہ سرمہ خرید رہی تھی۔ وہ چوڑیاں پہن رہی تھی۔ وہ جھولے پر تھی اور ہنس رہی تھی۔ ہوا میں اس کا لہنگا اڑا اڑا جاتا تھا۔ بس یہی دو تین تصویریں ہیں میرے پاس اور انہیں تصویروں نے مجھے موہ لیا۔''

''تم نے کوئی بات تو کی ہوتی۔''

''کیسے کرتا؟ ساتھ میں اس کا باپ تھا اور بھائی اور ماں۔''

''میلے کے بعد کبھی ملنے کی کوشش کی؟''

''نہیں، اس کے ماں باپ کی بڑی پابندی ہے اس پر، بہت نگرانی کرتے ہیں اس کی۔ دو تین بار یہاں آیا اس گاؤں میں چھپ کر، مگر اس کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی۔ بڑا سخت گیر ہے اس کا باپ بس میں اس کے مکان کی چھت کے کنگورے دیکھ کر واپس چلا گیا۔''

''خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب زندگی بھر تمہیں دیکھنے کو ملے گی۔''

لیٹے لیٹے وہ بہت دیر تک چپ رہا۔ جیسے آنے والی زندگی کے مزے لے رہا ہو پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر اس نے اپنا بٹوہ نکالا۔ بٹوے سے ایک تصویر نکالی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ یہ ایک نوجوان دیہاتی دوشیزہ کی تصویر تھی، سچ مچ بڑی سندر، من موہنی، تصویر میں کھلکھلا کر ہنسے جا رہی تھی۔ چہرے پر کچھ عجیب سی شرم، بے باکی، ہچکچاہٹ اور دلیری کا کچا امتزاج، ان شریر آنکھوں کی چنچل ہنسی دل کو گدگدانے لگی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہی ہے ساوتری؟''

اس نے آہستہ سے ہاں میں سر ہلایا۔

''یہ تصویر تمہیں کیسے ملیں؟''

اس میلے میں ایک فوٹوگرافر سے حاصل کی، تیس روپے دیئے تھے۔ بڑی مشکل سے یہ تصویر ملی، چار سال سے اسے کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔"

میں نے پوچھا۔" آخر یہ شادی طے کیسے ہوئی؟"

کچھ مشکل نہیں پڑی ایک نائن کے ذریعے سگائی پکی ہوگئی۔ وہ لوگ بھی اپنے گاؤں کے سب سے امیر لوگ ہیں، ہم اپنے گاؤں کے ذات برادری بھی ایک ہے۔ کچھ مشکل نہیں پڑی۔"

میں نے تصویر اس کو واپس دے دی۔ اس نے تصویر لے کر پوچھا۔" لگتی ہے نا فلم ایکٹریس؟"

"بالکل۔"

"کس سے اس کی صورت ملتی ہے؟"

میں نے دو تین ایکٹریسوں کے نام لیے۔

اس نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔" نہیں ساوتری ان سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

رونق نے گھاس کا ایک تنکا دانتوں تلے دبا لیا اور دور پھیلے ہوئے آسمان میں تصویر بنانے لگا۔ گھر آنگن، باغیچہ، بچے پھول، ساوتری، پھول ہی پھول

میں نے کہا۔" چلو۔ اب چلیں تم تو اب اسی دھرتی سے چپک ہی گئے ہو۔ اب ایسا بھی کیا۔ آخر کل یہیں تو بارات لے کر آئیں گے۔"

رونق اٹھ بیٹھا میں ہنس کر بولا۔" آج دونوں گھروں میں کیا دھوم دھڑکا ہوگا۔ کیسے زور سے ڈھولک بجے گی چلو جلدی چلیں۔"

"ابھی تو آٹھ کوس پر ہے ہمارا گھر رات ہو جائے گی وہاں تک پہنچتے پہنچتے۔"

میں نے کہا۔" مگر گھمرو آگے گیا ہے سامان لے کر وہ خبر کر دے گا۔"

راستے میں، میں نے اس سے پوچھا۔" تم کواڑی قلعے تک کبھی گئے ہو؟"

"ہاں گیا ہوں مگر اس کے آگے سر بھنی کے جنگلوں میں کبھی نہیں گیا بڑا اجاڑ علاقہ ہے۔ تمہیں وہاں فارم بنانے کی کیا سوجھی ہے؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چلتا رہا پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''کواڑی کے قلعے میں آج کل کون رہتا ہے؟''

''کوئی نہیں ارے وہ تو کھنڈر ہے،کھنڈر۔سو سال پرانا۔''

☆☆☆

''پھر سورج ڈوب گیا اور نیلے آسمان کا کانچ شفاف ہوتا گیا اور نیم شیشم اور املتاس کے پیڑوں کی الجھی سلجھی شاخیں اس شفاف کانچ کے پس منظر میں سیاہ مرمریں جالیوں کی طرح ابھرنے لگیں پھر رات گہری ہوتی گئی اور راستے کا دھندلا غبار بھی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ پھر سیاہی مائل جھاڑیوں میں نظر نہ آنے والے پھولوں کی خوشبو سے رہگزار بھر گئی اور دھیرے دھیرے رونق سنگھ کچھ گنگنانے لگا اور ہم نے بہت سا فاصلہ خاموشی میں طے کرلیا۔ ایسی خاموشی جو کچھ بولتی نہیں ہے لیکن دلوں میں جذبات کا سونا رولتی ہے۔

پھر برگد کا ایک بہت بڑا پیڑ نظر آیا۔ یہاں سے دو راستے الگ ہوتے تھے۔ یہاں آکر رونق سنگھ رک گیا۔ سر سے ٹوپی اتار کر اس نے اپنے کھچڑی بال کھجائے پھر رومال سے منہ صاف کیا اور بولا۔

''یہاں سے دو راستے الگ ہوتے ہیں۔ایک تمہارے کوڑی قلعے کو جاتا ہے دوسرا میرے گاؤں کو۔اس کی آواز میں خوشی کی لہر تیز ہوگئی تھی۔

میں نے کہا۔''آج گھر پر سب لوگ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کررہے ہوں گے۔''

''ہاں۔'' وہ بولا۔''میری ماں اور پتا جی اور چھوٹا بھائی اور میری پندرہ سال کی بہن کنتل......''

اس کی نگاہوں میں اس کے گھر والوں کے چہرے گھومنے لگے۔

''آؤ چلیں۔'' اس نے مسرت بھری ایک سانس لے کر کہا اور اس کے قدم دھیرے دھیرے تیز ہوتے گئے۔

گاؤں کی چوحدی نظر آنے لگی، چھپروں کے باہر الاؤ اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اور بچوں کے چلانے کی آوازیں،کوئی دروازہ کھلتا ہوا۔کوئی بند ہوتا ہوا اور مویشی خانوں سے اٹھتا ہوا دھواں کسی پیڑ کے نیچے بندھی ہوئی بھینس کے ڈکرانے کی آواز اور کسی کسان کا سایہ قریب سے گزر کر اندھیرے میں ملتا ہوا۔

تنگ سی گلیاں اور مٹی اور گوبر کی بوئیں، پھول کی طرح کھلتی ہوئی کسی کی ہنسی کی چہک، پھر سناٹا۔ صرف ہم دونوں کے قدموں کی چاپ پھر کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔

"کون ہے۔"

رونق سنگھ نے آواز پہچان کر کہا۔ "میں ہوں۔ اکبر مگر اکبر چاچا نے جیتے رہو بھی نہیں کہا۔ دروازہ دھیرے سے بند ہو گیا۔ ہم آگے چلے گئے۔ آگے جا کر یہ تنگ گلی کشادہ ہو گئی۔ یکا یک سامنے سے ایک اونچی حویلی کے در و دیوار نظر آنے لگے اور جھلملاتی روشنیاں۔

"گھر آ گیا۔" رونق نے سامنے حویلی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور اس کی آواز حدت سے کانپنے لگی۔

وہ آہستہ سے بولا۔ "آج لڑکیوں نے رتجگا کر رکھا ہوگا۔ زور سے ڈھولک بج رہی ہوگی۔ اندر کے کسی کمرے میں۔"

وہ حویلی ہر قدم پر ہماری قریب آتی گئی۔ تھوڑی دیر میں ہم اس کے سامنے تھے۔ دروازہ بند نہ تھا۔ ذرا سا کھلا تھا۔ رونق نے دستک نہیں دی خاموشی سے اندر چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے۔

آنگن میں سناٹا تھا اور اندھیرا صرف تلی کے دیول پر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا۔ اندر ایک محراب دار برآمدے کے چوبی ستون سے لگی پندرہ سولہ برس کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھیا کہہ کر رونق سنگھ سے لپٹ گئی۔ اس کی آواز میں سسکی تھی۔ عورتیں خوش ہوں تب بھی روتی ہیں، غم میں ہوں تب روتی ہیں۔

رونق نے کنتل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اسے الگ کیا۔ پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں۔"

"پتا جی کے پاس۔"

"اور پتا جی کہاں ہیں؟"

"اندر دیوان خانے میں۔"

ہم لوگ اندر دیوان خانے میں گھسے ایک تخت پر ادھیڑ عمر کا مگر تگڑے جسم کا آدمی جھکا ہوا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ قریب میں ایک عورت سر پر ساڑھی کا پلو ڈالے ہاتھ

میں گلاس لیے کھڑی تھی۔

''لو پی لو۔'' وہ بولی۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے کاغذات سے نظریں اٹھائے بغیر کہا ''نہیں مجھے نہیں چاہیے۔''

رونق سنگھ آگے بڑھا، اس کے پاؤں کی چاپ سن کر ادھیڑ عمر کے آدمی نے سر اٹھایا اور رونق سنگھ چونک کر رہ گیا۔ رونق سنگھ نے اپنی ماں اور باپ کے پاؤں چھوئے ماں جلدی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر خاموشی سے کھسک گئی۔

دیوان خانے میں بالکل سناٹا تھا۔ دیوار سے لگی کنتل ہم سب کی طرف چپ چاپ سانس روکے دیکھ رہی تھی۔

''گھر میں ایسی خاموشی کیوں ہے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ادھیڑ عمر کا آدمی دھیرے سے کھنکار کر بولا۔

''ڈھولک بھی نہیں بج رہی ہے۔ روشنیاں بھی نہیں ہیں۔''

''وہ......وہ......'' ادھیڑ عمر کا آدمی کھنکار کر گلا صاف کرنے لگا۔ یہ گلا صاف کرنے کی کوشش بالکل نئی تھی۔

رونق سنگھ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا باپ تھا۔

''گھر میں اندھیرا کیوں ہے؟ کیا بات ہے؟ کسی رشتے دار کی موت ہو گئی؟''

''نہیں۔'' ادھیڑ عمر کے آدمی نے زور سے سر ہلایا۔

کوئی حادثہ ہو گیا کیا بات ہے۔ مجھے بتاتے کیوں نہیں پتا جی آج تو گھر میں رتجگا ہونا تھا۔ سارے گاؤں کی لڑکیاں......وہ اپنی بہن کی طرف مڑا۔ ''کیوں کنتل؟''

کنتل نے کوئی جوب دیئے بغیر منہ موڑ لیا اور چپکے سے کمرے کے باہر نکل گئی۔

حیران اور پریشان ہو کر رونق سنگھ تخت پر اپنے باپ کے قریب بیٹھ کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کے باپ نے اپنی پگڑی اتار کر تخت پر رکھ دی۔ ایک انگوچھے سے پسینے سے بھرا ہوا اپنا منہ اور سر صاف کرنے لگا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں نم تھیں۔ اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اپنے بیٹے کے کندھے پر رکھا اور بولا۔

''اپنا دل پتھر کا کر لو رونق۔''

رونق چپ چاپ اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔

''ساوتری سے تمہاری شادی نہیں ہوگی۔''

''رونق ہکا بکا اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔''

''ساوتری کل رات اپنے کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ شادی کے سارے زیور لے کر۔

یکا یک رونق سنگھ کا جبڑا بھینچ گیا۔ گردن تن گئی اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی سختی سے تخت کے کونے پر جم گئیں۔ اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی مگر وہ کچھ بولا نہیں۔

چند طویل لمحوں کے لیے بڑی تکلیف دہ خاموشی رہی۔

پھر رونق سنگھ نے پوچھا۔ ''گھمر وسامان لے کر آگیا باپو؟''

''کوئی ایک گھنٹہ ہوگیا۔'' باپ نے جواب دیا۔

دیوان خانے کے باہر دروازے سے لگی کنتل کو آواز دے کر رونق سنگھ نے بڑی سختی سے کہا۔

''کنتل، گھمر وکو کہو میرا سامان لے کر دیوان خانے میں آئے۔

جب رونق سنگھ کے ٹرنک اور سوٹ کیس اندر آگئے تو اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر ٹرنک کھولا۔ اب اس کی ماں اور بہن دونوں دیوان خانے میں آچکی تھیں۔ اور دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ٹرنک کھول کر، دھیرے دھیرے سے آہستہ سے سنبھال کر ایک ایک چیز الگ کرتے ہوئے رونق سنگھ گنانے لگا۔

''یہ ساڑیاں ہیں، یہ غرارے، یہ بیل باٹم یہ کنگن یہ چوڑیاں یہ جھمکے۔ یہ گلوبند یہ جھومر۔''

صوبیدار رونق سنگھ اپنے ہونے والی بیوی کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔ اپنی ماں کو سب کچھ ٹھیک طرح سے بتا کر اس نے ٹرنک بند کیا۔ اور چابی ماں کے ہاتھ میں دے کر بولا۔

''انہیں رکھ لو کنتل کی شادی میں کام آئیں گی۔''

''مگر'' ماں بولی ''مگر بیٹے کا منہ دیکھ کر فوراً ہی چپ ہوگئی۔''

رونق سنگھ نے دیوار سے لگی رائفل اٹھائی۔ جھک کر ماں کے پاؤں چھوئے اور

کمرے سے باہر جانے لگا۔

ماں چلا کر بولی۔''بیٹا کہاں جا رہے ہو۔''

رونق ذرا رکا ذرا مڑا آہستہ سے بولا۔''چھٹی کینسل کر کے واپس فوج میں جا رہا ہوں۔''

''بیٹا'' ماں کہتے ہوئے آگے بڑھی مگر باپ نے روک دیا اور رونق پیچھے دیکھے بغیر مضبوط قدموں سے باہر نکل گیا۔

پھر اس کے باپ نے پگڑی سر پر رکھ لی۔ آنکھ سے ایک آنسو پونچھا اور کاغذات دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

وہ رات تو میں نے جیسے تیسے کر کے رونق سنگھ کے گھر ہی میں گزاری میں نے رونق سنگھ کو روکنے کی کوشش نہیں کی اس کا غم اور غصہ مایوسی اور حسرت ناکی کو دیکھ کر اس کے بھرنے کی کیفیت کا اندازہ کر کے اسے روکنا غلط بھی ہوتا پھر یہ بات بھی تھی کہ جب اس کے گھر والوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تو میں روکنے والا کون ہوتا تھا اور کس طرح اسے ڈھارس دے سکتا تھا۔

اعلیٰ صبح کسی کے جاگنے سے پہلے میں اپنا ہینڈ بیگ لے کر اس خاموش افسردہ گھر سے رخصت ہو گیا۔ گاؤں والوں سے کواڑی قلعہ کا راستہ پوچھ کر گاؤں کی چوحدی سے باہر نکل گیا۔

کواڑی قلعہ کو جانے والا راستہ دراصل راستہ نہ تھا۔ ایک طرح کی چرواہوں کی پگڈنڈی تھی جو کہیں جھاڑیوں میں گم ہوتی، کہیں ریتیلی میدانوں میں تبدیل ہو جاتی۔ میں بھولتا بھٹکتا اپنے راستے پر چلتا رہا۔ محض اٹکل سے کیوں کہ یہاں دور دور تک آبادی کا نشان نہ تھا دو ایک جگہ چراہوں کے گلے ضرور ملے اور ان چرواہوں سے راستہ معلوم کرنے میں بھی کچھ مدد ملی اور کچھ نے جو راستہ بتایا اس سے میلوں بھٹکا دیا۔ رونق سنگھ نے بتایا تھا کہ پار پیا سے کواڑی قلعہ دس کوس کے فاصلے پر ہے مگر یہ دس کوس تھے کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے تھے میں نے سمجھا۔ میں ضرور راستہ بھٹک گیا ہوں۔

اب سہ پہر قریب آ رہی تھی اور بھوک نے مجھے بے حال کرنا شروع کر دیا تھا۔

بالآخر راستے میں ایک شوالہ نظر آیا۔ ایک اونچے ٹیلے پر اور چاروں طرف ہرے بھرے درختوں سے گھرا ہوا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی سوکھی سڑی جھاڑیوں کے بعد جو یہ ہریالی دیکھنے کو ملی تو آنکھوں میں ٹھنڈک اترنے لگی اور میں بے اختیار اس شوالے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

کہیں بانسوں کے جھنڈ، کہیں آموں کے، کہیں جامن کے کہیں نیم کے گھنیرے سائے۔ پھر ٹیلے کی ایک دراڑ سے چٹانوں میں گھرا ہوا ایک جھرنا نظر آیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا نرمل پانی، میں بار بار اسے آنکھوں سے لگاتا رہا اور ہاتھ منہ دھوتا رہا۔ پانی میٹھا اور مزیدار تھا۔ جی بھر کر پیا مگر پیاس کبھی بھوک کا بدل ثابت نہیں ہوتی پانی پی کر بھوک اور چمک اٹھی غلطی کی گاؤں سے ناشتا کر کے چلتا یا چار روٹیاں سفر کے لیے بندھوا لیتا۔

"بہت دور سے آئے ہو؟" یکا یک ایک آواز میرے سر کے اوپر سے ابھری اور میں نے چونک کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے ادھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔

میرے سر کے اوپر شوالے کا پجاری کھڑا تھا اونچا، لانبا، گورے رنگ کا پجاری، سر منڈا ہوا، پیشانی کشادہ، آنکھیں غلافی، چوڑا چکلا سینہ، کمر میں ایک سفید دھوتی اور پاؤں میں کھڑانویں۔

میں نے پجاری کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔ "ہاں بہت دور سے آیا ہوں۔ کلکتے سے آرہا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"کواڑی قلعہ سے آگے۔ سربھنی کے علاقے میں۔"

"تب تو کچھ بھٹک گئے تم۔"

"کیسے؟"

پجاری نے مجھے راستہ بتایا۔ "جس راستے سے تم آئے ہو۔ واپس اسی راستے سے ڈیڑھ دو میل جا کر تمہیں ایک سوکھا نالہ ملے گا۔"

"ہاں ملا تھا راستے میں۔"

"اسی نالے کے کنارے کو پکڑ کر پورب کی سمت چلتے جاؤ۔ شام ہوتے ہوتے کواڑی قلعے پہنچ جاؤ گے۔"

''مگر پجاری جی مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔''

''تو اشنان کر کے بھگوان کے درشن کر لو پھر تمہیں بھوجن ملے گا۔''

بھگوان کے درشن کے بعد دال بھات کھانے کو ملا۔ پتلی دال اور لبڑ گدا چاول۔ مگر بھوک اتنی تیز تھی کہ پتل تک چاٹ گیا۔ پجاری کھڑا مسکراتا رہا۔ جب اس کا شکریہ ادا کر کے چلنے لگا تو اس نے پوچھا۔

''کیا راستے میں تمہیں مرہٹے ملے تھے؟''

''مرہٹے؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ''کون سے مرہٹے؟''

اس نے میرے سوال کا جواب نہ دیا۔ اپنی غلافی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ مرہٹے آ رہے ہیں۔

پھر رک کر کہنے لگا۔ ''تم سربھنی جا رہے ہو، وہاں کے ٹھگوں سے ہوشیار رہنا۔''

''مگر پجاری جی ٹھگ تو ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکے۔''

''ختم نہیں ہوئے۔'' وہ پجاری افسردگی سے سر ہلا کر بولا۔ ''ابھی اس علاقے میں باقی ہیں۔ سربھنی کے جنگلوں سے ہوشیار رہنا۔''

وہ عجیب خوابناک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا مجھے تو وہ پجاری کچھ پاگل سا لگا میں نے جلدی جلدی اس خوبصورت شوالے کے خوب صورت پجاری سے اجازت چاہی اور اپنے راستے پر ہولیا۔ ڈیڑھ دو میل واپس جا کر جب وہ سوکھا نالہ مجھے پھر ملا۔'' میں اس کے کنارے کنارے پورب کی طرف ہولیا۔ دھیرے دھیرے دھرتی بلند ہونے لگی اور سوکھی جھاڑیوں کی جگہ ہری جھاڑیاں اور ہری جھاڑیوں کے بیچ بیچ کہیں کہیں تناور درخت نظر آنے لگے۔

اب سوکھے نالے میں کہیں کہیں چٹانوں کے فطرتی بندھ میں رکا ہوا پانی بھی نظر آنے لگا۔

نالہ بلند ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اردگرد ایک پہاڑی سلسلہ سا نمودار ہونے لگا۔

میں نے کنارہ چھوڑ دیا اور نالے کے بیچوں بیچ پتھروں پر پھلانگتا ہوا راستہ طے کرنے لگا۔

اب نالے کے دونوں کنارے سکڑتے جا رہے تھے۔ اونچی چڑھائی شروع ہو گئی۔

میرے سامنے نالے کا ایک موڑ تھا، خطرناک اور پتھریلا اور دونوں طرف ڈھاک کے پیڑ اں

سے اس قدر گھرا ہوا کہ موڑ کے آگے کا سرا نظر نہ آتا تھا۔

موڑ کاٹ کر جوں ہی آگے بڑھا تو ایک دم ٹھٹھک کر رہ گیا۔ پہلے کانوں میں آبشار کی آواز سنائی دی۔ پھر چار قدم موڑ کاٹ کر جو آگے بڑھا تو میرے سامنے ایک دم اونچی چٹانوں کی ایک قدرتی دیوار دکھائی دی جس کے بیچ میں سے ایک آبشار پھوٹ کر نیچے گر رہا تھا اور نیچے گر کر آبشار کا پانی چٹانوں سے کٹ کر پورب سے دکھن کی طرف کٹ جاتا تھا جس کی وجہ سے پورب سے پچھم کو بہنے والا نالہ سوکھا رہ جاتا تھا۔

اور ان چٹانوں کی دیوار کے عین اوپر سب سے اونچی بلندی پر کواڑی قلعے کی جید دیواروں کے کسی قدر ٹوٹے پھوٹے کنگورے اور برجیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے سوچا کوئی دوسرا راستہ بھی ہوگا کواڑی قلعے کی طرف جانے کا میں اس قلعے کی عقب کی طرف سے آیا تھا اور اس طرف تقریباً عمودی چٹانیں تھیں۔

ہاں بائیں طرف مجھے ایک پتلی سی پگڈنڈی نظر آئی جو اوپر قلعے کی ایک ٹوٹی دیوار تک جاتی تھی۔ یہ ایک ڈنڈی کبھی خاصی خطرناک تھی مگر راستے میں جگہ جگہ چٹانوں کے بیچ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں یا بیلیں اگی ہوئی تھیں جن کا سہارا لے کر میں اوپر جا سکتا تھا۔

دھیرے دھیرے کوشش کرتا ہوا کسی چھپکلی کی طرح میں اوپر سرکنے لگا۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ عجیب گل ہوں میں کلکتہ چھوڑ کر اس ویرانے میں کیوں گھس رہا ہوں۔ اور وہ بھی ایک بے وقوف سیٹھ کے کہنے پر۔ جنگل سے یہ محبت کیا ایک طرح کا فرار نہیں ہے۔ زندگی کے کڑے امتحان سے بچنے کے لیے مگر تم زندگی سے بچ کیسے سکو گے۔ جہاں جاؤ گے زندگی تمہارا پیچھا کرے گی اور اپنا خراج طلب کرے گی۔ مسٹر۔ سوچتے سوچتے پاؤں لڑکھڑائے اور ایک جھاڑی کی شاخ ٹوٹ گئی اور میں چند فٹ نیچے کھسکا مگر پھر پاؤں کے تلے اٹکنے کی جگہ مل گئی اور ہاتھ میں پیپل کا ایک چھوٹا سا تنا آ گیا جو ایک چٹان کی دراڑ سے پھوٹ نکلا تھا، زندگی اسی طرح چٹان کاٹ کے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے کہاں تک بچ سکو گے۔

گھٹنے چھلے، ہاتھ زخمی ہوئے مگر اوپر کھسکتا لڑھکتا، گرتا پڑتا کسی طرح قلعے کی اس ٹوٹی دیوار تک پہنچ گیا جہاں پر پگڈنڈی ختم ہوتی تھی۔

اب آبشار کی آواز بہت کم ہوگئی تھی اور میرے سامنے ایک نیا ہی منظر تھا۔ یکا یک نگاہ ایک کھلی وادی کا نظارہ پیش کر رہی تھی، جس کے پرے ہرے بھرے جنگلوں کو لے کر ایک پہاڑی سلسلہ اس وادی کا احاطہ کر لیتا تھا۔ دور پہاڑی سلسلے میں نکلتی ہوئی ایک ندی اس اونچی وادی کے دامن میں پھیلتی ہوئی جا رہی تھی اور اس وادی کے شمال میں کھریا مٹی سے لپا ہوا ایک سفید گھر نظر آ رہا تھا۔ جس کے ایک طرف جنگل اور تین طرف کھیت ہی کھیت۔

سیٹھ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

واقعی بے حد حسین جگہ ہے۔

جہاں فطرت کی گود میں ساری زندگی بتائی جا سکتی ہے۔

میں دیر تک اس سحر انگیز وادی کی طرف دیکھتا رہا۔ آس پاس قلعے کے کھنڈروں سے بے نیاز۔

یکا یک میرے قریب کوئی ہنسا۔

میں نے چونک کر اِرد گرد نظر ڈالی۔

میرے دائیں طرف قلعے کی ایک ٹوٹی محراب سے لپٹ کر بیری کا ایک جھاڑ سر بلند ہوگیا تھا اور یہاں پر اس کی ایک شاخ کو تھامے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بیری کھاتے کھاتے میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"بیر بہت میٹھے ہیں کھاؤ گے؟"

اس نے دو چار بیر میری طرف اچھال دیئے ایک بیر میری ناک پر لگا دو گالوں پر دو تین میرے ماتھے سے ٹکرا کر زمین پر گر گئے۔ مگر میں بھونچکا ہو کر اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔

وہی لڑکی تھی، ساوتری، مگر تصویر سے دس گنا زیادہ حسین۔

☆☆☆

کچھ دیر تک تو میں ٹکٹکی باندھے! اسے دیکھتا رہا خاموش نگاہوں سے اور ہوا بیری کے پتوں سے الجھ کر سرسراتی رہی اور ساوتری کے کھلے بالوں کو اس کے شانوں پر جھلاتی رہی اور وہ خاموشی سے میرے سامنے کھڑی رہی۔ ہاتھ میں بیر لیے اور بڑی بڑی آنکھوں میں شوخی کی چمک لیے پھر قریب ہی میں کوئی فاختہ پھڑ پھڑا کر اڑ گئی اور وہ سکوت کا وقفہ ٹوٹ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم ساوتری ہو؟''

''ساوتری؟ کون ساوتری؟''

''بنومت۔'' میں نے کسی قدر غصے میں آ کر اس سے کہا۔ تم ساوتری ہو۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی ہے۔ تمہاری شادی پار پیا کے رونق سنگھ صوبیدار سے ہونے لگی تھی، مگر شادی سے دو روز قبل تم اپنے آشنا کے سنگ بھاگ آئیں۔''

اس لڑکی کے چہرے کا چمپئی رنگ سرخ ہوتا گیا۔ آنکھوں میں جہاں پہلے حیرت تیر رہی تھی وہاں اب ایک خشمگیں دوڑنے لگی۔ اس نے جھک کر ایک پتھر اُٹھا لیا۔

بولی۔ تم کون ہو، جو مجھ پر ایسے جھوٹے الزام لگا رہے ہو۔ نہ میں کسی کے گھر بھاگ آئی ہوں، نہ میں پارپیا کے کسی رونق سنگھ کو جانتی ہوں۔

''تم تم ساوتری نہیں ہو؟'' میرا یقین ڈگمگانے لگا تھا کیونکہ لڑکی کے انکار میں بڑی شدت تھی۔

نہیں میں تو ریکھا ہوں اور میری شادی تو پانچ سال پہلے حیر آباد ضلع میں ہو چکی ہے اور میرا ایک بچہ بھی ہے اور یہاں میں اپنی ماں کے پاس آئی ہوں۔''

''یہاں کہاں؟''

لڑکی کا بوٹا سا قد ذرا سا اپنی جگہ سے مڑ گیا۔ انگلی کے اشارے سے وہ وادی کے گھر کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''وہ گھر دیکھتے ہو۔ وہ ہمارا ہے۔ وہ دو منزلہ گھر اتنا کہہ کر پھر میری طرف پلٹی اور اس کے اس طرح مڑنے اور پلٹ آنے میں اس کے سینے کے حباب مچل مچل گئے۔ میرا دل بھی مچلنے لگا۔

''تو تم سرجنی کی وادی کی مالکن ہو؟''

''مالکن تو میری ماں ہے۔''

''سرجی اماں؟''

اس لڑکی کے پتلے سرخ ہونٹ ذرا سے کھلے اور اس میں چنبیلی کے غنچے نظر آنے لگے وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ''تم میری اماں کا نام کیسے جانتے ہو۔'' تمہیں تو میں نے اس علاقے میں آج تک نہیں دیکھا اور میری ماں کا نام سرجی نہیں ہے۔ سروجا دیوی ہے۔''

''میں نے آج تک اس علاقے میں اس سے پہلے کبھی قدم نہیں رکھا۔ ایک سیٹھ نے مجھے تمہاری ماں کا نام بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ایک بیوہ ہے اور اپنی زمین بیچ کر اپنی لڑکی کے سسرال جانا چاہتی ہے۔''

''یہ تو سچ ہے۔'' لڑکی سر ہلا کر بولی اور اب اس کی نگاہوں میں میرے لیے جو شک وشبہ تھا وہ بھی دور ہوتا دکھائی دینے لگا۔ ''تو کیا تم زمین خریدنے آئے ہو؟''

''زمین خریدنے نہیں، زمین دیکھنے آیا ہوں۔ اگر پسند آ گئی اور بھاؤ ٹھیک ہوا تو خرید بھی لوں گا۔ مگر اب تمہیں دیکھ کر جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی جیر آباد میں جا کے بس جاؤں۔''

''چھی۔'' وہ لڑکی ذرا نخوت سے بولی مگر خوش ہوئی۔ چہرے پر تنفر اور غصہ عارضی تھا۔ ہر عورت اپنی تعریف سے خوش ہوتی ہے، چاہے وہ شادی شدہ کیوں نہ ہو۔

''میرا شوہر بڑا ظالم ہے۔ جیر آباد میں تم نے مجھے ایسی ویسی نظروں سے دیکھا تو تمہاری جان لے لے گا۔''

''بہت دیکھے ہیں جان لینے والے۔'' میں اس کے قریب جانے لگا۔ اس نے ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے پتھر سے نشانہ بنانا چاہا۔ میں رک گیا۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم ساوتری نہیں ہو۔ عین وہی صورت ہے۔ کیا دو لڑکیاں ایک ہی صورت کی ہو سکتی ہیں؟ اتنی گہری مشابہت؟ کہیں تم مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہو!''

''تم ہمارے گھر چل رہے ہو نا۔ میری اماں سے بات کرو گے نا سب معلوم ہو جائے گا میں کون ہوں!''

سورج غروب ہونے لگا۔ سائے بڑھنے لگے اور قلعے کے کنگوروں اور برجیوں کے سلہوٹ نمایاں ہونے لگے۔ ہوا میں خنکی بڑھنے لگی اور خنکی کے ساتھ سربھئی کے جنگلوں سے آنے والی خوشبو بھی آنے لگی۔

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔

وہ میرے ساتھ ساتھ بڑی لااُبالی انداز میں چلنے لگی۔ گلابی اوڑھنی کے نیچے کس کر بندھی ہوئی پتلی انگیا اور اس کے نیچے کڑھا ہوا سرخ سرخ گھاگرا جس کے آم کے پتوں والی

کشیدہ کاری میں آئینے جڑے ہوئے تھے۔ آئینوں کے وہ چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے بھاگتے ہوئے سورج کی روشنی کے انعکاس سے چمک اُٹھتے۔ چہرے پر کندن کی سی ضیا۔ وہ متناسب اعضا والی بوٹے سے قد کی لڑکی تھی۔ کسی طرح وہ ایک بچے کی ماں نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کسی طرح وہ پانچ سال کی بیاہتا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کسی طرح سولہ سترہ سال سے زیادہ کی عمر کی نہیں معلوم ہوتی تھی چلتے چلتے اِس کا گھاگرا میرے پاؤں سے چھو جاتا یا اُس کی اوڑھنی کسی کانٹے دار شاخ سے الجھ جاتی تو میں اُسے آہستہ سے الگ کر دیتا اور وہ میرا شکریہ ادا کئے بغیر اوڑھنی سنبھال کر چلنے لگتی۔

عجیب دلکش والہانہ سی چال تھی اس کی میں تو راستے بھر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کب سورج غروب ہو گیا۔ کب شفق کی لابی نیلگوں کانچ کی سطح میں تبدیل ہوگئی۔ کب نیلگوں کانچ پر سرمئی لہریں دوڑنے لگیں۔ کب دھوپ کا جال وادی سے اُٹھ کر اُفق کے اس پار گم ہو گیا۔ کب شام کے سرسراتے سائیوں نے تاریکی کا جامہ پہن لیا۔ بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب اس کے گھاگر کی گہری سرخی گہری تاریکی میں تبدیل ہوگئی اور اس تاریکی میں وہ چوکور آئینے کبھی کبھی جانے کہاں سے روشنی پا کر جھلملانے لگتے تب میں نے سمجھا رات ہوگئی۔

چلتے چلتے وہ کبھی ایسی گہری سانس کھینچتی جو کسی دکھے ہوئے دل کے بہت قریب معلوم ہوتی میں چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا مگر اس کا چہرہ تاریکی میں تھا۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم اتنی دور قلعہ کے کھنڈروں میں کیوں آئی تھیں۔“

”بیر کھانے آئی تھی۔“

”بیر تو تمہاری وادی میں بھی ملتے ہوں گے؟“

”ملتے ہیں مگر اتنے میٹھے نہیں ہوتے۔“

میں چپ رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔“ وہ ایک آہ بھر کے بولی۔

”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں قلعے کے باہر کھنڈر میں اس لیے جاتی ہوں کہ

ویرانے میں میرا دل بہت لگتا ہے۔"

"کیا تم بھی میری طرح ویرانے کی عاشق ہو؟" میں اس کے جواب پر چونک کر کہنے لگا۔

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے چلتی رہی۔

کچھ دیر کے بعد ایک ڈھلان سے ہم دونوں گزرنے لگے۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے۔ تھوڑی دیر کے بعد پانی کا شور سنائی دینے لگا۔ ایک جگہ پر وہ رک گئی۔ یہاں تاریکی بہت تھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔

وہ بولی۔ "اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔"

"کیوں؟"

"یہاں پر نالے کا پانی بہت تیز ہے اور اس نالے کے اوپر تین درختوں کو گرا کر ہم لوگوں نے ایک پل باندھ رکھا ہے مگر بڑا اوبڑ کھابڑ پل ہے اور درختوں کے تنے جگہ جگہ سے ملتے بھی ہیں میں تو آنکھ بند کر کے اس پل پر سے گزر سکتی ہوں مگر تم اگر ذرا بھی ڈگمگائے تو نالے کے تیز بہتے ہوئے پانی میں جا گرو گے اور پھر تمہاری ہڈی پسلی تک نہیں ملے گی، پانی اتنا تیز ہے۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا۔"

"نہیں۔" وہ سرگوشی کے لہجے میں بولی۔ "اندھیرا تو مجھے بہت پسند ہے۔"

میں چپ رہا۔ سوچنے لگا یہ لڑکی بڑی رومانٹک معلوم ہوتی ہے۔ اکثر اس عمر میں لڑکیاں اسی طرح رومانٹک ہو جاتی ہیں اور شوہر اور بچے اور گھر رکھتے ہوئے بھی کسی موہوم رومانس کی تلاش میں آہیں بھرا کرتی ہیں۔

میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے چلنے لگی۔ ہمارے قدم اب تراشیدہ درختوں کے پل پر تھے اور نیچے نالے کا شور بہت بڑھ گیا تھا اور اس تاریکی میں بھی کہیں کہیں اس کا سفید جھاگ تیزی سے بہتا ہوا نظر آ جاتا۔ لڑکی بڑے مضبوط قدموں سے چل رہی تھی اور اس کے نرم و نازک ہاتھ کی مومی اُنگلیاں میرے دل میں شمعیں جلا رہی تھیں پھر ہم نے پل پار کر لیا۔ اور ایک چڑھائی چڑھنے لگے۔ پانی کا شور کم ہوتا گیا اور درختوں کی سائیں سائیں تیز ہوتی گئی۔ اب ہم ایک سطح مرتفع پر تھے۔ یہاں پر وادی

پھیل کر ایک میدان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ہم دونوں درختوں کے ایک کنج میں کھڑے تھے اور سامنے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر وہ دو منزلہ پختہ گھر تھا جس کے اندر روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

ریکھا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ بولی۔ ''میں جاتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''اپنے گھر۔''

''اور میں؟''

''تم بعد میں، آدھے گھنٹے کے بعد آنا۔''

''کیوں؟''

''اتنی رات گئے، میرے گھر والے مجھے کسی اجنبی کے ساتھ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ اس لیے آدھے گھنٹے کے بعد نہیں، ایک گھنٹے کے بعد آنا۔''

''آؤ گے نا۔'' اس نے عجیب دردمندی سے مجھ سے پوچھا۔ ''ضرور آؤ گے ناں؟''

اس کے دل کا کرب کہیں پر اندر سے مجھ سے چھو گیا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ آؤں گا کیوں نہیں بھلا اس اندھیری رات میں اور جاؤں گا کہاں؟''

وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر اندھیرے میں گم ہو گئی۔ چند قدم پر جیسے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ہنڈ بیگ سے ایک چھوٹا سا تولیہ نکال کر میں نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اپنے ریڈیم واچ سے وقت دیکھا ابھی تو سات ہی بجے تھے، ہاں مگر پہاڑوں پر رات بہت جلدی آجاتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے میں نے آبھا کے بارے میں سوچا۔ اسے شاید کوئی دوسرا مرد مل گیا ہوگا ایسی تیز رفتار دنیا ہے۔ آج کل کوئی کسی کے انتظار میں بیٹھا نہیں رہتا۔ محبت کو بھی جیٹ کے پر مل گئے ہیں۔ آج کل محبت ایک ائیر ہوسٹس کی طرح ہے جو ہر آنے جانے والے مسافر کو اپنی مسکراہٹ پیش کرتی ہے۔ چند گھنٹے ہر مسافر کے ساتھ چلتی ہے جس کی پوری مسافت ایک پوری زندگی کی طرح ہے۔ وہ ایک بیوی کی طرح چائے بھی پلاتی ہے۔ لنچ بھی کھلاتی ہے۔ جھوٹے برتن بھی اُٹھاتی ہے۔ آپ کی گردن کے نیچے تکیہ بھی رکھتی ہے، جو اکثر بیویاں نہیں رکھتیں۔ پھر سفر ختم ہونے کے بعد وہ اس طرح ہاتھ ہلاتی ہے

جیسے آپ روزمرہ کی طرح گھر سے دفتر جا رہے ہیں۔ حالانکہ شاید پھر کبھی آپ دونوں کو ملنے کا موقع نہیں ملے گا تو کیا ہوا۔ پھر کوئی دوسرا جیٹ ہے۔ کوئی دوسری ایئر ہوسٹس یا وہی جیٹ اور وہی ایئر ہوسٹس مگر کوئی دوسرا مرد ہوائی جہاز کے سفر میں ایک کشش یہ بھی ہے۔ ہر مسافر کو چند گھنٹوں کے لیے اپنی پسند کی بیوی مل جاتی ہے۔ خوبصورت، خدمت گار کم گو اور ہمیشہ متبسم فالتو پریم سے میں کبھی نہیں گھبرایا۔ مگر کہیں اندر جا کر دل کے بہت اندر جا کر کہیں پر ہمیشہ کے لیے نک جانے کا احساس بھی چھپا ہوا ہے۔ جانے کیوں؟ حالانکہ یہ مرد کی فطرت نہیں ہے۔ مگر آج کل تو عورت کی فطرت بھی بدلتی جا رہی ہے۔ یوں سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت کو اگر یکساں مواقع ملیں تو دونوں کی فطرت یکساں ہو جاتی ہے۔ اس میں آبھا کا بھی کیا قصور ہے؟ شاید وہ مجھ سے زیادہ سچی اور حقیقت پسند ہے۔ پھر سونے پن اور کسی ویرانے کی تلاش کے لیے کسی جنگل میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کل کی شہری زندگی میں کہیں پر کوئی تار آدمی اور آدمی کے درمیان ٹوٹ چکا ہے۔ شاید اسے ڈھونڈھنے کے لیے درختوں کے پاس جانا ضروری ہے۔

سوچتے سوچتے ایک گھنٹہ یوں گزر گیا کہ پتا بھی نہیں چلا۔ گزرگاہ خیال میں یہی تو ایک خوبصورتی ہے۔ آدمی تھکتا نہیں ہے مگر میں اب صبح کا چلا ہوا بے حد تھک گیا تھا اور سامنے گھر کی روشنیاں مجھے بلا رہی تھیں۔

☆☆☆

حویلی کا بڑا دروازہ کھلا اور کسی نے لالٹین اوپر اٹھا کر میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔

''کون ہو تم؟'' یہ ایک معمر عورت کی آواز تھی۔

''ایک مسافر ہوں۔ راہ بھٹک گیا ہوں۔ رات بھر کے لیے پناہ چاہتا ہوں۔''

''کہاں سے آئے ہو؟''

''پار پیا گاؤں سے۔''

''ادھر کیا کام ہے؟'' اس معمر عورت نے اب لالٹین نیچے کر لی تھی اور اب میں اس کا معمر خاکستری رنگت والا چہرہ دیکھ سکتا تھا، جہاں منڈھی ہوئی کھال کہیں کہیں سبز رنگت کی سلوٹوں میں بدل چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے آج ہی کفن میں سے نکال کر لایا گیا ہو۔

''اوہ ہو۔ بے چارہ باہر کھڑا ہے سردی میں ٹھٹھر رہا ہے۔'' کوئی نوجوان لڑکی معمر خاتون کے پیچھے سے بولی۔ ''بیچارے کو اندر آنے دو نا۔ داہلی بوا۔''

میں نے آواز پہچان لی۔ ریکھا تھی۔

پھر ریکھا کے پیچھے ذرا دور سے کسی تیسری عورت کی آواز آئی۔

''ریکھا، بیٹی کون ہے؟''

''ماں اک مسافر ہے۔ رات بھر کا آسرا چاہتا ہے۔''

''اسے آنے دو۔'' اس عورت نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور میرے سامنے کھڑی معمر عورت نے ہٹ کر مجھے راستہ دے دیا مگر مکمل رضامندی سے نہیں۔ منہ ہی منہ میں بدبدا رہی تھی اور مجھے شبہے کی نظروں سے دیکھتی جاتی تھی۔

آگے آگے ریکھا۔ اس کے پیچھے لالٹین اُٹھائے ہوئے وہ معمر عورت اور اُس کے پیچھے میں چلا۔ یہ قافلہ ایک کھلے آنگن کو پار کر کے ایک صحن سے گزرا۔ صحن کو پار کر کے ایک تنگ و تاریک غلام گردش میں گھسا۔ چند گز کے فاصلے پر روشنی نظر آئی ایک بڑے سے دروازے سے ہم اندر آ گئے۔

یہ ایک بڑا دیوان خانہ تھا۔ پرانے فرنیچر سے پٹا ہوا۔ فرنیچر کم سے کم سو سال پرانا ہوگا۔ جگہ جگہ تخت اور گاؤ تکیے اور ایک پرانی چھپر کھٹ اور کلابتوں کے پردے اور دیواروں پر پرانی بندوقیں اور بارہ سنگھوں کے سر اور پرانے بزرگوں کی تصویریں اور دو بڑے بڑے بلوریں جھاڑ ہوا میں عہد پارینہ کی خوشبو تھی اور راجپوتی تلواروں کی جھنکار کی گونج۔ دیوان خانے کے ساز و سامان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے اس گھر نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہیں اور کبھی ایسے خوفناک دن بھی جو یکایک تشدد کی سرخی سے بھر گئے تھے۔

میں بہت حساس آدمی ہوں۔ دیوان خانے کو دیکھ کر ماضی کے ہیولے میری نظروں کے سامنے سے جیسے صاف صاف گزرنے لگے۔

مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا کیونکہ میرے سامنے کالے کنارے کی سفید ساڑھی پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی ایک خاتون تخت پر بیٹھی ہوئی پاندان کھولے ہوئے چھالیا کتر رہی تھی اور مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ناک نقشے اور چمپئی رنگ اور بدن کی مشابہت

سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ریکھا کہ ماں ہوگی۔ اب بھی خوبصورت تھی۔ کبھی بے حد خوبصورت رہی ہوگی۔

وہ بولی۔ ''یہاں تو کوئی نہیں آتا، تم ادھر کیسے بھٹک گئے۔''

اس کی نکیلی نگاہیں مجھے چبھنے لگیں۔

میں نے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں بھٹکا نہیں ہوں۔ ادھر آنے ہی کے ارادے سے آیا تھا۔ ایک سیٹھ نے آپ کے گھر کا پتا دیا۔ کچھ زمین خریدنے کا ارادہ ہے۔ اگر مول بھاؤ ٹھیک سے ہوجائے۔''

ریکھا کی ماں غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ لمبے تکلیف دہ وقفے کے بعد اس کے نازک خطوط والے چہرے کے بھاؤ نرم پڑ گئے۔ شیریں لہجے میں بولی۔ ''آدمی شریف لگتے ہو۔ تم سے مول بھاؤ ہوجائے گا۔''

پھر مڑ کر اس معمر عورت سے بولی۔ ان کے لیے مہمان خانہ کھول دو، اور ان کے اشنان کے لیے پانی رکھ دو اور ریکھا تم میرے ساتھ چلو۔ لگتا ہے مسافر بستر بھی ساتھ نہیں لایا۔ میں اندر سے پارچے دیتی ہوں۔''

دیوان خانے سے ایک بڑا چوبی زینہ اوپر کی منزل کو جاتا تھا۔ داہی بوا لالٹین لے کر آگے آگے چلی۔ ہم دونوں کے قدموں کی آواز سے دیوان خانہ گونج رہا تھا۔ کبھی اس زینے اور چوبی زینے پر غالیچہ رہا ہوگا اور گزرنے والے قدم بے آواز رہے ہوں گے مگر اب تو چوبی زینے کی ساری چمک دمک غائب ہوچکی تھی اور چلتے چلتے زینے کی سیڑھیاں چر چرا کر آواز بلند کرتی تھیں۔

زینہ چڑھ کر ہم بائیں طرف مڑے، پھر دائیں طرف۔ پھر ایک لمبی غلام گردش کے کونے پر رک کر داہی بوا نے اپنے گھاگرے میں لٹکی ہوئی چابیوں کا ایک بڑا گچھا نکالا اور ایک چابی لگا کر دروازہ کھول دیا اور لالٹین لے کر اندر آئی۔

لالٹین کی روشنی میں مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی ہرے بھرے باغیچے میں ہوں۔ دیواروں پر ہرے ہرے پیڑوں، بیلوں کے نقش ونگار تھے۔ چھت بھی اسی طرح نقشین تھی۔ دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک دروازہ ساتھ میں پرانی وضع کا ایک غسل خانہ کمرے میں آیا۔

جگہ چھپر کھٹ تھی۔ دوسری طرف دو تخت اور دو تپائیاں ایک کونے میں ایک قد آدم صراحی نما گلدان نیلگوں نقش و نگار سے آراستہ بہت پرانا بڑا بیش قیمت چینی کا گلدان۔

میں ابھی کمرے کا معائنہ کر رہا تھا کہ سرو جا دیوی چھپر کھٹ پر بچھانے کے لیے چادریں اور تکیے کے غلاف لا کر داہلی بوا کو دے گئیں۔ داہلی بوا کے ہونٹ ابھی تک نخوت سے مڑے ہوئے تھے اور ماتھا تیوریوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ اپنا سارا غصہ بستر کی چادروں کو ٹھیک کرنے میں نکال رہی تھیں۔

پھر ایک لمبی چوٹی اور میلی دھوتی والا نوکر ہاتھوں میں پانی کی دو بالٹیاں اُٹھائے اندر آیا ایک بالٹی سے دھواں اُٹھ رہا تھا، کھولتا پانی ہوگا اور دوسری بالٹی میں ٹھنڈا ہوگا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے ٹھنڈے پانی کی ایک بالٹی اور چاہیے۔''

داہلی بوا کے نتھنے پھڑکے، منہ ہی منہ میں کچھ بدبدائی نوکر ''اچھا'' کہہ کر چلا گیا اور چند منٹ کے بعد تیسری بالٹی لا کر غسل خانے میں رکھ گیا۔ اتنے میں داہلی بوا نے تپائی پر رکھا ہوا ایک شمع دان روشن کر دیا۔

پھر مجھ سے منہ پھیر کر بولی۔ ''جب کھانا تیار ہوگا آ کر بول جاؤں گی۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ ہینڈ بیگ سے ایک جوڑا کپڑے نکال کر غسلخانے میں گھس گیا اور اچھی طرح غسل کیا۔

تھکا ہوا تو تھا ہی، غسل کے بعد غنودگی آنے لگی۔ چند منٹ آرام کرنے کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی معلوم نہیں کب سو گیا۔ معلوم نہیں کب کس نے ٹھوکا دے کے جگایا۔ ہڑ بڑا کے اٹھا تو دیکھا رات گہری ہو چکی ہے اور ریکھا میرے بستر کے قریب کھڑی مجھے جگا رہی ہے۔

''کب سے سو رہے ہو؟؟ اٹھو کھانا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ سب کھا کے سو گئے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے جگا دیا ہوتا۔''

''اماں نے منع کر دیا۔ بولیں تھکا ماندہ آیا ہے، دو گھنٹے سو لینے دو۔'' میں اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دو تین کمروں کے دروازوں سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے۔

یہاں ایک چھوٹے سا کچن تھا، کھانا پکانے کے لیے نہیں غالباً کھانا گرم کرنے کے
لیے چند برتنوں میں ڈھکا ہوا کھانا رکھا تھا اور ایک چولہے میں آگ سلگ رہی تھی۔ چولہے
کے قریب بادامی رنگ کی ساڑھی پہنے ریکھا کی ماں پھلکے اتار رہی تھی۔

"آپ نے بڑی تکلیف کی۔" میں نے کہا۔ "مجھے پہلے جگا دیا ہوتا۔"

ریکھا کی ماں نے ایک تھالی کی کٹوریوں میں سالن نکالے اور گرم گرم پھلکے اتار کر
رکھے اور تھالی میری طرف کھسکا دی۔

دوسری تھالی اس نے ریکھا کو دی جو مجھ سے ذرا پیچھے بائیں طرف اس طرح بیٹھی
تھی کہ میں اس کے بالوں میں گھرے ہوئے رخ کو دیکھ سکتا تھا۔

بڑی خاموشی میں کھانا کھایا گیا۔ میں کبھی تو کھانا کھاتا کیونکہ بہت بھوک لگی تھی۔
کبھی سمٹی سمٹائے اپنے قریب بیٹھی ریکھا کو کھانا کھاتے دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں بڑے
گہرے سپنے جھانک رہے تھے۔ مجھے پورا منظر ہی ایک سندر سپنا سا لگتا تھا۔ کھاتے کھاتے
کبھی نیند سے آنکھیں جھپک جاتیں اور پل بھر کے لیے اندھیرا چھا جاتا، پھر آنکھیں کھولتا تو
ریکھا کی ماں کے رخ پر شعلے ناچتے ہوئے دیکھتا اور روشنی کا ہالہ ریکھا کے چہرے اور بالوں
کے گرد پھیلتے ہوئے دیکھتا۔ پھر ریکھا کی مومی انگلیاں دیکھتا جو بڑے سلیقے سے لقمہ اٹھا کر
اپنے ہونٹوں تک لے جا رہی تھیں۔ ایک دفعہ دھیرے سے میری تھالی اس کی تھالی سے
ٹکرا گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنا لقمہ توڑ کر میری تھالی میں رکھ دیا ہو، اور میں نے
اسے اٹھا کر اپنے معدے میں نہیں، اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں چھپا لیا ہو۔ اس نیم
غنودگی کے عالم میں مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا۔ بڑی گہری قربت والی خاموشی میں
لرزتی پلکوں کے سائے میں جھکی جھکی آنکھیں اور سانس ایسی مدھم گداز اور گہری جیسے آدھی
رات میں رات کی رانی کے پھول کھلتیں ہوں۔ کبھی دس برس میں کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی آدھے
لمحے کی اونچی اُڑان میں ساری زندگی روشن ہو جاتی ہے۔

کھانا کھلا کے ریکھا نے میرے ہاتھ دھلائے۔ پھر سرو جادیوی نے ایک شمع دان
اُٹھایا۔ آگے آگے ماں چلی، پیچھے پیچھے بیٹی، اُس کے پیچھے میں اس بوٹا سے قد والی لڑکی کی
بڑی ڈولتی ہوئی چال تھی۔ نیند میں مدماتی چال بڑے ٹھہرے گھماؤ۔ بڑے خطرناک خم۔ بی

بار میرا جی اسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر سمیٹ لینے کو چاہا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک گڑیا کی طرح ان بازوؤں میں سما جائے گی مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا حالانکہ نیند تھی اور نشہ تھا اور گہرے قرب والی خاموشی تھی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ مگر جیسے بدن بدن کو بلاوا دے رہا ہو۔

میرے کمرے کے قریب جا کر دونوں ماں بیٹی رک گئیں۔ ماں نے کہا۔ ''آرام سے سوؤ۔ صبح دو گھوڑے تیار ملیں گے اور ریکھا تمہیں زمین دکھا دے گی۔''

ریکھا کی نگاہیں اوپر میرے چہرے کی طرف اُٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے دو کوندے لپکے پھر وہ آنکھیں جھک گئیں اور ریکھا کچھ کہے بغیر اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔ جب تک وہ اوجھل نہیں ہو گئیں میں غلام گردش میں کھڑا اُنہیں دیکھتا رہا۔

پھر میں اپنے کمرے میں آیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ شمع دان کو گل کیا اور دونوں کھڑکیاں کھول کر دور سے آنے والی جنگلوں کی ہواؤں کی سائیں سائیں سنتا سو گیا۔

جانے کب تک سوتا رہا۔ یکایک کسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے اور میری گردن پر کوئی پھندا سا ہے جو میرا دم گھونٹ رہا ہے۔ یکایک میرا ہاتھ گردن پر تھا اور اب اس ہاتھ کی ہتھیلی بھی پھندے میں آچکی ہے۔ مجھے اپنے قریب کسی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنائی دی اور کوئی اس پھندے کے گھیرے کو تنگ کر رہا تھا۔

بس میری خوش قسمتی یہی تھی کہ سوتے میں میرا ایک ہاتھ میری گردن پر رہ گیا تھا۔ اب اس ہاتھ کو جو پھندے کے اندر تھا میں نے زور لگا کر پھیلانا چاہا۔

گو پھانسی دینے والے کی گرفت بڑی مضبوط تھی مگر میں دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ گردن سے چند انچ اٹھانے پر کامیاب ہو گیا۔ پھر زور سے میں نے جو ایک جھٹکا دیا تو میری گردن پھندے کی گرفت سے آزاد تھی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا تھا اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دوسرے لمحے میں پھندا ڈالنے والا آدمی مجھ سے بھڑ گیا۔ ہم دونوں زور مارتے ہوئے چھپر کھٹ سے نیچے کمرے کے فرش پر آرہے اور ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے فرش پر چکر کھاتے رہے۔

اس آدمی کا سارا بدن ننگا تھا اور اس کے جسم سے بھانگ کی سی بو آتی تھی۔ میں نے

ٹٹول کر دیکھا۔ اتنا ہی محسوس کر سکا کہ وہ گٹھے ہوئے بدن کا، ناٹے قد کا بے حد مضبوط آدمی ہے اور کشتی کے داؤ پیچ میں میرے لیے اسے ہرانا ناممکن ہوگا۔

مگر میں نے کلکتہ جوڈو کراٹے کے فن بے کار نہیں سیکھے تھے۔ تین چار بار مار کھانے کے بعد میں نے اندھیرے میں اندازہ کر کے اُس کی پسلیوں میں جو کراٹے کا ایک ہاتھ مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا اور لڑھکتے ہوئے اس کے خاموش لبوں سے درد کی ایک سسکی سی نکلی۔ مگر وہ بے حد مضبوط بدن کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ لڑھک کے وہ پھر اُٹھا اور خاموشی سے پھر مجھ سے بغلگیر ہو کر مجھے گرانے کی کوشش کرنے لگا۔ دو بڑے کرارے گھونسے مجھے لگے مگر کوشش کر کے پھر میں گرتے گرتے اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا اور جوڈو سے اسے ایک ایسی پٹخنی دی اور پٹخنی کھلاتے کھلاتے اُس کی گردن پر اس زور کا ہاتھ دیا کہ اگر اس نے وار بچا کر میرا وار اپنے کندھے پر نہ لے لیا ہوتا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی ہوتی مگر شانے پر بھی میرا وار اتنا تگڑا تھا کہ وہ کئی پٹخنیاں کھاتے ہوئے فرش پر لڑھکتا گیا۔ دوسرے لمحے وہ آدمی ایک چھلاوے کی طرح کھڑکی سے کود کر غائب ہو گیا۔

چند منٹ تک میں تھکے تھکے سانس لیتا رہا۔

پھر جب سانس قابو میں آیا تو میں نے دیا سلائی جلا کر کانچ کا شمع دان روشن کیا اور دروازہ کھول کر باہر غلام گردش میں گیا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ جو کوئی بھی تھا جا چکا تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں گیا۔ دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ دونوں کھڑکیاں جو ابھی تک کھلی رکھی تھیں بند کیں اور ایک سگریٹ سلگا کر بستر پر آ بیٹھا اور کش لے لے کر اور بالوں میں انگلیاں پھرا پھرا کر سوچتا رہا کہ یہ غیر متوقع حملہ کس نے کیا اور کیوں۔

جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چادر تان کر لیٹ گیا مگر دیر تک نیند نہیں آئی۔ پھر سوچتے سوچتے کب سو گیا۔ کچھ معلوم نہیں۔ اٹھا تو سورج کی کرنیں کمرے میں آ رہی تھیں اور کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

اُٹھ کے دروازہ کھولا۔ دا ہلی بوا چائے لے کر کھڑی تھیں۔



کھانے کے کمرے میں ناشتا لگا تھا۔ ایک پرانی کرم خوردہ مہاگنی کی میز جس پر

شاید مہمان کے اعزاز میں آج سفید چادر بچھائی گئی تھی۔ ناشتے کی چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔ ویجی ٹیرین ناشتا تھا۔ تلی ہوئی مٹر، آلو کی بھاجی، مرچوں بھرا کدو کا سالن۔ تازہ مکھن اور گرم گرم پوریاں۔

ریکھا کی ماں بولی۔ ''ٹھیک سے ناشتا کرلو۔ آج تمہیں زمین دیکھنے جانا ہے کہیں شام کو لوٹو گے۔''

''تو کیا دن بھر کھانا نہیں ملے گا۔'' میں نے مسکرا کر پوچھا اور غور سے سروجا دیوی کی طرف دیکھا۔ سروجا دیوی نہا کے آئی تھیں اور بنارسی سلک کی سفید ساڑھی پہنے تھیں۔ ان کے سرخ وسفید چہرے کا پختہ حُسن عجیب دلکشی لیے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا۔ اس عمر میں عورت اتنی خطرناک ہے تو جوانی میں اس کی ادائیں کتنی مسحور کن رہی ہوں گی۔

سروجا بولی۔ ''نہیں کرپارام کو دوپہر کا کھانا دے کر بھیج دوں گی۔''

ریکھا نے پوچھا۔ ''مگر وہ ہمیں ملے گا کہاں۔''

سروجا بولی۔ ''وہ تمہیں شکار گھر پرمل جائے گا کھانا لے کر۔''

''شکار گھر کہاں پر ہے؟'' میں نے ریکھا سے پوچھا۔

''جہاں پر ہماری زمین ختم ہوجاتی ہے، اور جنگل شروع ہوتا ہے۔ وہاں پر ہے۔ تمہیں دکھادوں گی۔'' ریکھا نے جواب دیا۔

میرے سامنے دیوار پر دو تصویریں آویزاں تھیں۔ چوڑے چکلے چہرے گل مچھے اور ٹھوڑی پر سے دونوں طرف کھینچی ہوئی راجپوت وضع کی داڑھی گہری چمکیلی پروقار آنکھیں اور سر پر کلغی سے سجی بنا کی پگڑیاں ایک کی عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے کی کم مگر دونوں چہروں میں ایسی مشابہت تھی، جیسی میں نے ساوتری اور ریکھا کے چہروں میں دیکھی تھی۔

میں نے دونوں تصویروں کے بارے میں ریکھا کی ماں سے پوچھا۔

سروجا دیوی کا چہرہ دھندلا سا گیا۔ اس نے دونوں تصویروں کی طرف بس ایک لمحے کے لیے دیکھ کر نظریں ہٹالیں۔ آہستہ سے بولی۔ ''وہ جن کی عمر زیادہ ہے وہ میرے پتی ہیں۔ دوسرے جو کم عمر ہیں وہ میرے دیور۔''

''دونوں کہاں ہیں؟''

سروجا دیوی بولیں۔ ”جب تک دونوں بھائی زندہ تھے، یہ وادی ہری بھری اور زندگی سے جیتی جاگتی تھی۔ پورے تین سوا ایکڑ میں کھیتی باڑی ہوتی تھی اور پچاس سے اوپر ہمارے کارندے تھے اور اس حویلی کی شان وشوکت ہی نرالی تھی۔ اُن کے دیہانت کے بعد سب کچھ اجڑ گیا۔ میں عورت ذات کہاں تک یہ زمین سنبھال سکتی ہوں۔ لڑکی کا بیاہ ہو گیا ہے۔ صرف سات کارندے باقی ہیں۔ وہ بھی ہردم جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ زمین بیچ باچ کے لڑکی ساتھ جارہوں۔ اگر وہاں بھی دل نہ لگا تو ہردوار چلی جاؤں گی مگر اب اس ویرانے میں میرا جی نہیں لگتا۔“

”مگر میرا جی شائد لگ جائے گا۔“ میں نے اس سے کہا۔

وہ بولی۔ ”دیکھ لو جگہ پسند آجائے تو سودا ہو جائے گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا مجھے ساری جگہ خریدنی ہوگی؟“

وہ بولی۔ ”یہ گھر نہیں دوں گی۔ یہ حویلی ہمارے پرکھوں کی آخری نشانی ہے۔ اس کے ساتھ پچاس ایکڑ زمین بھی رکھ لوں گی۔ اپنے اور ریکھا کے نام۔ کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تو خوشی ہوگی اگر آپ یہاں رہیں۔ ایک سے دو بھلے اور میں اتنی ساری زمین لے کر کروں گا بھی کیا۔ شاید اتنی رقم بھی میرے پاس نہ ہوگی۔“

سروجا دیوی کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”ناشتا ختم کر کے صبح صبح نکل جاؤ تو اچھا ہے۔ حویلی کے باہر دو گھوڑے تیار ملیں گے۔“

ریکھا کی ماں کے جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ رات کے حملے کی بات ریکھا کو بتاؤں کہ نہ بتاؤں۔ دھیرے دھیرے مٹر کے دانے ٹونگ رہا تھا کہ اتنے میں ریکھا نے پوچھا۔

”اس ویرانے میں کیوں آکر رہنا چاہتا ہو؟ کیا کسی کی محبت میں ہارے ہو؟“

میں نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔ ”نہیں تو ہارا اس لیے نہیں کہ کسی سے ایسی محبت ہی نہیں کی ہاں مگر کسی سے ہارنے کو جی چاہتا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ زندگی میں پھولوں ہی سے نہیں، زخموں سے بھی کھیلا جاسکتا ہے اور

شاید زخموں کی حسرت زیادہ دیر پا ہوتی ہے۔ ان کا رستا ہوا دھیرے دھیرے جھرنے کی طرح بہتا ہے۔''

مگر یہاں تمہیں محبت کرنے کے لیے کون سی عورت ملے گی؟ میں دو دن کے بعد سسرال جانے والی ہوں۔ میری اماں سے اگر تم زمین خرید لو گے تو وہ بھی یہ جگہ چھوڑ کر میری سسرال آ جائیں گی۔ تم اس ویرانے میں کس سے محبت کرو گے؟''

''میں شاید کسی ہرنی سے محبت کر لوں گا۔ دل میں محبت ہو تو پتھر بھی گداز ہو جاتے ہیں۔ اس حویلی کی ہر غلام گردش سے مجھے کسی کے پائل کی جھنکار سنائی دے گی۔ محبت کے لیے کسی کا تصور بھی کافی ہے۔''

''عجیب پگلے ہو تم۔''

''پاگل ہوتا تو انسانوں کی آبادی چھوڑ کر ویرانے میں کیوں آتا؟''

ریکھا جب کپڑے بدل کر حویلی سے باہر نکلی تو اس نے ہلکے اودے رنگ کا چوڑی دار، جس میں اس کی سیڈول ٹانگوں کی ترشی ہوئی پھبن عجیب بہار دے رہی تھی، بال لہراتی ہوئی چوٹی میں بندھے تھے مگر ایک لٹ نکل کر رخسار پر آ گئی تھی، یا لائی گئی تھی۔ حُسن قدرت بھی ہے اور صنعت بھی۔ میں نے سوچا۔ ریکھا نے گہرے اودے رنگ کا دوپٹہ اپنی گردن کے دونوں طرف ڈال لیا اور بڑی مشاقی سے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ گئی۔ میں ذرا انکل سا بیٹھا، کیونکہ میں نے تو صرف دارجلنگ کی گرمیوں کے سیزن میں گھوڑوں کی سیر کی تھی۔

ہمارے گھوڑوں کے قریب ذرا فاصلے پر تین چار کارندے مودب کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی مجھے قابلِ توجہ معلوم ہوا۔ بھاری ٹھوڑی۔ گھنی مونچھیں اور گھنے ابرو کے نیچے چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں اور تنگ پیشانی، کس کر باندھی ہوئی پگڑی سے ڈھک گئی تھی۔ وہ بڑی چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد جب میں نے ریکھا سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا۔

''وہ راوت ہے۔ کارندوں کے اوپر منیجر ہے مگر طبیعت کا بڑا ظالم ہے۔''

''تو پھر تم اسے کیوں رکھے ہوئے ہو؟''

"سارا کام وہی دیکھتا ہے۔ میرے پتاجی کے وقت سے زمین سنبھالتا ہے سخت گیر ضرور ہے مگر کارندے ایسے آدمی سے ٹھیک رہتے ہیں۔ پھر شہر جا کر لگان وہی بھرتا ہے اور کچہری کے کاغذ وہی دیکھتا ہے۔ وہ نہ ہو تو میری ماں کیا کرے گی بے چاری خود سوچ لو اس کے سہارے اس جنگل میں پڑی ہے۔ اب تم آجاؤ گے تو جیسا جی چاہے کرنا۔"

زمین اونچی نیچی تھی۔ کہیں پر پہاڑی پگڈنڈی آجاتی۔ کہیں پر میدانی علاقہ کہیں پر زمین کاشت شدہ تھی مگر زیادہ تر کھیت غیر کاشت شدہ تھے۔ ان میں گھاس اگی ہوئی تھی اور بیلیں، جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ یہ زمین ایک سطح مرتفع کی صورت میں تھی۔ تین سو ایکڑ کا پلاٹو جس کے تین طرف نیم دائرے کی صورت میں سربھنی کا پہاڑی سلسلہ تھا اور بیچ میں ایک ندی بہتی تھی جو پلاٹو سے نیچے گزر کر کواڑی قلعے کی جانب چلی جاتی تھی، زمین کالے رنگ کی اور زرخیز تھی۔ ندی کا پانی بھی موجود تھا۔ اس لیے ایک اچھا فارم بن سکتا ہے۔ میں نے سوچا۔

ہمارے گھوڑے اب ایک پہاڑی پگڈنڈی پر جنگل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ آسمان پر دودھیا بادل تیر رہے تھے اور میں ریکھا کی لہراتی ہوئی چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی اوڑھنی کبھی چوٹی سے لڑ جاتی کبھی فضا میں الجھ جاتی۔ اونہہ کہہ کر ریکھا نے آخر اپنی اوڑھنی کو گھوڑے کی کاٹھی سے باندھ دیا اور میں اس کی پتلی لانبی گردن کا خم دیکھنے لگا۔ وہ بڑی مشاقی سے گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ اور مجھے اس کا ساتھ دینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اس لیے بھی کہ راستے کی طرف کم دیکھتا تھا اس کی طرف زیادہ، عورتیں بہت جلد اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نگاہوں کو محسوس کر لیتی ہیں۔ پھر ان کا چہرہ لال ہونے لگتا ہے۔ آنکھیں جھک جاتی ہیں اور سارے جسم میں سنسنی سی پھیلنے لگتی ہے۔ باتیں کرتے کرتے اب کافی عرصے سے ریکھا خاموش تھی یعنی جب سے میں اس کے چہرے میں ڈوب گیا تھا، جب سے وہ خاموش تھی۔

آخر وہ اس لمبی خاموشی کو توڑ کر بولی۔

"کوئی بات کرو۔"

"کیا کہوں؟"

میرے چبھتے ہوئے سوال پر وہ خاموش ہوگئی۔

شکار گھر تک کا فاصلہ ہم دونوں نے خاموشی سے طے کیا۔

☆☆☆

پتھر کی دیواروں کا شکار گھر اب خستہ حالت میں تھا۔ کبھی بہت عمدہ حالت میں رہا ہوگا۔ بڑے بڑے مضبوط دروازے اور اونچی محراب دار کھڑکیاں، جو جنگل کی جانب کھلتی تھیں۔ قریب ہی ندی بہتی تھی۔ آئینے کی طرح شفاف، صاف ستھرا میٹھا پانی۔ شکار گھر کے چاروں طرف بانسوں کی پرانی باڑھ تھی اور ایک باغیچہ جو اب ڈھاک کے پیڑوں اور جنگلی بیلوں سے بھرپور تھا۔ جگہ جگہ بیلوں پر کرمنی کے پیلے پیلے غنچے، سنہری کرن پھولوں کی طرح لٹک رہے تھے۔

پھول توڑ کر ریکھا نے جھمکوں کی طرح اپنے کانوں میں ٹانک لیے۔

میں نے پوچھا۔ ''ان زمینوں میں کیا پیدا ہوتا ہے؟''

وہ بولی۔ ''جب تک پتا جی زندہ تھے تو بہت کچھ ہوتا تھا۔ ندی کے کنارے دھان کے کھیت تھے۔ پہاڑی کھیتوں میں مکا ہوتی تھی۔ میدانی کھیتوں میں گیہوں، ریتلی زمین میں باجرا، جوار، دالیں، حویلی کے آس پاس کے باغیچوں میں ہر طرح کی سبزیاں۔ اب تو ہر طرف جنگل ہی جنگل ہے۔ پھر بھی گھر بھر کے لیے سب کچھ ہو جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی محنت کرے تو یہ جگہ ایک چھوٹی سی جنت ہے۔''

وہ بولی۔ ''جنت نہیں نرک ہے۔ نرک۔''

''نرک کیوں؟''

ریکھا کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔ ''آج سے پانچ سال پہلے اسی شکار گھر میں کسی نے میری پتا جی کو گولی ماردی تھی۔''

''اسی شکار گھر میں؟'' میں چونک گیا۔

''ہاں اسی کمرے میں جہاں ہم بیٹھے ہیں، ان کی لاش پائی گئی۔''

''قاتل کا کچھ پتا چلا۔''

''نہیں، میں دوسرے کمرے تھی۔ گولی کی آواز سن کر...... دوڑی دوڑی آئی تو پتا جی

کوخون میں لت پت فرش پر گرے ہوئے پایا۔ میں نے اُنہیں اُٹھانے کی کوشش کی تو دیکھا ابھی وہ زندہ تھے مگر آخری دموں پر تھے۔ان کی آنکھوں میں ایک سوال تھا اور جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بہت کوشش کر کے اُنہوں نے کہا۔

"مجھے" اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکے۔اُن کی گردن ڈھلک گئی اور آخری سانس بھی نکل گیا۔"

ریکھا کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ذرا توقف کے بعد میں نے پوچھا۔"قاتل کا کچھ پتا چلا۔"

"کچھ نہیں۔" کارندوں نے سارا جنگل چھان مارا، پولیس کئی مہینے تک تفتیش کرتی رہی مگر قاتل نہیں پکڑا گیا۔ ان کے مرنے کے ٹھیک ایک سال بعد پتا جی کے چھوٹے بھائی جن کی تصویر تم حویلی میں دیکھ چکے ہو، اُن کو بھی کسی نے اس شکار گھر کی سیڑھیوں پر گولی سے مار دیا۔

"ارے۔" میں حیرت سے چلایا۔

"ہاں وہ جنگل سے شکار کر کے آ رہے تھے اور شکار گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے اندر آنے کے لیے گولی جنگل کی طرف سے آئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔

میں سکتے میں آ گیا۔

ریکھا اپنے آنسو پونچھ کر بولی۔"پولیس مہینوں تفتیش کرتی رہی۔ کئی کارندے پکڑے گئے مگر آخر کو سب چھوٹ گئے۔قاتل کبھی پکڑا نہیں گیا۔"

"پولیس کا کیا خیال تھا۔"

"پولیس اتنا ہی ثابت کر سکی کے دونوں بھائی ایک ہی بندوق کی گولی سے ہلاک ہوئے تھے۔اس لیے دونوں بھائیوں کو مارنے والا ایک ہی آدمی تھا، مگر وہ کون تھا، اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔جس قسم کی بندوق سے وہ مارے گئے یا جس قسم کی گولی سے وہ بھی حویلی کے اسلحہ خانے میں موجود تھیں۔ان دونوں حادثوں کے بعد اس وادی کی ساری رونق جاتی رہی یہ وادی اجڑ سی گئی۔کارندے ایک ایک کر کے بھاگ گئے۔کوئی کہتا اس وادی پر آسیب کا سایہ ہے۔کوئی کہتا اس وادی میں بھوت رہتے ہیں اور کسی آدمی کو یہاں ٹکنے نہیں دیں

گے جب کسی جگہ کی شہرت ایسی نکل جائے تو پھر کون یہاں رہے گا۔''

دھیرے دھیرے کر کے چار برسوں میں سب لوگ چلے گئے ہیں۔ بس ایک راوت باقی ہے اور سات کارندے اور وہ بھی راوت کے آدمی ہیں اور اس نے ہی انہیں اب تک روکے رکھا ہے۔''

''اسی لیے تمہاری ماں یہ زمین بیچنا چاہتی ہیں؟''

''ہاں......اور تم کیا خریدو گے؟''

''خرید لوں گا۔ میں بھوت پریت کو نہیں مانتا۔ ہو نہ ہو ان حادثوں میں تمہارے کسی خاندانی دشمن کا ہاتھ ہے۔''

''ان دونوں بھائیوں کو چھوڑ کر ہمارے خاندان کا کوئی فرزند نہیں ہے۔''

''تمہارے پتاجی اور چچا کے مرنے کے بعد یہ زمین تمہیں جاتی ہے یعنی تمہارے پتی کو۔''

''میرے پتی بہت امیر ہیں۔ اپنے علاقے کے سب سے بڑے رئیس ہیں۔ راجپوتی ذات میں بھی ہم سے اونچے ہیں۔''

''لالچ بری بلا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جن دنوں میرے باپ کا قتل ہوا، اس وقت تک تو میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی اس لیے کس بات کا لالچ؟'' ریکھا نے مجھ سے پوچھا۔

یہ عمارت بھی ڈھے گئی۔ دل عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

''عجیب پراسرار معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔

ریکھا نے بات کا رخ پلٹتے ہوئے کہا۔ ''اب چھوڑو ان درد بھری باتوں کو۔ ان میں کیا رکھا ہے۔ آؤ میں تمہیں اپنے آموں کا باغ دکھاؤں۔''

☆☆☆

ہم پہاڑی سلسلے سے منہ موڑ کر مغرب کی طرف چلے جدھر پلاٹو کی سطح ہموار تھی۔ بہت کم اونچی نیچی۔ تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے، ہم مغرب کی طرف بڑھتے گئے اور ایک پختہ دیوار کے قریب جا کر رک گئے۔

دیوار کے بیچوں بیچ بانس کا ایک دروازہ تھا۔ اسے کھول کر اندر آ گئے۔ باغ بہت بری حالت میں تھا۔ آم جامن، لیچی کے پیڑوں کے علاوہ جھاڑ جھنکار کا ایک جنگل تھا جو باغ کی چار دیواری میں اُگا ہوا تھا بلکہ اکثر جگہوں پر تو چو حدی کی دیواریں بھی جنگلی جھاڑیوں اور بیلوں سے پٹی پڑی تھیں۔

میں نے کہا۔ ”اس باغ میں دیکھنے کے لیے رکھا کیا ہے؟“

ریکھا ایک آہ بھر کے بولی۔ ”کبھی یہ باغ بہت اچھی حالت میں تھا جب میرے پتا جی زندہ تھے۔ میں اور باغ میں جھولا ڈال کر جھولا کرتی تھی اور باغ کے قریب ایک باؤلی تھی جس کا پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔“

باغ کو جلدی جلدی سے پار کر کے ہم اس باؤلی کو دیکھنے گئے جو باغ کے باہر دو اونچی چٹانوں کے بیچ واقع تھی مگر اب یہ باؤلی سوکھی پڑی تھی۔ اس میں ایک قطرہ پانی کا موجود نہ تھا۔

ریکھا نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس باؤلی سے سارے باغ کو پانی جاتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اب بھی ندی کے پانی سے یہ باغ سینچا جا سکتا ہے مگر تم نے باغ کی حالت کیا کر رکھی ہے۔“

”کون دیکھے؟ میں سال میں ایک مرتبہ میکے آتی ہوں۔ اماں اکیلی کیا کر سکتی ہیں۔ کہاں تک حکم چلا سکتی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”تم مجھے اپنا لٹا پٹا باغ دکھانے کیوں لائی ہو؟“

وہ بولی۔ ”دراصل باغ دکھانے نہیں لائی تھی۔ آؤ ان چٹانوں پر چڑھ کر دیکھیں۔ یہاں سے اِدھر کا منظر بہت بھلا دکھائی دیتا ہے۔“ ریکھا نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں اس اونچی چٹان پر چڑھتے گئے۔ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کے اسے گرنے سے بچا لیا۔

چٹان کے اوپر جا کر ہم دونوں کھڑے ہو گئے اور مغرب کی طرف دیکھنے لگے۔ یہاں آ کر یکایک سطح مرتفع کا علاقہ عمودی ڈھلانوں میں نیچے گرنے لگتا تھا۔

ڈھلوانوں کے بعد دور دور نگاہ تک میدانی علاقے پھیلے ہوئے تھے۔ میلوں تک ریتلے علاقے یا جنگلی علاقے۔ کہیں کہیں چھوٹے چھپروں والے گاؤں حدِ نگاہ پر شپرا کا قصبہ دکھائی دے رہا تھا۔ جنوب میں کواڑی کا قلعہ تھا۔ جس کی نچلی چٹانوں سے ندی اتر کر میدانوں میں چلی جاتی تھی میں واقعی غلط راستے سے آیا تھا۔ اگر کواڑی قلعے سے جنوب کے بجائے مغرب سے آتا۔ سیدھے شپرا سے ایک راستہ اس پہاڑی علاقے کو آتا دکھائی دیتا تھا تو جلدی پہنچ سکتا تھا۔

سورج بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ وادی پر بادل گھر کر آنے لگے تھے اور ہوا میں خنکی آ چکی تھی۔

ریکھا نے ہوا کو سونگھ کر کہا۔ ''چلو جلدی واپس چلیں...... بارش آنے والی ہے۔''

ہم نے گھوڑے سرپٹ دوڑائے مگر شکار گاہ تک پہنچنے سے پہلے پہلے بارش نے ہمیں آلیا۔ ایک دم طوفان اور بارش سے سارا منظر ہی بدل گیا۔ ہواؤں کے طوفانی فراٹوں سے سارا جنگل ہل رہا تھا بجلی اور گرج۔ لگتا تھا کہ جنگل میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ آخر شکار گھر تک پہنچتے پہنچتے ہم دونوں پانی میں شرابور ہو گئے۔ گھوڑوں کے صحت مند جسم پانی میں یوں چمک رہے تھے جیسے کسی نے اُن کے جسم پر تیل سے مالش کی ہو اور ریکھا کے سارے کپڑے اس کے جسم سے چپک گئے تھے۔ اس کی بھیگی ہوئی خوبصورتیوں کے خطوط میری آنکھوں میں دھنک کی طرح روشن ہوتے جا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی نگاہیں اس کے جسم سے اُٹھالیں حسین لڑکیوں کو موسلا دھار بارش میں گھوڑے پر سفر نہیں کرنا چاہیے صاحب ورنہ ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے اور ریکھا نے بڑی مشکل سے آتش دان میں آگ جلائی اور اس آگ کی حدت سے باری باری میں نے اور ریکھا نے اپنے کپڑے سکھائے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ جب وہ کپڑے سکھا رہی تھی، میں شکار گاہ کے برآمدے میں کھڑا اُس کے جسم کا تصور کرتے ہوئے سلگتا رہا۔ دور باغ میں مور بول رہے تھے۔ ڈھاک کے چکنے پتوں سے پانی بہہ رہا تھا اور ترسی ہوئی زمین سے عجیب سوندھی سوندھی خوشبو اُٹھ رہی تھی جیسے زمین میں سوئے جذبے جاگ رہے ہوں۔ میں سر سے پاؤں تک

کانپ گیا۔ مرد ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے خصوصاً جب کہیں قریب میں کوئی حسین عورت اکیلی مل جائے۔ مرد ہاتھ بڑھا کر تہذیب کا سہارا لینا چاہتا ہے۔ تہذیب کی بیل ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتی ہے۔ میں نے دانت پیس کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ دوسرے لمحے میں جب آنکھیں کھلیں تو ریکھا کو اپنے سامنے برآمدے میں کھڑا پایا۔

کہنے لگی۔ ''جاؤ اپنے کپڑے سکھا لو۔ میں یہاں کھڑی ہوں۔ جانے کرپا رام اب تک کھانا لے کر کیوں نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔ ''اس موسلا دھار بارش اور طوفان میں کون یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔''

پھر میں نے اُس کے قریب سے گزرا۔ ریکھا نے بدن چرا لیا۔ میں اندر کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد میں نے دروازہ کھولا۔

ریکھا اندر آئی۔

اس کے پیچھے پیچھے کرپا رام رسوئیاں اندر آیا۔ اپنے بھیگے کپڑوں سے پانی ٹپکاتے ہوئے اندر آ کر اس نے ناشتے دان میز پر رکھ دیا۔

میں نے ناشتے دان کو ہاتھ لگا کر ہٹا لیا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ''ناشتے دان ابھی تک گرم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس شکار گھر میں میں نے رسوئی تو نہیں دیکھی۔''

''وہ ادھر، شکار گھر سے باہر گھرے ہوئے درختوں کے بیچ میں رسوئی گھر ہے اور تین اور کمرے بھی ہیں نوکروں کے لیے۔ بارش تھمے تو دکھا دوں گی۔''

''دیکھ کر کیا کروں گا؟''

''نہیں۔'' ریکھا بولی۔ ''جب تم یہ جگہ خریدنے والے ہو سب کچھ دیکھ لو۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو بھوک لگی ہے۔ پھر دیکھا جائے گا۔''

ریکھا نے کرپا رام سے کہا جو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ ''جاؤ تم رسوئی گھر میں جا کر کپڑے سکھا لو۔''

جب کرپا رام جانے لگا تو ریکھا نے پوچھا۔ ''چائے کا سامان لائے ہو؟''

"جی لایا ہوں۔"

"سہ پہر کے بعد چائے لے آنا۔"

کرپارام کے جانے کے بعد میں نے جلدی سے ناشتے دان کھولا۔ گرم گرم پراٹھے۔ آم کا اچار، بھنا ہوا مرغ، آلو مٹر کباب اور پرول کی بھجیا۔

میں نے تنک کر پوچھا۔ "یہ پرول کون کھاتا ہے؟"

ریکھا ہنس کر بولی۔ "میں کھاتی ہوں۔ مجھے بہت پسند ہیں۔

"کھانا کھاؤ۔ آلو مٹر اور پرول کی بھجیا۔" میں نے مرغ کی ایک ٹانگ پراٹھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اب ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آتش دان کے قریب آرام کرسیاں کھسکا کے آگ تاپ رہے تھے۔ سارے بدن میں مدھم مدھم غنودگی سرایت کرتی جارہی تھی۔ بارش اور تیز ہوگئی تھی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا تھا۔ کھلی کھڑکی سے جنگل کی تاریکی اندر گھس آئی تھی اور آتشدان کی روشنی پر غلبہ پانے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے ریکھا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اب ہم کیا کریں گے؟"

ریکھا بڑی معصومیت سے بولی۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر لیٹتی ہوں۔ تم بھی چند گھڑیاں آرام کرلو...... سہ پہر میں چائے پی کر......" یکا یک وہ رک گئی۔ ایک زور کا کھٹکا ہوا اور آتشدان پر رکھا ہوا چینی کا گلدان کھڑکی سے آنے والی گولی کا نشانہ بن کر چکنا چور ہوگیا۔

یکا یک میں نے ریکھا کو کرسی سے گھسیٹ کر اپنے ساتھ نیچے فرش پر گرالیا۔

اتنے میں دوسری گولی چلی اور میرے شانے سے چھچھلتے ہوئے گزر گئی۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

بارش کے باوجود ایک عجیب طرح کا خوفناک سناٹا اور اندھیرا۔ ہم دونوں فرش پر اوندھے لیٹے تھے اور تیز تیز سانس لے رہے تھے۔

☆☆☆

پھر ریکھا کے بدن میں حرکت سی پیدا ہوئی شاید وہ اٹھنا چاہتی تھی مگر میرا ہاتھ اُس کی پیٹھ پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ ہاتھ ذرا سا دبا کر خاموشی سے اسے اسی طرح لیٹے رہنے کا اشارہ کر دیا۔

کڑی مصیبت میں انسانی دماغ بھی برق رفتاری سے کام کرتا ہے۔ میں نے سوچا جو کوئی بھی ہے، جس نے گولی چلائی ہے۔ وہ اس کمرے کے اندر ضرور آئے گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہم مردہ ہیں یا زندہ ہیں۔ دوسرے وہ جو کوئی بھی ہے، اسے معلوم ہے کہ ہم دونوں نہتے ہیں اور اس کے پاس بندوق ہے اس لیے اسے ہم دونوں سے خطرہ نہیں ہے۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ میں دھیرے دھیرے ریکھا کے اور قریب سرک گیا۔ بہت ہی آہستہ سے میں نے اُس کے کان کے قریب اپنے ہونٹ لے جا کر کہا۔

"جس طرح اوندھی لیٹی ہو، لیٹی رہو۔ اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرو۔ وہ جو کوئی بھی ہے، تھوڑی دیر میں اندر ضرور آئے گا مگر خبردار کوئی حرکت نہ کرنا۔ ہلنا جلنا نہیں ہم دونوں کی جان خطرے میں ہے۔"

ریکھا نے آنکھوں کے کونے سے مجھے دیکھا۔ جیسے میری بات سمجھ چکی ہو۔ میں دھیرے دھیرے اس سے جدا ہو کر فرش پر کھسکنے لگا۔ میں نے آنکھوں کے کونوں سے دیکھا کہ دونوں کھڑکیاں کھلی ہیں۔ دروازہ اندر سے بھڑا ہوا ہے اور دروازے کے دائیں طرف ایک بڑا کپ بورڈ ہے جس کی آڑ میں چھپا جا سکتا ہے۔

میں نے اندازہ لگا کر دیکھا۔ یہ کپ بورڈ مجھ سے تین گز کے فاصلے پر تھا۔ میں بہت ہی دھیرے دھیرے بے آواز طریقے سے اس کپ بورڈ کی طرف کھسکنے لگا۔ ایک بار ریکھا نے پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے پھر حرکت کرنے سے منع کر دیا۔ دھیرے دھیرے انتہائی احتیاط سے میں اس کپ بورڈ کی طرف کھسکتا چلا گیا۔ لیٹے ہی لیٹے ان تین گزوں کا فاصلہ میں نے شاید تین صدیوں میں طے کیا ہوگا۔ حالانکہ میں بہت جلدی میں تھا صرف اس کپ بورڈ کی آڑ میں آ جانے سے ایک چانس تھا کہ ہم دونوں کی جان بچ جائے۔

بالآخر میں کوئی آواز پیدا کئے اور زیادہ حرکت نہ کئے بغیر اس کپ بورڈ کی آڑ میں

چلا گیا۔ چند ثانیے دم سادھے چپکے لیٹا رہا، پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تیندوے کی طرح گھات لگائے ہوئے۔ میرے ایک طرف کپ بورڈ تھا۔ دوسری طرف آرام کرنے کے لیے ایک تخت، بیچ میں تھوڑی سی جگہ میں ایک کسے ہوئے اسپرنگ کی طرح میں دبکا پڑا تھا۔ سانس تقریباً رو کے ہوئے۔

بارش دھیمی ہو چلی تھی۔ طوفان مدھم پڑتا جاتا تھا۔ بارش کے تواتر اور ہوا کی سائیں سائیں کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی۔ ریکھا آتش دان کے پاس چپکے لیٹی ہوئی تھی۔ بالکل اوندھی بے جان مردہ سی۔

یکا یک میرے کانوں میں باہر لکڑی کے برآمدے پر لکڑی کے کسی تختے کی چر چرانے کی آواز آئی۔ آواز بالکل مدھم اور موہوم سی تھی لیکن میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔

پھر دھیرے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اور کوئی بے آواز قدموں سے اندر آیا۔

اس کے اندر آنے سے پہلے بندوق کی نال اندر آئی۔ پھر دو ہاتھ اس بندوق کو پکڑے ہوئے نظر آئے، پھر اس آدمی کا جسم اندر آیا۔ جھک کر چلتا ہوا۔ غور سے ریکھا کے جسم کو تکتا ہوا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔

بس یہی ایک چانس تھا۔

میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت مجتمع کر کے ایک جست لگائی۔ شاید آنے والے کو بھی خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ میری طرف مڑنے ہی والا تھا کہ میرے بدن کا سارا بوجھ اپنے پوری طاقت کے ساتھ اُس کے اوپر پڑا اور میرے ہاتھ کے جھٹکے نے اُس کی بندوق اُس کے ہاتھوں سے گرا دی۔ وہ خود بھی میرے نیچے گر گیا اور بندوق دور ریکھا کے قریب جا پڑی۔ میں نے چلا کر ریکھا سے کہا۔

"بندوق سنبھالو۔"

مگر ریکھا کے اعصاب جیسے خوف اور خطرے سے شل ہو چکے تھے۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، پھر دیوار سے لگ کر خوف زدہ نگاہوں سے ہم دونوں کو تکنے لگی۔

گرے ہوئے آدمی نے اُٹھنے کی کوشش کی...... وہ بے حد تگڑا آدمی تھا۔ ناٹا اور گٹھا

ہوااور میری ہزار کوشش کے باوجود میری گرفت سے آزاد ہو کر مجھ سے بھڑ گیا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور اسی لمحے میں نے دیکھا کہ وہ راوت تھا، اور اُس کے جسم سے بھانگ لی بو آرہی تھی۔ شاید یہ بھانگ نہ تھی۔ اس کے جسم کی خاص بو تھی اور راوت سے لڑتے لڑتے میرے ذہن میں رات مجھ پر حملہ کرنے والے آدمی کا خیال آیا۔ اُس کے جسم سے بھی اس طرح بھانگ کی بو آئی تھی۔ اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ رات کو مجھ پر حملہ کرنے والا راوت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

لڑتے لڑتے اُس کا ہاتھ پھر بندوق کی طرف جانے لگا۔ عنقریب وہ بندوق کو پھر سے پکڑ لینے والا تھا کہ فوراً ریکھا نے آگے بڑھ کر بندوق اُٹھالی اور اسے ایک اضطراری حرکت کے تحت کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور عین اسی وقت میں نے کراٹے کا ایک ہاتھ اس کے شانے پر زور کا دیا کہ راوت درد سے بلبلا اُٹھا مگر مجھ پر جیسے بھوت سوار ہو چکا تھا اور میرے اندر جیسے سو آدمیوں کی قوت آ گئی تھی۔ بندوق ہٹتے ہی میں اُس پر پل پڑا اور لاتوں، گھونسوں، مکوں کی بارش سے اسے بے حال کر دیا۔ پھر جوڈو کی پٹخیاں اور کراٹے کے دوسرے زوردار ہاتھ نے اُس کے دوسرے بازو کی ہڈی بھی توڑ دی۔

اب وہ بے دم ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر فرش پر لیٹا تھا بے سدھ بالکل بے سدھ......

میں نے ہانپتے ہوئے ریکھا سے کہا۔ ''ہوش میں آنے سے پہلے اسے باندھ دینا چاہیے۔ کہیں پر کوئی رسی ملے گی؟''

ریکھا جیسے پھر حرکت میں آ گئی۔ وہ دوڑی دوڑی دوسرے کمرے میں گئی اور بستر کی چادریں اُٹھا لائی۔ میں نے چادریں پھاڑ کر اُن سے راوت کو اچھی طرح باندھ کر فرش پر دھر دیا۔ پھر اُسے بھاری تخت کے ایک پائے سے اچھی طرح باندھ دیا۔ جب جا کے جان میں جان آئی۔

میں تخت کے قریب کھڑا ہو کر بندھے ہوئے راوت کو دیکھ رہا تھا کہ ایک دم ریکھا بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے سے لپٹ کر رونے لگی۔

میں آہستہ سے اُسے تسلی دینے لگا۔ ''رو مت ریکھا اب سب ٹھیک ہے اب سب ٹھیک ہے۔''

پھر اپنے رومال سے اپنے ہونٹوں کا بہتا ہوا خون پونچھنے لگا۔ میں قطعاً کوئی بہادر آدمی نہیں ہوں اور اب جب کہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا اور خطرہ ٹل چکا تھا، میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آ گئی۔ میں تو ایک امن پسند ڈرپوک قسم کا آدمی ہوں اور لڑائی جھگڑے سے بہت دور رہتا ہوں۔ اس لیے کلکتے سے بھاگ کر یہاں آیا تھا اور کمبخت راوت نے مجھے گھونسے مکے مار مار کر میری ہڈی پسلی ایک کر دی تھی۔ وہ تو میری قسمت تھی کہ مجھے جوڈو اور کراٹے دونوں فن آتے ہیں ورنہ میرا کیا حشر ہوتا اور ریکھا کیا حال ہوتا۔

ریکھا میرے سینے سے لگی دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔ مجھے وہ لمحہ وصال بھرا لمحہ سا محسوس ہوا۔ ملن کے لمحے میں تو عورت اسی طرح دھیرے دھیرے سسکتی ہے مگر جلد ہی یہ میٹھا لمحہ وقت کے دھارے پر بہتے ہوئے حباب کی طرح ٹوٹ گیا۔ باہر برآمدے سے کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے بازوؤں کی گرفت ریکھا کے بدن کے گرد مضبوط ہوتی گئی۔ میں اسے اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ دوسرے لمحے میں اسے میں نے اپنے سے الگ کر کے اپنے پیچھے چھپا لیا۔

"یہ کون آ رہا تھا؟"

میں مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

چوکھٹ پر برتنوں کا کھنکا سا ہوا۔ میرے جسم کا تناؤ ڈھل سا گیا۔ یہ کرپا رام تھا۔ چائے لے کر اندر آ رہا تھا۔

میں نے ریکھا کی طرف دیکھا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ پھر میں بھی ہنسنے لگا۔ سارا ماحول ہی بدل گیا۔

مگر کرپا رام کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ راوت کو یوں بے ہوش اور بندھے ہوئے دیکھ کر چکرا سا گیا۔ پہلے تو اس کی ہمت نہ پڑی کہ مجھ سے کچھ پوچھے پھر جب وہ چائے میز پر رکھ چکا تو ہمیں اطمینان سے چائے پیتے دیکھ کر اور بھی چکرا گیا۔ گردن کے خم سے راوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ...... یہ...... راوت ہے نا؟"

''ہاں ہے تو وہی۔' ریکھا نے اُس سے کہا۔

کرپارام نے ہچکچا کر کہا۔ ''اسے کس نے باندھا ہے؟''

''ہم نے۔'' ریکھا بولی۔

کرپارام وجہ پوچھنا چاہتا تھا مگر سوال اس کے لبوں پر آ کر رک گیا۔ ریکھا کا سنجیدہ اور باوقار چہرہ دیکھ کر رک گیا۔ پھر اُس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر نمودار ہوئی۔ بولا۔

''اچھا کیا......؟'' سالا ہم سب پر رعب جماتا تھا۔'' ہم دنوں ہنسنے لگے۔

جب کرپارام برتن اُٹھا کر جانے لگا۔ میں نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا۔

''ابھی یہیں ٹھہرو۔ میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔''

ریکھا سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اُس کی طرف دھیان نہ دے کر کرپارام سے کہا۔ ''دیکھو۔ اگر راوت ذرا ہلے جلے تو یہ کرسی اس کے سر پر مار دینا۔ ذرا بھی تکلف نہ کرنا سمجھ گئے۔''

''ہاں صاحب سمجھ گیا۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی کہنے لگا۔

میں نے ریکھا سے کہا۔ ''میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔''

بوندا باندی بہت کم ہو چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کے باہر کود گیا۔ تھوڑی دیر تک بندوق تلاش کرتا رہا جسے ریکھا نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا تھا۔ اچانک ایک جھاڑی کے نیچے مجھے وہ بندوق گری ہوئی مل گئی۔ اُسے اُٹھا کر میں کمرے کے اندر لے آیا اور اندر آ کر میں نے کرپارام سے کہا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔''

کرپارام جانے لگا تو ریکھا نے اس سے کہا۔

''مگر سامان باندھ لو۔ تھوڑی دیر میں واپس چلیں گے۔ لگتا ہے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بارش تھم جائے گی۔'' ریکھا بولی۔ ''بارش تھمتے ہی چلیں گے۔''

کرپارام سر جھکا کے اور برتن اُٹھا کے چلا گیا۔

جب کرپارام چلا گیا تو ریکھا نے راوت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''اس کا کیا کریں گے؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا اسے ہوش میں لے آؤں۔''

اتنا کہہ کر میں نے بندوق کے کندھے سے راوت کو ٹھوکا۔ دو تین ٹھوکوں کے بعد اُس کا بدن کسمسایا۔ دھیرے دھیرے ہوش میں آتا گیا۔ پھر جب وہ مکمل ہوش میں آ گیا تو کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ دو چار بار اُس نے پٹیاں تڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے اُس سے کہا۔ ''مضبوطی سے بندھے ہو۔''

وہ چپ رہا۔ غصے بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

''کل رات کو بھی تم نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ کیوں؟''

وہ بڑی نفرت اور شدت سے بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ ہماری زمین کسی اجنبی کے پاس جائے۔''

''تمہاری زمین یہ کہاں سے ہوگئی؟ زمین تو مالکن کی ہے۔''

وہ چپ رہا۔ میں نے دو تین بار اُسے ٹھوکریں ماریں اور پوچھا۔

''بتاؤ۔ کیا ٹھاکر جی کا خون بھی تم نے کیا تھا؟''

اُس نے زور سے سر ہلا دیا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وحشت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں بندوق کی نال اُس کے سینے پر رکھ دی اور بڑے کڑے لہجے میں کہا۔

''سچ سچ بتاؤ۔ نہیں تو یہ گولی تمہارے سینے کے پار ہوگی۔''

وہ میری طرف گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ جو میں کہتا ہوں وہی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہوں تو اس کی نگاہیں بدل گئیں۔ پلکیں نیچے گر گئیں۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''ہاں۔''

''کیوں؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ''میں تم سے کہتا ہوں کہ تم نے نہ صرف بڑے ٹھاکر جی کا خون کیا ہے بلکہ اُن کے چھوٹے بھائی کا بھی۔''

''نہیں۔نہیں۔'' وہ زور سے چلایا۔

''ہاں۔ہاں'' تم ہی ان دونوں کے قاتل ہو۔''

''نہیں۔نہیں۔'' اس کی آنکھوں کی پتلیاں اب تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

میں نے کیچ کھول کر بندوق دیکھی۔اس میں اب کوئی گولی نہ تھی۔ میں نے بندوق کو اُلٹا کر لیا اور اس کے کندھے سے راوت کو تین چار بار پیٹا۔زور زور سے وہ بلبلا کر کہنے لگا۔'' مجھے مت مارو، مجھے مت مارو۔میں سب بتاتا ہوں۔''

میں رک گیا غصے کے عالم میں بولا۔''اگر نہیں بتاؤ گے تو اسی بندوق کے کندے سے تمہاری کھوپڑی توڑ ڈالوں گا۔''

راوت کی نگاہیں ریکھا کی طرف گئیں، جس کی نگاہوں میں اب خون اُبل رہا تھا۔ پھر لوٹ کر میری طرف آئیں۔وہاں بھی اسے مایوسی ملی۔

رکتے رکتے لہجے میں بولا۔''ہاں چھوٹے ٹھاکر کا خون میں نے ہی کیا تھا۔''

پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ اب اُس کی کھوپڑی توڑ دی جائے گی......لگتا تھا جیسے اُس کے تن بدن سے جان نکل گئی۔

''مگر کیوں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔''کیوں تم نے ان لوگوں کا خون کیا؟''

مگر وہ چپ لیٹا رہا۔میں نے اسے بہت مارا پیٹا مگر وہ ایک لفظ نہیں بولا۔آخر میں صرف اتنا کہا۔''جان سے بھی مار دو گے تو بھی نہیں بتاؤں گا۔''

مگر میں اسے مارتا رہا۔آخر ریکھا نے میرا ہاتھ روک کر کہا۔

''جانے دو۔شپارا چوکی والے اس سے سب اُگلوا لیں گے۔''

میں نے پوچھا۔''تو اسے یہیں چھوڑ دیں بندھا ہوا اور پھر کارندوں کو بلوا کر اسے لے جائیں۔''

ریکھا بولی۔''نہیں، ایسا کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔کارندے سب اس کے ہیں۔''

''تو؟''

''یہاں رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی ساتھی باہر جنگل میں ہو اور ہمارے جانے کے بعد اسے آزاد کر دے۔''

میں نے کہا۔''یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کا کوئی ساتھی ہوتا تو ہم پر اب تک حملہ کر چکا ہوتا مگر تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے گھوڑے کی پیٹھ پر بندھوا کر لے چلتے ہیں۔''

☆☆☆

اب ہمارا قافلہ واپس جا رہا تھا۔

ریکھا اپنے گھوڑے پر سوار تھی۔ اُن کے بالمقابل دوسرے گھورے پر راوت بندھا ہوا تھا جس کی باگ میں اپنے ہاتھ میں لیے چل رہا تھا۔ دونوں گھوڑوں کے پیچھے پیچھے کر پا رام باقی سامان اُٹھائے چل رہا تھا۔

ریکھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''میں نے اُس سے پوچھا۔

''تم نے مجھے رات کے حملے کا کچھ نہیں بتایا۔''

''وقت ہی کہاں ملا۔ اب بتاتا ہوں۔''یہ کہہ کر میں نے اس رات کے حملے کا سارا قصہ بیان کر دیا۔

''مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ راوت ہی تھا؟''

''اُس نے خود اقبال کیا ہے۔''

''ممکن ہے اس نے جان بچانے کی خاطر اور مار سے بچنے کے لیے ایسا کہہ دیا ہو۔''

''نہیں۔ ایک اور بھی ثبوت ہے۔''

''کیا؟''

رات کو جس نے مجھ پر حملہ کیا اور جب میں اس سے گتھم گتھا ہو گیا تو مجھے سب سے پہلے حملہ آور کے جسم سے بھانگ کی تیز تیز بو آتی تھی۔''

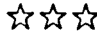
''ریکھا نے ایک دم گھوڑا روک کر کہا۔''مجھے اترنے دو۔''

وہ گھوڑے سے اتر کر دوسرے گھوڑے کے پاس گئی۔ اچک کر اُس نے راوت کا بدن سونگھا۔ دو تین بار۔ پھر یکا یک اس کا سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ صاف ہو گیا۔ یقین آمیز

لہجے میں بولی۔ ''اب مجھے یقین آگیا ہے۔ اس نے میری پتاجی کا خون کیا ہے۔''

''کیسے؟''

''گولی لگنے کے بعد جب میں دوڑی دوڑی شکار گھر کے برآمدے میں گئی تو یکایک میرے نتھنوں میں بھانگ کی تیز تیز بو آتی تھی مگر اس وقت میں نے اس کا کوئی خیال نہیں کیا۔''



رات کی جھلملاتی روشنیوں میں ہم تینوں دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ میں ریکھا اور ریکھا کی ماں سرو جا دیوی۔ سارا قصہ سن کر بھی وہ کچھ نہ بولیں۔ دو تین بار سانس زور زور سے کھینچا۔ پھر وہی خاموشی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُن کی آنکھوں کا پراسرار درد اور بڑھ گیا ہے۔ رات کی تاریکی اور گہری ہوگئی ہے اور چہرے کا حُسن اور چمک اُٹھا ہے۔ سیاہ ساڑھی کے پلو میں وہ چاند سا چہرہ...... ریکھا کے بالکل قریب کے بیٹھے ہوئے وہ ریکھا کی ماں نہیں ریکھا کی بڑی بہن معلوم ہو رہی تھیں۔

پھر خاموشی توڑتے ہوئے وہ بولیں۔ ''ریکھا تم جاؤ۔ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میں ان سے اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

ریکھا کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر چلی گئی۔

ریکھا کے جانے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولیں۔ صرف اپنی سیاہ ساڑھی کے پلو کو انگلیوں میں لے کر مسلتی رہیں۔

آخر میں نے کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس راز کی کنجی آپ کے پاس ہے؟''

''کس راز کی؟'' وہ آہستہ سے بولیں۔

''اب تک جو کچھ ہوا۔ گزشتہ سات برس میں۔ بڑے ٹھاکر جی کا قتل۔'' چھوٹے ٹھاکر کا قتل۔ راوت کا مجھ پر گولی چلانا...... ریکھا پر گولی چلانا۔ مجھے یہ سب ایک سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اور کنجی آپ کے پاس ہے۔''

پھر جیسے اُنہوں نے کچھ فیصلہ کر لیا۔ پلو چھوڑ کر مضبوطی سے بیٹھ گئیں۔ اور پُراعتماد لہجے میں بولیں۔ ''تم نے میری بچی کی جان بچائی ہے۔ اس لیے تمہیں سب کچھ جاننے کا

حق ہے۔ پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ میں سب بتادوں گی یعنی جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ سب بتادوں گی آج رات...... ممکن ہے آج کے بعد ایسی رات پھر کبھی نہ آئے۔''

میں نے اُن کا آخری فقرہ نہیں سمجھا۔ اس پر زیادہ دھیان بھی نہیں دیا۔ دوسری بہت سی گتھیاں ایسی تھیں جنہیں میرے لیے اس وقت سلجھانا ضروری تھا اس لیے میں نے شروع کیا۔

''کیا آپ کو معلوم تھا کہ بڑے ٹھاکر جی کا قتل کس نے کیا؟''

وہ بڑی شدت سے بولیں۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں اس راوت کے بچے کو زندہ چھوڑتی؟''

''تو آپ کو راوت پر کب شبہہ ہوا؟''

''آج سے پہلے شبہ نہیں ہوا۔ تم سے پہلی بار معلوم ہوا۔''

میں غور سے اُن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ''سچ کہتی ہیں آپ؟''

''ہاں۔''

اتنا تو کہا اُنہوں نے مگر مجھے ایسا لگا جیسے اس ''ہاں'' کے پس پردہ کوئی گھنڈی ہے جسے وہ اس وقت بتانے سے ہچکچا رہی ہیں۔

''اور جب چھوٹے ٹھاکر کا قتل ہوا، اسی شکارگاہ میں اس وقت بھی آپ کو کسی پر شبہ نہیں ہوا؟''

''اس وقت شبہ نہیں یقین تھا۔''

''کس پر؟''

''راوت پر۔''

''آپ کو معلوم تھا کہ راوت نے چھوٹے ٹھاکر کا خون کیا ہے؟''

''ہاں۔''

''اور یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی۔ آپ نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ راوت کو میں نے ہی مجبور کیا تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کو گولی مار دے۔''

میں چکرا گیا۔ کئی ثانئے سناٹے میں رہا۔ رات کا سانس گھٹ سا رہا تھا اور شمع دانوں کو لوئیں مدھم سی پڑنے لگی تھیں۔ میں اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ چہرہ ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ خاموش پرسکون چہرہ۔

''ایسا کیوں کیا آپ نے؟''

''کیونکہ اس وقت تک میں یہ سمجھتی تھی کہ چھوٹے ٹھاکر نے یعنی میرے دیور نے میرے پتی کا خون کیا ہے۔

''اگر آپ کو اپنے چھوٹے ٹھاکر پر شبہ تھا تو پولیس سے کہا ہوتا۔''

''کیا کہتی میرے پاس کیا ثبوت تھا۔''

''آپ نے اس وقت چھوٹے ٹھاکر کو بڑے ٹھاکر کا قاتل کیوں جانا؟ کیا جائیداد کی وجہ سے؟''

''نہیں، جائیداد کے وہ دونوں برابر کے حصے دار تھے۔ بڑے ٹھاکر جی کے مرنے کے بعد میرے حصے میں آتی اور ریکھا کے حصے میں چھوٹے ٹھاکر جی پر میں نے اس وجہ سے شبہ نہیں کیا۔''

''پھر کس وجہ سے؟''

وہ چپ رہیں، پھر ساڑھی کا پلو لے کر مسلنا شروع کر دیا۔ آخر ہار گئیں۔ تھمے ہوئے لہجے میں نیم سرگوشی میں بولیں۔

''وہ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر......''

میں چونک گیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد بولا۔ ''اور آپ بھی؟''

''نہیں، میں نہیں۔ صرف وہ...... جب تک بڑے ٹھاکر جی زندہ رہے میں انہیں سمجھاتی رہی مگر وہ نہیں مانے، مانتے ہی نہیں تھے۔ پھر بھی میں اُنہیں سمجھاتی رہی اور ٹھاکر جی سے کچھ نہیں کہا۔ اگر کہتی تو اپنے دیور کی جان جاتی اس خوف سے چپ رہی اور اس لیے سے بھی کہ نادان ہے۔ دھیرے دھیرے سمجھ جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ اگر چھوٹے ٹھاکر آپ سے پیار کرتے تو آپ اُن سے دور...

رہتیں۔اُنہیں جان سے کیوں مروادیا؟"

"کہہ چکی ہوں مجھے شبہ تھا کہ میرے دیور نے میری محبت میں پاگل ہوکر میرے پتی کو جان سے مار دیا ہے مگر اس بات کا بھی مجھے بس شبہ تھا لیکن یہ شبہ یقین میں بدل گیا...... جب......جب......"

وہ یکا یک چپ ہوگئیں۔

"جب کیا؟"

جب میرے دیور نے میرے پتی کے مرنے کے بعد، کوئی ان کی موت کے چھ ساتھ مہینے کے بعد مجھ پر ہاتھ اُٹھایا۔"

"ہاتھ اُٹھایا۔یعنی مارا؟"

"نہیں، میری آبروریزی کی۔ایک رات ایک طوفانی رات کو میرے کمرے میں گھس کر میری عزت لوٹ لی۔میں چیختی چلاتی رہ گئی مگر طوفان کی گرج میں کسی کو کچھ پتا نہ چلا۔کوئی میری مدد کو نہ آیا،اور میں لٹ گئی۔"

ضبط کرنے کے باوجود دو آنسو اُن کی آنکھوں سے ابل پڑے۔ایک گہری سانس لے کر بولیں۔"اس رات میں نے فیصلہ کیا کہ چھوٹے ٹھاکر کو قتل کر دیا جائے گا۔یا وہ زندہ رہے گا یا میں اپنی جان دے دوں گی مگر میرے سامنے میری بچی ریکھا تھی۔میں اس کے لیے زندہ رہنا چاہتی۔اس لیے اس لیے......" وہ چپ ہوگئیں۔

"اس لیے چھوٹے ٹھاکر جان سے گئے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور پھر پوچھا۔کیا اب آپ اس قتل پر پشیمان ہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔" وہ بڑی شدت سے بولیں۔"میں یہی کرتی جو میں نے کیا۔ اب بھی۔آج بھی یہی کچھ ہوتا جو اس دن ہوا۔"

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر دیوان خانے میں ٹہلنے لگا۔گتھی سلجھ رہی تھی۔دھیرے دھیرے روشنی آرہی تھی۔میں نے مڑ کر پوچھا۔

"چھوٹے ٹھاکر کی موت کے بعد کیا ہوا؟"

"دھیرے دھیرے کارندوں نے کھسکنا شروع کیا۔جب پولیس قتل کا سراغ

نہیں لگا سکی۔ دونوں قتل پراسرار رہے تو کارندوں میں کسی نے خبر پھیلا دی کہ اس وادی میں آسیب کا سایہ ہے۔ کسی بھوت نے دونوں ٹھاکروں کی جان لے لی ہے۔ دھیرے دھیرے کارندے کام چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آخر میں یہی سات آٹھ کارندے رہ گئے جو راوت کی تحویل میں ہیں۔ تین چوتھائی کے قریب زمین غیر آباد ہوگئی۔ تم خود آج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو اور یہ سات آٹھ کارندے رہ گئے جو راوت کی تحویل میں ہیں۔ تین چوتھائی کے قریب زمین غیر آباد ہوگئی۔ تم خود آج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو اور یہ سات آٹھ کارندے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی راوت کی وجہ سے۔ راوت شروع سے آج تک بڑی دلجمعی سے کام کرتا رہا ہے۔ وہ ہمارا سب سے پرانا ملازم ہے۔"

"آپ کو اس پر بہت بھروسہ ہے؟"

"تھا میں ہی نہیں بڑے ٹھاکر جی بھی اس پر مکمل بھروسہ کرتے تھے، اس لیے آج سے پہلے کسی کو اس پر شک نہ ہوسکا۔"

"آپ کے ساتھ اُس کا سلوک کیسا رہا؟"

"یہ کہہ کر میں سروجا دیوی کے بالکل قریب آگیا اور سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

وہ پھر اپنے پلو کی رسی بٹنے لگیں۔

میں نے کہا۔ "سچ سچ بولنا ہوگا۔ آج امتحان کا وقت ہے۔ دیواروں پر سامنے کی ٹھاکروں کی تصویریں تم سے زندگی اور موت کا حساب مانگتی ہیں۔

وہ بولیں۔ "دیور جی کی موت کے بعد کوئی آٹھ دس ماہ تک تو بڑے سکون سے کٹے۔ پھر جب کارندوں نے بھاگنا شروع کیا تو دھیرے دھیرے راوت نے پر پرزے لگانے شروع کیے۔ دھیرے دھیرے زمینوں کا سارا اختیار اس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ میں اکیلی تھی اور سب دوسرے کارندے اس کے اپنے تھے اور میری لڑکی بیاہی جا چکی تھی۔ اب بھی وہ میری عزت کرتا تھا مگر بس خالی خولی عزت ہی، ورنہ وہ کرتا وہی تھا جو اس کا جی چاہتا تھا۔ جب چاہتا تھا میرا حکم ٹال جاتا۔ اپنی من مانی کرنے لگتا۔ دھیرے دھیرے وہ یہ ظاہر کرنے لگا جیسے اصل میں زمینوں کے متعلق فیصلہ کرنے والا وہی ہے۔ میں تو خالی نام کی ہی

مالکن ہوں۔ اس لیے جب اس نے یہ سنا ہوگا کہ تم یہ زمین خریدنے والے ہو تو اُس نے تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔''

''صرف مجھے ہی نہیں، ریکھا پر بھی اُس نے گولی چلائی۔ کیوں؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''آپ جانتی ہیں۔''

''میں نہیں جانتی۔''

''سنو۔'' میں نے اُن سے کہا۔ ''یہ قصہ آج سے نہیں شروع ہوتا ہے۔ آج سے بہت پہلے سے ہوتا ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ بڑے ٹھاکر جی کو اس نے کیوں قتل کیا۔ کیا ایسا تو نہیں ہے اس کا پلان شروع ہی سے بڑے ٹھاکر اور چھوٹے ٹھاکر کو قتل کر دینے کا تھا تا کہ زمینوں پر اس کا اختیار مکمل ہو جائے۔''

''مگر یہ زمینیں اس کی کیسے ہو سکتی تھیں؟ بڑے ٹھاکر کے بعد چھوٹے ٹھاکر اور میں اُن کے وارث ہوتے ہیں۔ میرے بعد میری بیٹی اُن کی وارث ہوگی۔ میری بیٹی کے بعد میری بیٹی کا شوہر اُن کا وارث ہوتا۔ اس کے بعد میری بیٹی کا منا۔ کیا وہ یہ سب نہیں جانتا تھا؟'' وہ چیخ کر بولیں۔

''معاملہ اس سے بھی ٹیڑھا ہے۔'' میں نے اُن سے کہا۔ ''وہ یہ سب کچھ جانتا تھا، پھر بھی اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ اس لیے نہیں کہ وہ ان زمینوں کا قانونی مالک بننا چاہتا تھا، مالک چاہے کوئی رہے اور یہ بڑے ٹھاکر کی موجودگی میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اُس نے بڑے ٹھاکر جی کو قتل کر دیا۔ پھر جب آپ نے چھوٹے ٹھاکر جی کے قتل کا معاملہ اُس کے سامنے رکھا تو چونکہ یہ قتل اُس کا راستہ صاف کرتا تھا اس لیے اُنہیں بھی قتل کر دیا۔ لڑکی کی شادی ہوگئی۔ آپ نہتی بے یار و مددگار رہ گئیں...... جو وہ چاہتا تھا وہ پورا ہو گیا۔ یعنی اگر میں نہ آ جاتا...... کیوں؟''

وہ بولی۔ ''اب تو یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے، جو تم کہتے ہو۔''

''نہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے سروجا دیوی کو ڈپٹ کر کہا۔ ''میرا اندازہ کچھ اور ہے۔''

''تمہارا اندازہ کیا ہے؟'' اُنہوں نے مجھ سے بڑی کمزور آواز میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے وہ آپ سے محبت کرتا ہے۔''

وہ کچھ نہیں بولیں۔ پہلے پلو ملتی رہیں۔ پھر دھیرے دھیرے سسکنے لگیں۔ پھر وہ دیوان پر گر گئیں۔ اُنہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور اُن کا سارا بدن سسکیوں سے ہل رہا تھا۔

میں نے اُن سے کچھ نہیں کہا۔ میں دیر تک دیوان خانے میں ٹہلتا رہا۔ پھر باہر نکل کر صحن میں ٹہلتا رہا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ سروجا نے کچھ کہا نہیں تھا۔ لیکن اُس کی سسکیاں اُس کے دل کی غماز تھیں۔

کوئی آدھے گھنٹے تک ٹہلنے کے بعد جب میں نے سوچا اُن کے آنسو سوکھ گئے ہوں گے تو میں دیوان خانے کے اندر گیا۔ وہ ایک دیوان پر خاموش بیٹھی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے اور اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔

جب میں اندر آیا تو وہ میری طرف شرمسار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''تمہارا اندازہ صحیح ہے لیکن میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے آج تک اُسے اپنے بدن کو چھونے نہیں دیا۔ وہ بڑا ہوشیار اور چالاک نکلا۔ جب تک ریکھا کی شادی نہیں ہوگئی اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن لڑکی کی شادی کے بعد دھیرے دھیرے اُس نے اپنے دل کے جذبات کو مجھ پر ظاہر کرنا شروع کیا۔ میں نے چاہا۔ میں پہلے دن ہی اُسے نکال دوں لیکن اگر اُسے نکال دیتی تو یہ زمین کون دیکھتا۔ سارے کارندوں پر اُس کا حکم چلتا تھا اور وہ اُسی کی بات مانتے تھے۔ میں اگر اُسے نکال دیتی تو میں اُس جنگل میں اکیلی رہ جاتی اس لیے میں اُسے طرح دیتی گئی اور وہ برداشت کرتا گیا۔ جو کوئی زمین خریدنے آتا وہ اُسے کسی نہ کسی بہانے چلتا کر دیتا تھا۔ یہ میں آج جان گئی ہوں لیکن اُس سے پہلے نہیں۔ ہاں اب میں اندازہ کر سکتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتا ہے۔ اُس نے میری خاطر بڑے ٹھاکر کا خون کیا۔ پھر چھوٹے ٹھاکر کا۔ اُس کے لئے اگر میں نہ کہتی جب بھی وہ اُسے مار ڈالتا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ یہاں میں رہوں اور وہ رہے۔ اوپر سے میں مالک رہوں گی، اندر سے وہ ہم دونوں کا مالک رہے گا۔ زمینوں کا بھی اور میرا بھی۔''

''کیا یہ آپ کے لیے نا قابلِ قبول ہوتا؟''

''شروع میں تو میں اُس سے انتہائی نفرت کرتی تھی، میں اس پر لعن طعن کرتی، اُسے گالیاں دیتی، اُسے شرم دلاتی مگر اُس پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت مضبوط ارادے کا مالک ہے۔ اُس نے مجھے آج تک کبھی ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ وہ لگا سکتا تھا مگر وہ اس لمحے کے انتظار میں تھا جب وہ لمحہ ایک پکے ہوئے پھل کی طرح اُس کی جھولی میں گر جائے۔ اُس نے انتظار کیا اور انتظار کرتا رہا اور دھیرے دھیرے میں اُس کی قوت، ہمت اور برداشت کی حس کی قائل ہوگئی۔ اگر تم نہ آتے۔ اگر مجھے اپنے ٹھاکر جی کے قاتل کا پتا نہ چلتا تو یہ ہوسکتا تھا کہ میں ایک دن اُس کی گود میں گر جاتی۔ میں تم سے جھوٹ نہ بولوں گی۔ دل کی کوئی بات آج تم سے چھپا کر نہ رکھوں گی۔ یہ سچ ہے کہ پچھلے چند ماہ مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔''

''اور اب؟ اب کیا کرنا ہوگا۔ سرو جا جی۔ پولیس میں تو جا نہیں سکتے۔'' وہ آہستہ سے بولیں۔ ''اب یہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہیں جائے گا۔ اب یہ معاملہ صرف میرے اور اُس کے درمیان ہے۔''

''اور آپ کیا کریں گی؟''

یکا یک اُس نے اپنی کمر میں اڑسا ہوا خنجر نکال لیا۔ بولی ''اب اس خنجر سے میں اُس کا خاتمہ کردوں گی۔ اُس نے میرا سہاگ لیا ہے۔ میں اُس کی جان لے لوں گی مگر تمہیں اس سے پہلے میری لڑکی کو یہاں سے لے جانا ہوگا۔ وہ یوں بھی دو دن کے بعد اپنے سسرال جا رہی تھی مگر اب میں اسے کسی کارندے کو نہیں سونپ سکتی۔ تم اسے شپارا تک حفاظت سے لے جاؤ گے۔ آگے وہ خود چلی جائے گی۔ کل صبح ہی تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی پر یا تم پر کسی طرح کی آنچ آئے۔ کوئی پوچھ پاچھ ہو جب میری بیٹی اپنے سسرال پہنچ جائے گی، میں اس موذی کو ہلاک کردوں گی۔''

''سوچ لیجئے۔ پولیس۔''

''اس کو پولیس میں دینے سے پہلے مجھے خود کو پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔ وہ میں کرسکتی ہوں۔

مجھے اب اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں ہے لیکن اس سے ٹھاکر جی کے خاندان کی جو ہیٹی ہوگی۔ میری بیٹی کی جو بے عزتی ہوگی۔ اس کے بعد اس کا شوہر اسے اپنے گھر میں بھی نہیں رکھے گا۔ نہیں۔ نہیں یہ معاملہ پولیس کا نہیں ہے۔ معاملہ اب صرف میرے اور اس کے درمیان ہے مگر تم میری بیٹی کو یہاں سے فوراً لے جاؤ گے۔ کل ہی لے جاؤ۔ میں تمہیں قسم دیتی ہوں ورنہ جانے میں کیا کر بیٹھوں۔''

''نہیں۔ نہیں قسم کھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اس سے بڑی نرمی اور بڑے رنج سے کہا کیونکہ اب اس کی دلیل میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ ''میں تمہاری بیٹی کو کل ہی یہاں سے لے جاؤں گا اور اگر وہ چاہے گی تو اُس کے سسرال تک چھوڑ کے آؤں گا مگر پھر ان زمینوں کا حال کیا ہوگا؟ میں تو انہیں خریدنے آیا تھا۔''

''نہیں، نہیں یہ زمین اب تم کو نہ دوں گی۔ ان زمینوں پر اب میرا کوئی حق نہیں ہے۔ شاید اب کسی کا بھی ان زمینوں پر حق نہیں ہے اور تم اب لہو اور نحوست میں نہائی ہوئی اس زمین کو لے کر کیا کرو گے۔ یہاں کوئی رہ کر خوش نہ رہ سکے گا جس سکون کی تلاش میں تم یہاں آئے تھے وہ تمہیں یہاں کبھی نہ مل سکے گا۔ اب یہ زمین ہمیشہ کے لیے بنجر اور بے مالک ہی رہ جائے تو اچھا ہے۔'' اس کی اس دلیل میں بھی وزن تھا۔ میں سر جھکائے اس کے دیوان خانے سے باہر نکل گیا۔



دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے تیسرے پہر کی نیم تاریکی میں ہم دونوں اس گھر سے رخصت ہو گئے۔ سروجا دیوی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو ہمارے چلے جانے کا پتا چلے اس لیے اُس نے ہمیں گھوڑے لے جانے سے بھی منع کیا، کیونکہ اگر گھوڑے لے جاتے تو ساتھ میں دو کارندے بھی جاتے اور کارندوں کو خبر ہونے سے ہمارا خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ ویسے رات ہی سے راوت کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں تھیں مگر مالکن نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ کسی چٹان سے نیچے گر جانے سے راوت سخت زخمی ہوا ہے اور مالکن خود اس کی تیمارداری کر رہی ہیں اس لیے کسی کارندے کو اسے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سے کارندے پوری طرح مطمئن تو نہ ہوئے تھے۔ ہاں خاموش ضرور ہو گئے تھے۔

چلتے وقت دا ہلی بوا نے ایک ناشتے دان میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

دہلیز پر رک کر ریکھا نے کہا۔ ''اماں اب تم کو زیادہ دن یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ جلد سے جلد یہ زمین بیچ کر میرے پاس آ جاؤ۔''

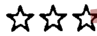
''ایسا ہی کروں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''تو تم ان کو زمین کیوں نہیں دے دیتیں؟'' ریکھا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے اُن سے کہہ دیا ہے۔ تم کو پہنچا کے سات آٹھ دن کے بعد آئیں۔ جب تک میں اچھی طرح سے سوچ لوں گی۔''

''اب سوچنے کا وقت نکل چکا ہے ماں۔'' ریکھا نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

ریکھا کی ماں کی پلکوں پر بھی آنسو لرزنے لگے۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے گلے لگ کے سسکیوں کے درمیان یوں رخصت ہوئیں جیسے یہ ان کی آخری ملاقات ہو۔



وہ صبح بادلوں سے گھری ہوئی تھی۔ وادی سے جانے والی موہوم سی رہگزر ردائے شب میں لپٹی ہوئی ابھی تک سو رہی تھی۔ ہمارے بے آواز قدموں کے نیچے کبھی کبھی سوکھی شاخ کے زرد پتے چرمرا جاتے۔ کبھی بیری کی جھاڑیوں میں کوئی چڑیا پھڑ پھڑا کر پھر اپنی چونچ پروں میں دبا کر خوابناک غنودگی میں کھو جاتی۔ ہمارے قدم وادی کی بلندی سے اُترائی کی طرف بڑھتے گئے۔ جگہ جگہ شبنم میں بھیگے ہوئے پیڑ رات کے نشے میں مسحور خاموش کھڑے نظر آتے تھے۔ ریکھا آگے آگے چل رہی تھی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے۔ راستے میں کئی جگہ عمودی چٹانوں کی اُترائی تھی، جن سے اترنا محال ہی نہیں خطرناک بھی تھا مگر ریکھا مجھے سہارا دیتی ہوئی کبھی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کسی ہوشیار بکری کی طرح ان چٹانوں کو پھلانگتی گزر جاتی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا۔ تمہاری ایسی نازک بدن اس مشکل راستے پر پیدل چل سکے گی۔''

''واہ کیوں نہیں۔'' ریکھا چہک کر بولی۔ ''یہ سارے راستے میرے جانے پہچانے

ہیں۔شادی سے پہلے میں ایک آوارہ بکری کی طرح ان راستوں پر اکیلی گھوما کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔"یہ راستہ کافی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ہم نے کواڑی قلعے والا راستہ کیوں نہیں اختیار کیا۔وہ آسان تھا۔"

"آسان شاید ہوگا مگر لمبا بہت ہے جس راستے پر میں تم کو لے جا رہی ہوں، اس راستے پر چلتے ہوئے ہم دوپہر تک شپارا قصبے کے آس پاس پہنچ جائیں گے۔"

ریکھا نے مجھے بتایا۔



رات ایک آخری سانس لے کر وادی سے بلند ہوگئی اور تاریک بادلوں سے گھرے ہوئے آسمان کے پس پشت اجالے کے شفاف لہریئے نمودار ہونے لگے اور پرندوں کے غول کے غول نیچے میدانوں میں جانے لگے۔صبح کے دھندلکوں میں، میں نے دیکھا کہ وادی کے نیچے میلوں تک پھیلے ہوئے میدانوں میں جگہ جگہ درختوں سے گھرے ہوئے کنجوں اور اونچے اونچے ٹیلوں پر آباد چھپروں سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔صبح بدن کسمساتے ہوئے اُٹھ رہی ہے اور کجلائی ہوئی آنکھوں کو ملتی ہوئی رات کی مدماتیوں کو جاگنے کی دعوت دے رہی ہے۔رات سے صبح ہونے تک اور شفق سے شام کے ڈھلنے تک کے عمل میں اتنی کشش کیوں ہے۔شاید اس لیے کہ دو وقت ملتے ہیں اور گلے لگ کر ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں مگر ریکھا تو مجھ سے آگے بھاگی جا رہی ہے یا اُس کے ذہن میں اُس کے اپنے شوہر کا چہرہ اُبھر رہا ہے۔یوں بھی ہوتا ہے کہ میرے ذہن میں کسی کے بھاگتے ہوئے قدم ابھر آئیں اور میں اُنہیں اپنے دل میں چھپالوں اور اس کے دل میں کسی دوسرے کی تصویریں اُبھریں اور اسے محسوس بھی نہ ہو کہ میں نے اپنے دل میں کیا چھپالیا ہے۔ جب تک تصویریں نہیں ملتیں، احساس نہیں ملتے، ارمان نہیں ملتے، محبت بھی نہیں ملتی۔صرف دو بدن مل جانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

چلتے چلتے ریکھا نے رُک کر اور مڑ کر پورب کی طرف دیکھا۔ جدھر سربھنی کی پہاڑیوں کے سلسلے گہرے بادلوں میں چھپ گئے تھ اور اُنہیں کبھی کبھی بجلی کوند جاتی تھی۔گو صبح ہوگئی تھی لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔شاید پہاڑیوں کے پیچھے نکل آیا ہو مگر بادلوں کا

نقاب اوڑھے ہوئے۔

ریکھا نے ہوا کو سونگھ کر کہا۔ ''سر بھنی کی پہاڑیوں میں بارش ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے صبح کی یہ خنکی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ سفر اچھی طرح کٹ جائے گا۔''

یکایک ریکھا کھڑی کانپی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

وہ افسردہ لہجہ میں بولی۔ ''جانے کیا بات ہے۔ ماں سے بچھڑنے کا ملال ابھی تک میرے دل میں ڈنک مار رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ وہ اپنی حفاظت کرنا خود جانتی ہیں۔''

''یہ تو مجھے معلوم ہے۔'' ریکھا نے کسی قدر مطمئن ہو کر قدم آگے بڑھائے۔

اب راستہ زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ اونچی اونچی چٹانوں سے گزرنا پڑتا تھا، جن میں کہیں جنگلی درختوں کے کنج کھڑے تھے۔ کہیں پر چھوٹی چھوٹی غاریں تھیں۔

ریکھا نے مجھے بتایا۔ ''بس یہ راستہ کٹ جائے، پھر آدھے میل کی آخری ڈھلان ہے۔ اس کے بعد دھولیا ندی، دوسری طرف دھولیا گاؤں اور پھر میدانی علاقہ، ندی پار کرنے کے بعد شپارا تک پہنچ جانے میں صرف تین گھنٹے لگیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''شکر ہے۔ آج سورج بادلوں کی اوٹ میں ہے، ورنہ گرمی سے میرا برا حال ہوتا اس سفر میں۔''

یکایک ریکھا نے رک کر میرے لبوں پر انگلی رکھ دی۔ آہستہ سے سرگوشی میں بولی۔

''چپ رہو۔''

میں کسی قدر حیرت زدہ کھڑا رہا۔ وہ جیسے کان لگائے ہوا میں بہنے والی صداؤں کو سنتی رہی۔

گھوڑوں کی چاپ پیچھے سے آ رہی ہے۔ ریکھا نے ایک دم نیم سرگوشی میں بولی۔

''ادھر آؤ۔''

وہ تیزی سے موڑ کاٹ کر مجھے چٹانوں سے گھرے ہوئے ایک غار میں لے گئی۔

ہم دونوں دم سادھے ایک دوسرے کے قریب کھڑے انتظار کرتے رہے۔ اس وقت تک مجھے کسی خطرے کا احساس نہ تھا۔ صرف اس کے بدن کی قربت کا احساس تھا اور تیز تیز

سانسوں کے درمیان اُس کے سینے کی زیر و بم کا۔

یکا یک ہمارے قریب سے، بالکل قریب سے دو اُٹھی ہوئی چٹانوں کے بیچ سے دو گھوڑ سوار گزر گئے۔ وہ عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے تھے، اور دونوں کے کندھوں پر بندوقیں تھیں اور گھوڑوں کی پشت پسینے سے بھیگی ہوئی تھی، جیسے وہ وادی سے یہاں تک کا فاصلہ بہت جلدی میں طے کر کے آئے ہوں۔

میں نے اُنہیں نہیں پہچانا مگر ریکھا نے پہچان لیا۔

''یہ تو ہمارے کارندے تھے۔'' جب وہ دونوں بہت آگے نکل گئے تو ریکھا نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ''بھلا اور پرسو۔ مگر یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

اس لئے یکا یک مجھے خطرے کا احساس ہوا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

''ممکن ہے یہ ہماری تلاش میں آئے ہوں۔'' میں نے ریکھا سے کہا۔

''مگر کیوں؟''

''ممکن ہے انہیں راوت والے معاملے کا اصل قصہ معلوم ہو گیا ہو۔''

''یہ ناممکن ہے میری ماں کچھ بتانے والی نہیں ہیں۔''

''ممکن ہے انہیں محض کچھ شبہ ہوا ہو۔ آخر راوت ہمارے پیچھے شکار کھیلنے گیا تھا۔''

ریکھا چپ رہی۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے۔ راوت آزاد کرا لیا گیا ہو اور اس نے ان دونوں کارندوں کو ہمارے تعاقب میں بھیجا ہو۔''

ریکھا نے سوچ سوچ کر کہا۔ ''کچھ بھی ہو۔ مجھے ان دونوں کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔''

''اب کیا کریں گے؟'' میں نے ریکھا سے پوچھا۔

ریکھا قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''اب تو وہ کافی آگے نکل گئے ہوں گے۔ آؤں دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں؟''

کچھ دور چلنے کے بعد جب اترائی ختم ہونے لگی تو ہم دونوں ایک اونچے ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے۔

یہاں سے میلوں تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ اترائی ختم ہوتے ہی دھولیا ندی

کا تیزی سے بہتا ہوا پانی نظر آتا تھا۔ دوسرے کنارے دھولیا گاؤں تھا۔ آگے جگہ جگہ کھجوروں کے کنج۔ پھر دور تک ریتلے میدان۔ نگاہ کی آخری حد شپارا قصبہ۔

ہم نے ان دونوں کارندوں کو اپنے گھوڑے ندی کے تیز پانی میں ڈالتے ہوئے دیکھا۔ اُنہیں دوسرے کنارے جاتے ہوئے دیکھا۔ انہیں دھولیا گاؤں کی چوحدی پار کر کے ریتلے ٹیلوں سے آتے ہوئے میدان میں تیزی سے گھوڑے دوڑاتے ہوئے دیکھا۔ راستے میں رک رک کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے جاتے تھے، جیسے اُنہیں کسی کی تلاش ہو۔

ریکھا نے کہا۔ ''وہ یقیناً ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر کیوں؟''

میں سارے معاملے سے واقف تھا مگر ریکھا نہیں تھی اور سرو جادیوی نے مجھے ریکھا کو کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا۔ ٹھیک بھی تھا۔ ریکھا کو صحیح حال بتا دینے سے اُس کی زندگی سدا کے لیے زہر آلود ہو جاتی۔

''مگر کیوں؟'' ریکھا نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ وہ عجب شش و پنج میں تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں کیا بتا سکتا ہوں، کارندے تمہارے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''مجھ سے الگ ہو کر تمہاری اور ماں کی کیا باتیں ہوئیں؟''

میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ ''میں نے ان سے کہا راوت کو پولیس میں دے دینا چاہیے۔ وہ بولیں۔ جب تک تم میری بچی کو سسرال چھوڑ کے واپس شپارا سے پولیس لے کے نہ آ جاؤ، میں کچھ نہیں کروں گی۔''

ریکھا نے کہا۔ ''ٹھیک ہی تو کہا اُنہوں نے۔'' پھر اور میرے قریب آ کر بولی۔ ''اور کیا کہا اُنہوں نے؟''

''اور زمینوں کے متعلق باتیں ہوئیں۔'' زمین کا نرخ بھاؤ، مول تول، میں نے پھر جھوٹ بولا۔

مگر اب ریکھا کو میری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ریتلے میدانوں سے گزرتے ہوئے دو گھوڑ سواروں کو دیکھ رہی تھی۔

بولی۔ ''سیدھے شپارا جا رہے ہیں۔ بگٹٹ بھاگتے جا رہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ ہمیں شپارا جانے سے پہلے پکڑ لیں گے۔''

''اور تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ پھر بولی۔

''میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے ناشتا کرلیا جائے۔ پھر ندی پار کر کے دھیرے دھیرے سے اپنے سفر پر چلا جائے اور ذرا چکر کاٹتے ہوئے راستہ بدل کر ہم لوگ دوپہر کے بجائے رات کو شاپارا پہنچیں گے۔ کیوں۔''

''ٹھیک خیال ہے۔ خصوصاً ناشتے کے بارے میں تو تمہارا بہت ہی نیک خیال ہے۔ اس وقت مجھے اتنی بھوک لگی ہے کہ میں ناشتے کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی کھا سکتا ہوں۔''

''رستے بھر اور کیا کرتے رہے ہو؟'' ریکھا چمک کر بولی۔ ''میرے پیچھے چلتے ہوئے تمہاری نگاہیں برابر مجھے کھاتی رہی ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''میری پیٹھ میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔'' وہ شریر مگر افسردہ نگاہوں سے میری طرف تکتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''میں کیا کروں۔ تمہاری چال ہی اتنی خوب صورت ہے، اتنی خوبصورت عورت کی اتنی عمدہ چال میں نے بہت کم دیکھی ہے۔ اکثر عورتیں تو بطخ کی طرح چلتی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''اور اکثر مرد کتے کی طرح ہانپتے ہوئے چلتے ہیں۔''

میں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ''میری توبہ۔''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

پھر ناشتے دان کھول کر کھانا کھانے لگے۔ کبھی انگلیاں انگلیوں سے لپٹ جاتیں، کبھی آدھا لقمہ میرے ہاتھ میں آتا، آدھا اُس کے ہاتھ میں۔ سالن، روٹیاں، احساس، جذبات، نگاہیں، لمس ذائقے سب گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وقت، ایک ناشتے دان کی طرح ہم دونوں کے بیچ تھا اور اس کا ذائقہ بڑا لذیز تھا پھر جب اپنی اپنی انگلیاں چاٹتے ہوئے ہم مسرور نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تو ان نگاہوں کے ملن میں بوسے کی سی حلاوت اور حدت محسوس ہونے لگی میرے ذہن میں وہ خوابناک رات آئی۔ جب اس رسوئی گھر میں ریکھا نے میرے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ پتا نہیں وہ لمحہ حقیقت تھا یہ لمحہ بھی ایک

خواب ہے؟ یکا یک ریکھا نے اپنے چھوٹی سی زبان سے ایک چٹخارہ لیا۔
بولی۔ ''اب نیچے ندی پر جا کر پانی پئیں گے۔''
''اور یہ خالی ناشتہ دان؟''۔
ریکھا نے ناشتے دان اُٹھایا اور اسے گھما کر دور پھینک دیا۔ ناشتے دان لڑھکتا لڑھکتا چٹانوں سے گرتا پڑتا، زخمی ہوتا چیختا چلاتا ایک کھڈ میں گر کر خاموش ہو گیا اور اسی وقت میرے اور اُس کے درمیان وہ لمحہ بھی مر گیا۔
اب وہ ریکھا، ریکھا تھی۔ مجھ سے الگ۔ میں اس سے الگ جانے آگے جا کر زندگی کے کس مدار پر ہم دونوں پھر ایک دوسرے ملیں گے؟
ریکھا اُٹھ بیٹھی اُس نے اُٹھ کر اپنے سرخ اور صندلی لہنگے سے مٹی جھاڑی۔ دھنک کے رنگوں کی طرح ایک انگڑائی لی اور اپنی چوٹی کو جھلاتے ہوئے بولی۔
''چلو، ہماری خاندانی زمینوں کے ہونے والے مالک اب آگے بڑھو۔''
میں نے کہا۔ ''زمینوں کے مالک ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اگر تمہارے خاندان میں شامل نہ ہوا تو؟''
ریکھا نے زبان نکال کر میرا منہ چڑایا اور آگے آگے چلنے لگی۔ ڈولتے ہوئے اور زیادہ ڈلوتے ہوئے جیسے اب اس کی چال میں میری تعریف کی آگہی بھی شامل تھی۔ یونہی مور ناچتا ہے۔ کبوتر گلا پھلاتا ہے اور عورت بدن چراتے ہوئے چلتی ہے۔ حُسن کسی دوسرے کی نگاہ کے بغیر نامکمل ہے۔ سپاٹ۔ عورت کے سارے خم مرد کی نگاہ میں بیدار ہوتے ہیں۔
یکا یک آخری موڑ کاٹ کے ندی ہماری نگاہوں کے سامنے آگئی اور اس کے چڑھتے پانی کو دیکھ کر یکا یک ریکھا سر پکڑ کر ندی کے کنارے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

اوپر پورب میں جو بارش ہوئی تھی اور ابھی تک جاری تھی۔ اس کی وجہ سے دھولیا ندی بڑی منہ زور اور پُر شور تھی اور پہاڑیوں کی مٹی بہالانے سے اس کا پانی بھی بے حد گدلا تھا۔ اس پانی سے پیاس بجھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جس تیز روانی سے

چڑھی ہوئی ندی بہہ رہی تھی، اس کو تیر کر عبور کرنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ریکھا مایوسی سے بولی۔ "اب کیا کریں؟"

میں چپ رہا۔

ریکھا قدرے توقف کے بعد بولی۔ "بتاؤ ناں اب کیا کریں؟"

میں نے کہا۔ "اب کواڑی قلعے کے راستے سے بھی نہیں جا سکتے۔ اول تو میلوں واپس جانا ہوگا پھر ممکن ہے کواڑی قلعے والی ندی بھی اس ندی کی طرح چڑھی ہوئی ملے وہ راستہ بھی لمبا ہے۔ آج تو کسی حالت میں شپارا نہیں پہنچ سکتے۔"

ریکھا نے کہا۔ "بس ایک ہی صورت ہے۔ اس ندی کے کنارے بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔ جب ندی اتر جائے گی اسے پار کر لیں گے۔"

قریب میں کھجوروں کا ایک کنج تھا ہم اس میں چلے گئے۔ یہاں ایک جنگلی جھاڑی پر پھول کھلے تھے۔ ریکھا نے پھولوں کا ایک شگوفہ توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لیا اور میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "جب جذبات کی ندی چڑھی ہو تو اس وقت کیا کرتے ہیں۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ندی اُتر جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ مجھ سے کترا کر نکل گئی اور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر بیٹھ کر کچھ گنگنانے لگی۔ کوئی لوک گیت تھا شاید جس کے بول میں سمجھ نہ سکا۔ ہاں اس کا سوز میرے دل کو چھو رہا تھا۔ جب ایک گیت ختم ہوا تو دوسرا شروع ہو گیا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ اسی طرح چار پانچ گیت اُس نے اپنی گہری مدھم آواز میں مجھے سنا ڈالے۔ اب یہ تو معلوم نہیں کہ وہ یہ گیت مجھے سنا رہی تھی یا اپنے آپ کو شاید کوئی عورت کسی دوسرے کو گیت نہیں سناتی ہے۔ اپنے دل کے محسوسات کو زبان دینے کے لیے گاتی ہے۔ گاتے گاتے اس کی نگاہیں میری طرف دیکھتے ہوئے نوکدار ہو جاتیں جیسے ٹوٹے ہوئے سپنوں کے کنارے مجھے ایسا لگا جیسے ان کناروں کو چھوتے ہی میرے احساس کی انگلیاں زخمی ہو جائیں گی اور ان سے رس کر لہو ٹپکنے لگے گا۔ کتنی شکایت تھی ان نگاہوں میں میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ریکھا۔ جانے تو کس

سے کس کی شکایت کر رہی ہے؟ ریکھا اس وقت ایک زخمی پرندے کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم دونوں نے ندی کے کنارے جا کر معائنہ کیا۔ ندی کی تیزی میں کافی کمی آچکی تھی مگر میرے خیال میں ندی کی روانی تیرنے کے لیے ابھی تک خطرناک تھی۔ ریکھا ندی عبور کرنے کے لیے بڑی بے چین معلوم ہوتی تھی۔

بولی۔ ''چلو، پانی کافی اتر گیا ہے۔ تیر کر پار کر لیں گے اسے۔''

میں نے کس قدر ہچکچا کر کہا۔ ''میرے خیال میں تو ابھی تیر کر پار کر جانے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیں۔

ریکھا نے میری بزدلی کا اندازہ لگایا۔ حقارت سے بولی۔ ''کیا تمہیں تیرنا نہیں آتا؟''

میں نے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی دریا یا ندی کو تیر کر پار نہیں کیا ہے۔ یوں تالاب میں ٹھہرے ہوئے پانی میں اکثر نہایا ہوں اور تیرنے کی مشق بھی کی ہے مگر وہ اور بات ہے۔''

ریکھا بولی۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں سہارا دے کر پار لے جاؤں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم تیرنا جانتی ہو؟''

وہ بولی۔ بطخ کی طرح اور پھر یہ ندی تو بچپن سے اب تک سینکڑوں بار پار کی ہے۔ یہاں پانی زیادہ گہرا نہیں ہے۔ تیز ضرور ہے۔ زیادہ دیر انتظار کریں گے تو ممکن ہے یہیں رات ہو جائے یا پہاڑوں پر اتنی بارش ہو جائے کہ یہ ندی اب سے دگنی چڑھ جائے۔''

ریکھا کی باتوں میں وزن تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر سر پر باندھ لیے صرف ایک انڈر رویر رہنے دیا۔ ریکھا نے اپنے کپڑے تو نہیں اتارے، ہاں اپنے لہنگے کو ایک لنگوٹی کی طرح اوپر اڑس لیا اور کپڑوں کی گٹھڑی سر پر باندھ لی۔ میں اس کی سفید مدور ٹانگوں کے سڈول پن کو سراہنے لگا مگر دوسرے لمحے میں ریکھا نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے فوراً بعد میں نے بھی گو میرا دل اندر سے بہت ڈر رہا تھا۔

پانی کا دھارا بہت تیز تھا، اور ہماری کوشش کے باوجود ہمیں اپنی روانی میں بہائیں لیے جا رہا تھا۔

ریکھا دوسرے کنارے جانے کی بڑی کوشش کر رہی تھی مگر شاید ہم لوگوں نے پانی

کی تیزی کا اندازہ کرنے میں غلطی کی تھی۔ پانی کی پُر شور روانی نے ریکھا کو ایسے دو چار تھپیڑے دیئے کہ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بہتی ہوئی آگے چلی گئی۔ پانی کے بہاؤ پر دو ایک ڈبکیاں بھی اسے لگیں۔

میں نے کنارے پر جانے کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے ہاتھ پاؤں مار کر ریکھا کے قریب جانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم لوگ اب بیچ منجدھار میں تھے۔ یکا یک پانی کے ایک تیز ریلے نے مجھے اس کے قریب کر دیا۔ میں نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اس کی کرتی کا ایک کونا ہی میرے ہاتھ لگا۔ دوسرے لمحے میں کرتی چر کرتی ہوئی پیچھے سے پھٹ گئی۔

میں پھر انتہائی کوشش کر کے تیرتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے جا لیا۔ اتنے میں وہ دو ڈبکیاں اور کھا چکی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دم ٹوٹ رہا ہے۔

اگر میں خود زیادہ کریڈٹ لے لوں تو غلط ہوگا ممکن ہے اسے بچانے میں تھوڑا سا میرا دخل رہا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اسی لمحے ہم دونوں کو بچا لیا پانی کا ایک اور ریلا منجدھار کو کاٹتا ہوا آیا اور ندی کے دوسرے کنارے چلا گیا۔ اس کے سہارے سہارے ہم دونوں دوسرے کنارے تک بہتے ہوئے چلے گئے۔ پھر کنارے کی جھاڑیوں کی ڈوبی ہوئی شاخوں کو پکڑ کر دوسرے کنارے پر چڑھ گئے۔

پہلے میں دوسرے کنارے پر اترا، پھر میں نے دونوں ہاتھوں سے ریکھا کو پکڑ کر اوپر کھینچا۔ اس کھینچا تانی میں اُس کی کرتی جگہ جگہ سے پھٹ گئی۔ خصوصاً پشت پر سے اوپر کنارے پر لا کر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بے دم، بے حال ہو کر اوندھی لیٹی تھی اور ایک جھاڑی کے پتوں میں منہ چھپا کر قے کر رہی تھی اور اُس کی کرتی پشت پر سے جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔

یکا یک میں نے دیکھا کہ اس کی پشت پر نیلگوں دھاریاں سی پڑی ہیں جیسے کسی نے اسے چابک مار مار کر پیٹا ہو یا ناخنوں سے کھرونچا ہو یا کہیں گرنے میں رگڑ کھانے سے پشت پر جگہ جگہ چوٹ آئی ہو۔ زخم اب مندمل ہو چکے تھے مگر کہیں کہیں نیلگوں دھاریاں اب

تک ابھری تھیں اور کہیں کہیں پر سرخی بھی باقی تھی۔

میں ان نیلگوں دھاریوں کو دیکھ کر چونک گیا مگر اس وقت میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی منہ میں انگلی ڈال کر اپنے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر جب اُس کا سانس پھول گیا تو بے سدھ ہو کر لیٹ رہی۔

اتنے میں سورج نکل آیا، بادل جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔

دیر تک ہم دھوپ میں بے سدھ پڑے رہے اور دھوپ اور ہوا ہمارے بدن کے کپڑے سکھاتی رہی۔ پھر جب دھوپ کی نوکدار کرنیں ہمارے جسم میں سوئیاں چبھونے لگیں تو ہم ندی کے کنارے سے اُٹھ کر چند قدم چل کر درختوں کے ایک جھنڈ تلے بیٹھ گئے۔ ریکھا نے اپنی اوڑھنی پھیلا کر سکھانے کے لیے رکھ دی۔ پھر اپنا لہنگا بھی اب وہ صرف اپنی پھٹی کرتی اور پیٹی کوٹ میں تھی اور بنجارن سی لگ رہی تھی۔ اسے اس طرح کانپتے دیکھ کر میرا دل پگھلنے لگا۔

ہم دونوں ایک درخت کے نیچے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے اپنے نگاہیں مجھ سے چرالیں تھیں۔ جیسے اس نے ان چرائی ہوئی نگاہوں کی ایک اوٹ بنالی ہو اور اس میں اپنے آپ کو چھپالیا ہو۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری پیٹھ پر یہ نیلگوں نشان کیسے ہیں؟ جیسے کسی نے تمہیں چابک سے مارا ہو۔''

فوراً اس کا ہاتھ اپنی پشت پر گیا۔ کرتی کو پشت پر سے جگہ جگہ سے پھٹا محسوس کر کے اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کا چہرہ بھی جھک گیا اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کے رونے لگی۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ میرے سینے سے لگی وہ دیر تک دھیرے دھیرے سسکتی رہی۔

''بتاؤ۔ ریکھا کیا بات ہے؟ یہ زخموں کے نشان کیسے ہیں اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''وہ...... مجھے مارتے ہیں۔''

''وہ کون تمہارے پتی؟'' میں نے پوچھا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"تمہارے پتی تمہیں مارتے ہیں؟ اس پھول ایسے بدن کو؟" میں حیرت زدہ رہ گیا۔
"ہاں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو پھر بھر آئے۔
"کیوں؟"
اُس نے کچھ نہ کہا، اور بھی زیادہ سمٹ کر میرے سینے میں منہ چھپا لیا اور سسکیاں لینے لگی۔
"کیوں ریکھا کیوں وہ ایسا کرتے ہیں؟"
روتے ہوئے بولی۔ "اگر وہ ایسا نہ کریں تو میرے ساتھ سو نہیں سکتے۔" میں سکتے میں رہ گیا۔ پہلے لمحے میں مجھے یقین نہ آیا۔ وہ کیا کہہ رہی ہے۔
"یعنی۔ یعنی کہ۔" میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لیے دوبارہ اس سے پوچھا۔
"وہ تمہیں چابک سے مارتے ہیں؟"
"ہاں۔" وہ بولی۔ "کبھی کبھی تو مار مار کر چابک سے میری پیٹھ ادھیڑ دیتے ہیں اور جتنا زیادہ مارتے ہیں اتنا ہی ان میں جوش پیدا ہوتا ہے۔
وہ زور زور سے رونے لگی۔
"یہ بڑی بے رحمی ہے۔" میں نے کہا۔ وہ روتی رہی۔
"ایسے ظالم آدمی کو تو گولی مار دینی چاہیے۔" وہ زور زور سے رونے لگی۔
میں نے اسے زور سے لپٹا کر کہا "تمہیں ایسے غلیظ بیمار اور ظالم آدمی کے پاس ایک منٹ کے لیے بھی نہیں رہنا چاہیے۔"
نہیں نہیں، میں تمہیں تمہاری سسرال نہیں لے جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلوگی۔"
میں نے ایک انگلی کے سہارے سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی۔ اس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کیے، پھر اس کے نازک گلابی ہونٹوں کی طرف میرے ہونٹ جانے لگے۔
یکا یک میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اس کے بدن کے گرد میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں دیر تک اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی بچوں کی سی سسکیاں تھم گئیں اور آنسو بھی خشک ہو گئے۔ پھر میں نے اسے اپنے بازوؤں کے گھیرے سے آزاد کر دیا۔ وہ

دیر تک درخت سے ٹیک لگائے مجھ سے اپنا چہرہ پھیرے لمبے لمبے سانس لیتی رہی۔ پھر اس نے قریب میں پڑی آدھی سوکھی، آدھی گیلی اوڑھنی اُٹھا کر اپنی پھٹی کرتی کے گرد لپیٹ لی جیسے میرے اور اپنے درمیان ایک اور دیوار کھڑی کر لی ہو مگر میں نے کچھ ایسا محسوس کیا اور پہلی بار محسوس کیا جیسے یہ کوئی بہت بڑی اور مضبوط دیوار نہیں تھی جذبات کے ایک ہی ریلے سے بہہ سکتی تھی۔ ابھی ایک منہ زور ندی ہمارے بدنوں سے ٹکرائی تھی۔ بہتے بہتے چند لمحوں کے لیے ہمارے دل یکجا ہو گئے تھے اور کسی اجنبی جذبے کے اجالے نے ہماری روحوں کو چھو لیا تھا اور جب وہ میری گود میں آئی تھی تو اس کی سانسوں میں کتنی اپنائیت تھی۔ مجھ سے دور جا کے بھی وہ اب کبھی مجھ سے اجنبی نہ ہو سکے گی۔ کسی مہربان جذبے کے پیڑ نے ہم دونوں کو اپنے سائے میں لے لیا تھا۔ اپنائیت کا یہ احساس بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو بڑی مشکل سے جاتا ہے۔ اب مجھ سے کتنی بھی دور تم چلی جاؤ۔ ریکھا یہ لمحہ ہم دونوں کا پیچھا کرے گا اور دل میں ایک گھنٹی کی طرح صدا دے گا۔

اگلے دو ڈھائی گھنٹوں تک میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی میں اپنے کپڑے دھوپ میں سکھاتا رہا۔ وہ اپنے کپڑوں کی گٹھڑی کھول کر، دو جوڑے جو اس میں بندھے تھے، انہیں الٹ پلٹ کر سکھاتی رہی۔

پھر تنے کے دوسری طرف جا کر مجھ سے بولی۔ ''ادھر مت دیکھنا، میں کپڑے بدل رہی ہوں۔''

چند منٹوں میں اس نے کپڑے تبدیل کر لیے پھٹی کرتی کی جگہ نئی قمیض اور لہنگے کی جگہ چوڑی دار اور پرانی اوڑھنی کی جگہ نئی اوڑھنی پھر مجھ سے آنکھیں ملا کر بولی۔

''چلو اب چلیں ورنہ راستے ہی میں رات پڑ جائے گی۔''

ہم دونوں نے قدم بڑھانے۔ آگے جا کر ہم دھولیا گاؤں کے اندر نہیں گئے بلکہ اس سے کنی کاٹ کر گھوم کر آگے بڑھ گئے کیونکہ ریکھا نے کہا تھا کہ راستے میں جتنے کم آدمیوں سے ملاقات ہو اچھا ہے اور میں نے بھی ان آگے جانے والے گھوڑ سواروں کی موجودگی میں اسے بہتر جانا۔

یہاں سے ریتیلا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ ریتیلا اور غیر آباد، چلتے چلتے سہ پہر ختم

ہوگئی۔ سورج مغرب کی طرف جانے لگا۔ اب تک راستے میں کہیں پانی پینے کو نہ ملا تھا، اس لیے اب جو تک راستے میں کہیں پانی پینے کو نہ ملا تھا، اس لیے اب جو راستے میں ایک کنواں نظر آیا تو ہم دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ خوش قسمتی سے رہٹ چل رہا تھا۔ یہاں کنویں کے قریب بیٹھ کر دم لیا اور اچھی طرح سے پیاس بجھائی۔

ریکھا نے رہٹ چلانے والے لڑکے سے پوچھا۔ "تم نے کوئی دو گھوڑ سوار دیکھے تھے؟"

"ہاں، چند گھنٹے ہوئے ادھر سے گزرے تھے۔"

"کیا پوچھتے تھے؟"

لڑکا پہلے تو چپ رہا غور سے ہم دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"شاید تم دونوں کو پوچھتے تھے۔ پوچھتے تھے کوئی نوجوان مرد اور لڑکی اِدھر سے گئے ہیں۔ میں نے ناکر دی کیونکہ تم لوگ تو اب آئے ہو۔"

ریکھا نے میری طرف اور میں نے ریکھا کی طرف غور سے دیکھا۔ جیسے دونوں کے دل میں ایک ہی خیال آیا ہو۔ پھر ریکھا بولی۔

"دیکھو۔ اگر دوبارہ لوٹ کر تمہارے پاس آئیں تو انہیں ہمارے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

میں نے لڑکے کو ایک روپیہ دیا۔ وہ بولا۔

"اچھا نہیں بتاؤں گا۔"

چلتے چلتے ہم دونوں تھک گئے تھے۔ اس لیے یہاں کنوئیں کے کنارے درختوں کی چھاؤں میں چند گھڑی آرام کرنا مناسب سمجھا میں کمر سیدھی کر کے زمین پر لیٹ گیا۔ وہ بھی میرے قریب میری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

میں اس کے شوہر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نفسیاتی حالت کے بارے میں تو میں نے اکثر پڑھا تھا جسے انگریزی میں Masochism کہتے ہیں جس میں اپنے بدن کو تکلیف پہنچا کر خصوصی بیداری پیدا کی جاتی ہے اور اس حالت کے بارے میں بھی سنا تھا جس میں کسی دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خصوصی بیداری پیدا کی جاتی ہے اور اس حالت کے

بارے میں بھی سنا تھا جس میں کسی دوسرے کو تکلیف پہنچا کر اور اذیت دے کر جذبات بیدار کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی SADISM یعنی سادیت کی ایک ظالمانہ صورت ہے۔ مگر پڑھنے لکھنے اور دیکھنے میں بہت فرق ہے۔ ریکھا کی پشت کے نیلگوں نشان دیر تک میرے احساس کی پشت پر چابک کی طرح برستے رہے گھبرا کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''کیا ہوا؟'' ریکھا نے میرے متغیر چہرے کو دیکھ کر کہا۔

''کیسے اب تک برداشت کیا تم نے؟''

''تو اور کیا کرتی؟'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''اسے گولی ماردی ہوتی۔''

''یہ مت بھولو کہ اس سے میرا ایک بچہ بھی ہے۔ میں اپنے بچے کے باپ کی قاتل کیسے بن سکتی ہوں۔''

''یہ ایک غیر انسانی حرکت ہے۔ تمہیں اس سے الگ ہو جانا چاہیے۔''

''الگ ہو کے جاؤں کہاں؟''

''کیا تمہاری ماں کو معلوم ہے؟''

''نہیں، میں نے اس کو کچھ بتایا نہیں ہے...... تمہیں بھی نہ بتاتی۔ اگر اگر......'' وہ چپ ہو گئی۔

''کیا پہلے دن ہی سے ایسا ہوا تھا؟''

''ہاں، پہلے دن ہی سے۔'' وہ بولی۔ ''میں سمجھتی تھی شاید سبھی مرد ایسا کرتے ہوں گے۔ دھیرے دھیرے جب جیرا آباد کی دوسری سہیلیوں سے بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ میں ہی اس معاملے میں بدقسمت ہوں ورنہ دوسری لڑکیوں کے خاوند تو بہت پیار کرتے ہیں۔''

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ چپ ہو گئی۔

پھر بولی۔ ''پہلے تو مجھے دنیا کے سارے مردوں سے نفرت ہو گئی تھی، پھر جب میں نے دوسری سہیلیوں کو اپنی بدقسمتی بتائے بغیر بڑی احتیاط سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ سبھی مرد ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ کوئی کوئی ایسا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ایسے آدمی کو چھوڑ دینا، دنیا، دھرم اور قانون کسی کی نظر میں گناہ نہیں

ہے۔ تمہیں ایسے آدمی کے ساتھ ایک پل نہیں رہنا چاہیے، یہ پھول سا بدن پھول کی طرح کھلنے کے لیے بنا ہے چابک کھانے کے لیے نہیں۔"

وہ دھیرے سے بولی۔

"کیا معلوم تم بھی ایسے ہی نکلو۔"

میں چونک گیا اس کا یہ جملہ گہرا تھا عورت کے دل کی طرح اتھاہ اور تہہ در تہہ پرت دار جانے تم کیا کہہ گئیں ریکھا۔ اس جملے کے تو بہت سے معنی ہیں کئی رنگ ہیں۔ ایسے میرے سامنے دھنک کی طرح اس کے رنگ کھلتے جا رہے ہیں۔

میں نے شریر نگاہوں سے اُسے تاکتے ہوئے کہا۔"کیا سچ مچ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو؟"

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف آہستہ سے سرک آیا۔ میرے ہاتھ کی انگلیاں اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلنے لگیں۔ بڑا ہی کمزور میٹھا، سا لمحہ تھا وہ۔ میں اس کے ہاتھ کی ریکھا میں ٹٹولنے لگا۔ شائد ان میں کہیں میرے جیون کی ریکھا ہو۔

میں دھیرے دھیرے اس کے نزدیک جانے لگا۔

یکایک اس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"مجھے کلنک مت لگانا بابو۔"

میں اپنی جگہ جامد رہ گیا۔ وہ لمحہ ایک سسکی بن کر فضا میں گھل گیا۔

☆☆☆

اب شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے اور ہم تیز تیز قدموں سے شپارا کی طرف جا رہے تھے۔

یکایک ہم نے دور سامنے سے دھول اڑتی ہوئی دیکھی۔ ایسا گمان ہوا جیسے کوئی چرواہا اپنے ریوڑ کو ہنکاتا آ رہا ہے۔ یا کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار ادھر چلے آئے ہیں۔ ہم لوگ جلدی سے درختوں کی آڑ میں ہو لیے۔

چند منٹ کے بعد گھوڑوں پر دو آدمی سوار ہمارے قریب سے گزر گئے۔ میں نے اور ریکھا نے دونوں کو پہچان لیا۔ یہ وہی دو کارندے تھے، راوت کے، جو غالباً ہمارا نشان تا نہ پا کر مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے۔

جب وہ کافی دور چلے گئے تو ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

پھر ریکھا نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔

''چلو اچھا ہوا وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اب شپارا میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

اب اِکا دُکا روشنیاں نظر آنے لگیں۔ شپارا کا قصبہ قریب آ رہا تھا۔

☆☆☆

شپارا تک پہنچتے پہنچتے ریکھا بہت تھک گئی۔ بولی۔ ''آج کی رات یہیں شپارا کی سرائے میں آرام کریں گے۔ صبح دو اونٹ لے کر جیرا آباد چلیں گے۔

''جیرا آباد تک کیا اونٹوں کا راستہ ہے۔''

''ہاں۔'' ریکھا بولی۔ ''میں تو ہمیشہ اونٹ لے کر جاتی ہوں۔ وہ راستہ یہاں سے قریب بھی ہے۔''

مگر میرا خیال تھا، ممکن ہے سپارا جنکشن سے جیرا آباد تک گاڑی جاتی ہو، ریکھا کو سرائے میں بٹھا کر ریلوے اسٹیشن گیا۔ معلوم ہوا گھنٹے بھر میں چھوٹی لائن سے ایک گاڑی جائے گی جو کل صبح جیرا آباد قصبے کے اسٹیشن تک پہنچا دے گی۔

راستہ تو ٹرین سے بھی زیادہ لمبا نہیں تھا مگر چھوٹی لائن کی گاڑی اونٹنی کی رفتار سے بھی آہستہ چلتی ہے۔ پھر بھی میں نے شپارا سے جیرا آباد تک کے ویرانے کو اونٹ کے بجائے گاڑی سے طے کرنا بہتر سمجھا۔ اس لیے میں نے جیرا آباد کے دو ٹکٹ کٹا لیے اور واپس سرائے چلا گیا۔

ریکھا تھک کر سو گئی تھی۔ اسے آہستہ سے جگایا، جلدی جلدی سرائے کی بھٹیاری سے کھانا تیار کرا کے کھایا اور گاڑی جانے میں دس منٹ تھے، جب اسے پکڑ لیا۔

ریکھا تو نیم غنودگی کے عالم میں تھی۔ وہ تو سارا راستہ میرا ہاتھ پکڑے چل رہی تھی اور اُسے یہ بھی شاید ٹھیک طرح سے معلوم نہ تھا کہ وہ کب ریلوے اسٹیشن پر آئی۔ کب وہ چھوٹی لائن کی گاڑی میں بیٹھی۔ کب گاڑی چلی وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں آتے ہی برتھ پر پاؤں پسار کر سو گئی۔

یہ چھ برتھ کا ڈبہ تھا۔ تین اوپر تین نیچے ہم سے پہلے چار آدمی اس ڈبے میں بیٹھے تھے۔ دو ایک برتھ پر، دو دوسری برتھ پر۔

ایک برتھ پر دو ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ان میں سے تگڑا تھا، دوسرا کمزور تھا اور نازک بدن والا، اس نے اپنے بال اس قدر بڑھا رکھے تھے کہ عورتوں کی طرح جوڑا بنا لیا تھا۔ ممکن ہے میں اسے عورت سمجھتا، اگر اس کے رخساروں پر پتلی سی اور چھدری سی داڑھی نہ ہوتی۔ چہرہ لمبوترا تھا اور آنکھوں کی پلکیں گھنی تھیں اور ہاتھوں کی انگلیاں بھی لمبی تھیں اور آواز بھی پتلی تھی۔ مجھے کچھ ایسا احساس ہوا، جیسے قدرت اسے عورت بناتے بناتے رہ گئی۔

دوسرے ہی کے چوڑے چکلے چہرے پر گول گھنی اور سرخی مائل داڑھی تھی اور وہ دوسرے پیٹوں کے مقابلے میں کافی مضبوط اور بھوری سبز اور پیلی دھاریوں والی لنگی پہن رکھی تھی اور ایک میلا گیروئے رنگ کا کرتا جس کے سینے کے تینوں بٹن کھلے تھے، اور اس میں سے اس کے چوڑے سینے کے بھورے سرخ بال جھانک رہے تھے۔ وہ بڑے محبت آمیز لہجے میں اپنے دبلے پتلے ساتھی سے بات کر رہا تھا اور کبھی کبھی اس کا ہاتھ دبلے پتلے ساتھی کی کمر تک چلا جاتا تھا۔

دبلا پتلا ہی ایک رومال کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی نکال کر اس کے ٹکڑے کرنے لگا اور چاقو سے ٹماٹر اور کھیرے کے ٹکڑے کر کے انہیں ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر رکھ کر سینڈوچ بنا کر ہٹے کٹے ہی کو دینے لگا۔

دونوں ہی دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے سینڈوچ کھا رہے تھے۔

دوسری برتھ پر ایک ادھیڑ عمر کا ایک آدمی کلّے میں پان دبائے کھدر کا پائجامہ اور کھدر کا لمبا کرتا پہنے ہوئے ہندی کا ایک اخبار پڑھنے میں مستغرق تھا۔ کبھی کبھی قریب کی کھڑکی کھول کر منہ کھڑکی کے قریب لے جا کر پیک تھوک دیتا۔ اس کے سامنے برتھ کے دوسرے کنارے پر شیروانی اور علی گڑھ کٹ کا پائجامہ پہنے، کلین شیو، آنکھوں میں ذہانت کی چمک لیے ایک ناشتے دان کھولے کھانا کھا رہا تھا۔ ورقی پراٹھے، شامی کباب، بھنا قیمہ، مٹر اور شلغم کا اچار۔ کھانے کے بعد انہوں نے چاندی کی ایک ڈبیہ نکالی۔ اسے کھول کر اس میں سے مکھنی پان کی ایک جوڑی منہ میں ڈالی اور کچھ دیر کے بعد برتھ کے نیچے رکھا ہوا ایک

نقشین اُگالدان اُٹھایا اور بڑی نفاست سے اسے پیک کے لیے استعمال کیا۔ پھر اُگالدان فرش پر رکھ کر شیروانی کی جیب سے ایک رومال نکالا۔ اس سے منہ پونچھا۔ برتھ سے ایک اُردو رسالہ اُٹھایا اور اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

دونوں ہپی دھیرے دھیرے کسی غیر زبان میں باتیں کئے جا رہے تھے۔ میں نے تگڑے ہپی سے پوچھا۔ آپ کس ملک سے آئے ہیں؟

اُس نے بڑی شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ ''آسٹریا سے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''گلوآپور کا پرانا قلعہ دیکھنے۔''

میں نے چھوٹے ہپی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ آپ کا دوست ہے؟''

تگڑا ہپی مسکرایا۔ آہستہ سے بولا۔ ''نہیں یہ میری بیوی ہے۔''

''بیوی؟'' میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''یہ تو مرد ہے۔''

''ہاں مرد تو ہے مگر آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں دو مرد بھی شادی کر سکتے ہیں۔''

یکا یک مجھے امریکی اخباروں میں چھپی دو تین اس قسم کی مثالیں یاد آئیں۔ اخباروں میں ان جوڑوں کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ میں چپ ہو گیا۔ آج کل یورپ اور امریکہ میں ہوموسیکسولٹی ہم جنسی کا رجحان بہت بڑھتا جا رہا ہے مگر کیا کہنا مشرق میں یہ وبا بہت پرانی ہے۔

میں نے کہا۔ ''مگر آپ دونوں جوان ہیں۔ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہیں اور گھر سے دنیا کی سیر کرنے نکلے ہیں تو کھاتے پیتے گھروں کے افراد ہوں گے۔ اس لیے آپ دونوں آسانی سے دو عورتوں سے شادی کر کے......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ بولا ''عورت اور مرد کی شادی کی رسم بہت پرانی ہو گئی۔ اس میں اب کوئی لطف نہیں رہا۔ دو مردوں کی شادی کا تھرل Thrill ہی دوسرا ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ہم نئے تجربوں کی وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہماری نسل نئے تجربے کرنا چاہتی ہے۔''

''مگر اخلاق؟''

''ہمارے یہاں اخلاق کے پیمانے دوسرے ہیں۔ پرانے یورپی سماج کے سارے بندھن ہم نے توڑ دیے ہیں، ورنہ ہم اپنے گھروں سے دور آج اس کھٹارہ ٹرین میں کیوں بیٹھے ہوتے۔''

میں نے کہا۔''انسانی سماج کے سانچے تم توڑ سکتے ہو لیکن فطرت کے سانچوں کو توڑنا ناممکن ہے۔ اس شادی سے بچے تو پیدا نہیں ہو سکتے۔ گھر بھی نہیں بن سکتا۔ فیملی کی بنیاد بھی نہیں پڑ سکتی۔''

''کون گھر بنانا چاہتا ہے۔'' وہ نازک بدن ہپی، بولا۔''کس کو بچے چاہئیں۔ اس دنیا میں پہلے ہی سے بہت زیادہ آبادی ہو چکی ہے۔ جہنم میں جائے فیملی ہمیں اپنی جنسی آزادی چاہیے۔''

تگڑا ہپی بولا۔ گھر کی چار دیواری آدمی کو مفلوج کر دیتی ہے۔ وہ ایک زنجیر سے بندھ جاتا ہے۔ ایک ڈوری ہے جو نظر نہیں آتی ہے مگر گھر کی چار دیواری میں رہنے والا آدمی جیل کی چار دیواری میں رہنے والے انسان سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔ شاید برتر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے پاؤں میں پڑی بیڑی کو نہیں دیکھ سکتا۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ آزاد ہے حالانکہ اس کے پاؤں میں ایک مضبوط ڈوری ہے جو اسے گھر سے بازار، دفتر، کارخانے، کھیت میں لے جاتی ہے اور سرِ شام گھسیٹ کر گھر لے آتی ہے۔ وہ آدمی کہاں رہا۔ وہ تو ایک مویشی ہے ہم ڈنگر نہیں رہنا چاہتے۔ ہم گھر نہیں بنانا چاہتے۔ ہم نے اس نظر نہ آنے والی رسی کو توڑ دیا ہے۔ ہم نے میاں بیوی کی زنجیر کو بھی توڑ دیا ہے۔ آج ہم یہاں ہیں، تو کل کہیں اور ہم کسی گھر کے برآمدے میں، کسی کھیت میں، کسی پیڑ کے نیچے، کسی ندی کے کنارے سو جاتے ہیں اور دوسرے دن پھر آگے چل دیتے ہیں۔ ہم نے گلیوں، سڑکوں، بلڈنگوں، لفٹوں، دروازے والے گھروں کی گھٹی فضا سے نجات پالی ہے اور بھالو یا چیتے کی سی آزادی حاصل کر لی ہے۔''

میں نے کہا۔''بھالو کا بھی ایک بھٹ ہوتا ہے۔''سارے کام بیکار اور بے فائدہ ہیں۔ ہر کام میں کسی دوسرے کا فائدہ زیادہ ہے، تمہارا اتنا بھلا کم ہے۔ اگر تم دن میں دس یونٹ کام کرتے ہو تو تمہارے حصے میں صرف ایک یونٹ آتا ہے۔ یہ صریحاً ناانصافی ہے۔

اس بے ہودہ منافع خوری سے ہم تنگ آ چکے ہیں۔ اس لیے ہم نے کام بند کر دیا ہے۔''

''پھر کون تمہیں روٹی دیتا ہے؟''

''ہمارے ماں باپ ہماری مدد کرتے ہیں اور اگر کبھی دو چار ماہ وہاں سے مدد نہیں آتی تو ہم لوگ بھیک مانگ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم لوگ کام بھی کر لیتے ہیں مگر انتہائی مجبوری کی حالت میں۔''

''دوسرے لفظوں میں تم لوگ دوسروں کی محنت پر زندہ رہنا چاہتے ہو۔''

''ہماری خواہشیں بہت کم ہیں۔ صرف ایک یونٹ، باقی نو یونٹ آپ لے جائیں، مگر ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔ کیا آپ لوگ ہمیں ایک یونٹ بھی نہیں دے سکتے۔ ہماری خواہشیں بہت کم ہیں ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔''

بڑے ہپی نے چھوٹے ہپی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ بڑے ہپی کے کرتے کی ایک آستین پھٹی ہوئی تھی اور اس میں سے اُس کی بھرے بالوں والی مضبوط بانہہ دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹا ہپی اس بانہہ پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر اپنی باریک ڈاڑھی کھجانے لگا۔

سامنے والی برتھ پر نیم دراز آدمی جو ہندی کا ایک اخبار پڑھ رہا تھا، اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور ہمسائے سے پوچھنے لگا۔

''کیوں صاحب، یہ غریبی کب ہٹے گی؟ غریبی ہٹاؤ کا نعرہ تو بالکل فراڈ رہا۔''

شیروانی والے صاحب بولے۔'' صاحب غریب بھی دن بھر کام کرتا ہے، دن بھر خوراک کی تلاش میں رہتا ہے۔ امیر آدمی بھی وہی کام کرتا ہے لیکن ایک پیچیدہ سطح پر شہروں کی گھٹی زندگی سے میں بھی تنگ آ چکا ہوں مگر کام کرنے کے حق میں ہوں۔ ہر آدمی کو صبح سے شام تک کام کرنا چاہیئے۔''

''کیوں؟'' چھوٹا ہپی کسی قدر غصے سے بولا۔ ایک دو سال ہی میں تو ہٹ نہیں سکتی، صدیوں کی غریبی ہے۔''

ہندی کا اخبار تہہ کر کے اپنی انگلی میں پڑی ہوئی سونے کی ایک بڑی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے دوسرے آدمی نے بڑے جارحانہ ڈھنگ سے کہا۔

''کیوں صاحب، جب غریبی ایک دو سال میں ہٹ نہیں سکتی، تو اندرا گاندھی نے

اس کا نعرہ کیوں لگایا تھا۔''

شیروانی والے صاحب۔''یہ نعرہ نہیں ہے۔ایک مطمع نظر کا اعلان ہے،اور اندرا گاندھی کی ہر بات کی مَیں حمایت نہیں کرتا۔لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر اندرا گاندھی یہ نعرہ نہ لگاتیں تو کوئی اور لگاتا اور اگر کل کو اندرا گاندھی اپنی گدی سے ہٹ جائیں تو بھی کسی نہ کسی کو یہی نعرہ لگانا پڑے گا اس لیے کہ یہ نعرہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ہمارے ملک میں غریبی کا گھیرا کتنا بڑا ہے اسے قابو میں لانے کی ضرورت ہے۔اس گھیرے کے دائرے کو بتدریج کم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام بتدریج ہی ہوسکتا ہے۔یورپ کو اپنی غریبی ہٹانے میں چار سو سال لگے۔امریکہ کو ایک سو سال سویت روس نے پچاس سال لیے کیونکہ سائنس اب بہت ترقی کر چکی ہے۔اب ہندوستان جیسے کثیر الآباد ملک کی غریبی بھی،تیس چالیس سال میں ہٹائی جاسکتی ہے۔اگر سائنسی طریقوں کو اپنایا جائے۔پنج سالہ پلان۔''

سونے کی انگوٹھی والا انسان جھلا کر بولا۔''اجی بھی پنج سالہ پلان فیل ہوچکے ہیں۔ شرح پیداوار کبھی تین فیصدی سے یا چار فیصدی سے زیادہ نہیں بڑھی۔اس شرح سے ہر سال آبادی بڑھ جاتی ہے۔نتیجہ صفر۔ہاں اگر شرح پیداوار چھ فیصدی سے نو فیصدی بڑھ جائے۔''

میں نے کہا۔''جاپان میں شرح پیداوار دس فیصد ہے اس لیے بڑھتی ہوئی آبادی کے باوجود وہ ایک امیر ملک بن چکا ہے۔ہم کو بھی اس حساب سے ترقی کرنی چاہیے۔''

سب باتیں ہی باتیں ہیں جناب۔ہم لوگ کام چور ہیں،کسی کو دیش کی فکر نہیں۔ سب کو اپنا گھر بھرنے سے فرصت ملے تو کبھی دیش کا بھلا سوچے۔بیکاری،مہنگائی،خویش پروری،رشوت ستانی نے ہمارے سماج کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔اب اس دیش کا بھگوان ہی مالک ہے۔

شیروانی والے صاحب مسکرا کر بولے۔''صاحب اس طرح سوچنے سے کچھ نہ ہوگا۔اتنی مایوسی بھی اچھی نہیں۔ہاں کمر کس کے کام کرنے کی ضرورت ہے۔آخر پچھلے بیس برسوں میں ہم بالکل بے کار ہی نہیں بیٹھے رہے ہم نے اپنے ملک میں ایک صنعتی بنیاد قائم کرلی ہے۔فولاد،تیل،موٹر،کھاد،کیمیکل،دوائیاں،بجلی الیکٹرانکس اور مشین بنانے کے کارخانے قائم کرلیے ہیں۔یہ سوچیے کہ انگریز کے وقت میں اس ملک میں ایک سوئی تیار

نہیں ہوتی تھی۔ اب ایک بہت بڑا Industrial Base تیار ہو چکا ہے۔ اس کو بھی ذہن میں رکھیے اور ہمت سے آگے بڑھنے کا سلیقہ لائیے۔"

مگر انگوٹھی والے آدمی کی تسلی نہیں ہوئی۔ منہ بنا کر انگوٹھی گھماتا رہا۔ یکا یک بولا۔

"یہ آپ کون سا رسالہ پڑھ رہے ہیں؟"

"یہ اُردو کا ایک رسالہ ہے۔"

"مگر اُردو تو پاکستانی زبان ہے۔ اس کا اس دیش میں کیا کام؟"

شیروانی والے آدمی کے چہرے پر ایک رنگ آیا ایک گیا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے چاندی کی ڈبیہ کھولی۔ اس میں سے مکھی پان کا ایک بیڑا منہ میں رکھا۔ بڑی متانت سے بولا۔

صاحب اُردو تو اسی دیش میں پیدا ہوئی۔ یہیں پلی بڑھی اس کی تاریخ تین سو برس پرانی ہے۔ جب پاکستان کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس زبان نے بڑے بڑے شاعر اور نثر نگار پیدا کیے ہیں۔ یہ ہماری سولہ قومی زبانوں میں سے ایک اچھی اور بڑی زبان ہے۔"

"مگر کیا آپ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ پاکستان نے اسے اپنی قومی زبان قرار دیا ہے اور یہ پاکستان میں کثرت سے بولی جاتی ہے۔"

"پاکستان نے اسے قومی زبان بنایا ہے تو اس سے اُردو کی طاقت اور خوبصورتی کا ثبوت ملتا ہے سری لنکا کے ایک حصہ کی زبان تامل ہے تو یہ امر تامل کے خلاف کیوں جائے۔ اس دنیا میں آدمیوں، نسلوں، قوموں، جاتیوں، مذہبوں کی درآمد برآمد ہوتی رہتی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک کی ایک زبان اپنے ملک سے باہر بھی اس قدر پسند کی جاتی ہے۔"

"نہیں جناب آپ بالکل غلط کہتے ہیں۔" انگوٹھی والا چلایا۔ "یہ پاکستان کی زبان ہے۔ مسلمانوں کی زبان ہے جب پاکستان بن گیا تو اس زبان کو بھی دیس نکالا دے دینا چاہیے۔"

شیروانی والے آدمی نے اپنی شیروانی کے تین بٹن کھولے۔ چاندی کی ڈبیہ کو بند کر کے جیب میں رکھا۔ پیک دان اُٹھا کر اس میں پیک گرائی۔ ان کاموں نے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں اُس کی بہت مدد کی۔ یہ تو اب ظاہر تھا کہ سامنے والا آدمی اس سے جھگڑا

کرنے پر تلا ہوا تھا۔ شیروانی والا آدمی اسے طرح دینا چاہتا تھا مگر اس بحث میں اپنے مقام سے ہٹنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"صاحب، تازہ مردم شماری کے اعتبار سے اس ملک میں چھ کروڑ مسلمان ہیں۔ ان میں صرف ڈھائی کروڑ اُردو بولتے ہیں۔ اس لیے یہ سارے مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ تازہ مردم شماری کے تحت اُردو بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ ہے۔ اس لیے ڈھائی کروڑ مسلمانوں کے علاوہ آدھے کروڑ کے قریب ہندو سکھ، عیسائی بھی یہ زبان بولتے ہیں۔ اس طرح سے بھی یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں قرار دی جا سکتی۔ اسے سب کی سانجھی زبان سمجھنا پڑے گا۔ دراصل زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ ہندی، گجراتی، تامل، اڑیا آسامی، بنگالی ان سب زبانوں کے بولنے والوں میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی ایک زبان کو کسی ایک مذہب سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس زبان کو دیش نکالا نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ زبان پاکستان سے یہاں نہیں آئی ہے۔ پاکستان والوں نے اُسے یہاں سے امپورٹ کیا ہے۔ ہندوستان کے تین کروڑ آدمی اسے اپنی مادی زبان سمجھتے ہیں۔"

"ان تین کروڑ لوگوں میں جاہلوں اور ان پڑھوں کی تعداد کتنی ہوگی۔" انگوٹھی والے آدمی نے ایک طنزیہ ہنسی ہنس کر کہا۔

"یقیناً" بہت زیادہ ہوگی مگر اسے صرف اُردو تک کیوں محدود رکھیے۔ ہندوستان میں ان پڑھ لوگوں یا کم پڑھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے صرف اُردو ہی نہیں ہر زبان میں ان پڑھوں یا کم پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یوں سوچا جائے تو پڑھے لکھوں کا تناسب ہر زبان میں ایک سا رہے گا۔ یعنی اگر تین کروڑ اُردو دانوں میں صرف تین لاکھ پڑھے لکھے ہوں گے تو پندرہ کروڑ ہندی والوں میں پندرہ بیس لاکھ اعلیٰ پائے کے پڑھے لکھے ہوں گے۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہوگا۔ اس لیے تناسب تو وہی بیٹھے گا اور آپ کی دلیل بیکار ہو جائے گی۔"

"اس زبان کا رسم الخط امپورٹڈ ہے۔ فارسی رسم الخط ہے۔ آپ اگر زبان نہیں بدل سکتے تو اس کا رسم الخط بدل دیجیے۔ یہ غیر ہندوستانی رسم الخط ہے صاحب۔"

''بلا شبہ ہم نے اس کا رسم الخط فارسی سے لیا ہے مگر اس میں ہم نے کئی تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ اپنی ہندوستانی ضروریات کے مطابق اس میں بھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ ڈھ، کھ، گھ، کی مختلف آوازیں اور ان کے مطابق حروف ڈھالے ہیں جو فارسی زبان میں نہیں ہیں اس لیے اب اسے فارسی رسم الخط نہیں کہا جائے۔ اسے اُردو کا رسم الخط کہنا چاہیے۔ اب تو کشمیری زبان میں بھی یہی رسم الخط ہے اور اس سے ملتا جلتا سندھی، زبان کا بھی یہی رسم الخط ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس گورمکھی کا رسم الخط ہے۔ تامل، ملیاتی، کنٹری، تلگو زبانوں کا رسم الخط دیوناگری سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے میں رسم الخط کی تبدیلی پر اصرار نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو اس ملک کے کلچر اور مزاج کی رنگارنگی ہے۔ جہاں بہت سی قومیں، بہت سی نسلیں، بہت سی زبانیں، بہت سے مذاہب اور کلچر آباد ہیں وہاں ایک سے زیادہ رسم الخط بھی ہیں اور میں تو اب ان سب کو ہندوستانی رسم الخط ہی سمجھوں گا۔''

''انگوٹھی والے حضرت بولے۔

''میرے خیال میں آپ مسلمان ہیں جبھی ایسی باتیں کر رہے ہیں۔''

شیروانی والے صاحب مسکرائے۔ انگوٹھی والے صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

''جناب میرا نام شیام کشن نگم ہے۔ خاکسار دہلی کا رہنے والا ہے۔'' پھر قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

''آپ کی تعریف۔''

انگوٹھی والے صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے...... دیر تک ہنستے رہے۔ نگم صاحب کو اچنبھا ہوا۔

''کیا صاحب میں نے آپ سے ایسا کون سا سوال کر لیا ہے۔ جس پر آپ کو اس قدر ہنسی آ رہی ہے؟''

انگوٹھی والے صاحب بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک بولے۔ ''معاف کیجیے گا صاحب۔ میں آپ کو مسلمان سمجھتا تھا اس لیے اُردو کے مسئلے پر آپ کو چڑانے کی کوشش کر کے اس بے لطف سفر میں کچھ دلچسپی پیدا کرنا چاہتا تھا مگر آپ کی سنجیدگی، متانت اور برد

باری سے پیش کی گئی دلیلوں نے میری اسکیم غارت کردی۔"

"وہ پھر ہنسنے لگے۔

نگم صاحب بولے۔"مگر آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔"

انگوٹھی والے صاحب بولے"خاکسار کو ضیاء الدین برنی کہتے ہیں۔"

اب نگم صاحب اور برنی صاحب دونوں حضرات کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں جوان سے دور بیٹھا ہوا تھا مگر ان کی بحث غور سے سن رہا تھا میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہا۔ نگم صاحب نے اپنی ڈبیہ کھول کر برنی صاحب کے آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔"لیجئے گلوری حاضر ہے۔

"شکریہ۔" کہہ کر برنی صاحب نے گلوری کلّے میں دبائی۔

یکا یک گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

ہم سب لوگ باہر دیکھنے لگے۔"کیا ماجرا ہے۔"

مگر باہر اِس قدر اندھیرا بڑھ چکا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔

چند منٹ بعد باہر سے فائر کی آواز آئی۔ پھر دو ڈاکو رائفلیں اُٹھائے خاکی لباس پہنے ہمارے ڈبے میں داخل ہوئے

فائر کی آواز سن کر ریکھا ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی۔

ڈاکوؤں نے اندر آ کر غور سے چاروں طرف دیکھا۔

ایک ڈاکو بولا ٹھاکر شیو چرن سنگھ کی بیوی ریکھا کون ہے؟"

ریکھا بولی۔"میں ہوں۔"

"تو نیچے اترو۔" دوسرا ڈاکو بولا۔

ڈبے میں سناٹا چھا گیا کوئی کچھ نہیں بولا۔

میں نے ڈاکوؤں سے کہا۔"یہ جیرا آباد اپنی سسرال جارہی ہے۔ یہ یہاں کیوں اترے گی۔"

"تم کون ہو؟"

میں نے کہا۔"میں اسے پہنچانے کے لیے جیرا آباد تک جارہا ہوں۔"

"تو تم بھی نیچے اُترو۔" ایک ڈاکو نے بڑی سختی سے مجھے اپنی رائفل سے ٹھوکا دیا۔

میں حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا مگر کوئی بول نہیں رہا تھا اور کوئی کہتا بھی کیا؟ سبھی نہتے تھے۔اس لیے سبھی خاموش تھے۔

''اترو۔''ایک ڈاکو نے ریکھا کو بازو سے پکڑ کر برتھ سے اُٹھا دیا۔

ریکھا نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔''ہاتھ چھوڑ دو، میں چلتی ہوں۔''

آگے آگے ریکھا اترنے کے لیے دروازے تک جانے لگی، پیچھے پیچھے میں، ہم دونوں کے پیچھے وہ دونوں ڈاکو بھی اتر گئے۔

اور جب ہم چاروں پٹری سے اتر کر کھیتوں کے قریب سے گزرنے والی ایک تاریک پگڈنڈی پر آگئے اور ڈاکوؤں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے تو چند منٹ کے بعد گاڑی بھی چلنے لگی۔تھوڑی دیر کے بعد سناٹا ہو گیا۔

☆☆☆

گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ہم لوگ خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔آہستہ آہستہ میدانی راستہ ختم ہونے لگا اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور ان کے پیچھے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں نمودار ہونے لگیں۔جن کی نوکیلی لکیریں کسی آرے کے دانوں کی طرح افق کے سینے میں چبھی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں اِکا دُکا درختوں کے کٹ آؤٹ جامد چوبداروں کی طرح باادب باملاحظہ کھڑے نظر آنے لگے اور راستہ تنگ پگڈنڈی کی صورت میں کبھی ریتلے ٹیلوں، کبھی چٹانوں، کبھی خاردار جھاڑیوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے گھومنے لگا۔

چلتے چلتے میں نے ریکھا کا ہاتھ پکڑ لیا۔اُس کا ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔دھیرے دھیرے وہ خوف زدہ لرزش ختم ہو گئی اور میرے ہاتھ کی حدت سے اُس کا ہاتھ ملائم ہوتا گیا۔نرم پڑتا گیا اور آخر میں موم کی طرح کسی گہرے جذبے میں پگھل گیا۔مجھے ایسا لگا جیسے میرے اور اس کے ہاتھ میں صدیوں پرانے جذبوں کا سنگم ہے۔جو ہر عہد میں آ کر نئے ہو جاتے ہیں۔

دو ڈاکو آگے چل رہے تھے۔پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر دو ڈاکو ہمارے پیچھے آرہے تھے۔کوئی پچاس گز کا فاصلہ رکھ کر، آگے پیچھے جدھر بھی دیکھو، دو موہوم سائے گہری تاریکی میں اور زیادہ گہرے دھبوں کی طرح نظر آتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے ریکھا کے کان میں کہا۔ ''آگے چل کر جہاں میں مناسب سمجھوں گا تمہارا ہاتھ زور سے دبا دوں گا۔ تم تیزی سے میرے ساتھ ساتھ چلی آنا۔''

ریکھا نے ہوا سے بھی مدہم سرگوشی میں کہا۔ ''وہ لوگ ہمارے آگے پیچھے دونوں طرف ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آگے اور پیچھے ضرور ہیں۔ دائیں اور بائیں نہیں ہیں اور راستہ پہاڑی ہوتا جا رہا ہے اور کبھی کبھی کسی موڑ پر ہمارے آگے پیچھے چلنے والے نظر نہیں آئیں گے۔ بس وہ موقع ہوگا۔''

ریکھا چپ ہوگئی ہم دونوں خاموشی سے چلتے گئے۔ کوئی آدھے گھنٹے کے بعد باقاعدہ پہاڑی راستہ شروع ہوگیا اور جنگل گھنا ہوتا گیا۔ میری آنکھیں آہستہ آہستہ اندھیرے کی عادی ہوگئی تھیں اور میں ہر لحظہ موقعے کی تلاش میں تھا۔ مگر پہاڑی راستہ شروع ہوتے ہی چاروں ڈاکوؤں نے اپنا فاصلہ دونوں طرف سے کم کر دیا تھا اور ہمیں ہر وقت نظر میں رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ ہمیں اس راستے سے اجنبی سمجھ کر اس علاقے کو بالکل اپنا سمجھ کر ضرورت سے زیادہ خوداعتماد تھے۔

بالآخر ان کی یہی حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی ہمارے کام آئی ایک ایسا تیز کٹاؤ والا موڑ سامنے آیا جہاں پر آگے اور پیچھے دونوں طرف سے آنے والے ڈاکو اس موڑ کے دونوں طرف سے اوجھل ہوگئے تھے مگر یوں صرف چند لمحوں کے لیے رہے گا اور صرف اگلے چند لمحوں میں مجھے فیصلہ کر لینا ہوگا۔ موڑ کے اوپر کی چڑھائی عمودی معلوم ہوتی تھی اتنے جلدی سے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیچے ڈھلان تھی۔ ممکن ہے گہری کھڈ ہو۔ کتنی گہری اس کا اندازہ رات کے اس گہرے اندھیرے میں نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے جلدی سے ریکھا کا ہاتھ دبایا۔ ریکھا ایک دم چوکنی ہوگئی۔ ہم دونوں بائیں کونے سے نیچے کھڈ میں کود گئے۔

پہلے چند ثانیے تک ایسا لگا جیسے ہوا میں معلق ہیں۔ پھر خوش قسمتی سے ہم دونوں زمین پر بچھی ہوئی دبیز پتوں والی ایک گھنی جھاڑی میں جا گرے۔ ایک خرگوش جو اس جھاڑی میں چھپا بیٹھا تھا، گھبرا کر کان کھڑے کر کے جنگل کے اندر بھاگا۔ میں نے ریکھا کا

ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر جنگل کے اندر گھس گیا۔

اب ہمارے پیچھے پیچھے آوازیں آ رہی تھی۔ شور بڑھ رہا تھا۔ ہم اس شور اور اپنے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ بڑھا دینا چاہتے تھے اس لیے تقریباً دوڑنے کی رفتار سے جنگل کے اندر گھس رہے تھے۔ پھر پیچھے پگڈنڈی پر روشنی نظر آنے لگی اور اس کی لرزتی ہوئی چمک درختوں کے پتوں اور تنوں پر پڑنے لگی۔

اتنے میں شاید ڈاکوؤں نے معلوم کر لیا تھا کہ ہم لوگ موڑ کے اوپر نہیں بھاگے تھے بلکہ نیچے کی طرف ڈھلان پر کود گئے تھے۔ اب اُنہوں نے بھی ہمارے ڈھونڈھنے کے لیے یہی راستہ اختیار کر لیا تھا مگر اب ہمارے اور ان کے درمیان ایک ڈیڑھ منٹ کا فاصلہ تو تھا ہی۔

پھر بھی میں نے اندازہ لگایا کہ۔ ہمارے لیے یہ جنگل نیا ہے اور ان کے لیے برسوں کا دیکھا ہوا۔ وہ بہت جلد ہمیں آلیں گے۔ کیا کرنا چاہیے۔ دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ آگے پیچھے دیکھ کر میں نے پیڑوں کے ایک گھنے جھنڈ کا انتخاب کیا اور سرگوشی میں ریکھا سے پوچھا۔

''کیا تم درخت پر چڑھ سکتی ہو؟''

ریکھا نے دھیرے سے کہا۔ ''ہاں۔''

''تو اس درخت پر چڑھ جاؤ۔'' میں نے ایک گھنے پیڑ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک بلی کی طرح اس درخت پر چڑھ گئی اور اوپر کی گھنی شاخوں میں غائب ہو گئی۔

چند لمحوں کے بعد میں بھی اسی پیڑ پر چڑھنے لگا۔ بازو بھی چھلے اور ٹانگیں بھی۔ کیونکہ درخت پر چڑھنے کا عادی نہ تھا، پھر بھی کوشش کرکے میں کامیاب ہو گیا اور ریکھا کے قریب ایک شاخ پر جا بیٹھا۔ دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا اور سانس بھی پھول گیا تھا۔

بس یوں سمجھئے کہ مشکل سے آدھے منٹ کا فرق رہا ہوگا، اتنے میں ڈاکو اس کنج کے آس پاس روشنی پھیلاتے ہوئے گزر گئے۔ مگر یہ جھنڈ اس قدر گہرا تھا اور ہم اتفاق سے اتنے گہرے پتوں میں چھپے ہوئے تھے کہ ان کی روشنی ہم پر نہ پڑ سکی۔ چند منٹ وہ اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر آگے چلے گئے۔ چند لمحوں کے بعد جنگل میں سناٹا چھا گیا اور جھلملاتی روشنیوں کے گم ہو جانے کے بعد تاریکی اور گہری ہوتی گئی۔

''بچ گئے۔'' ریکھا نے اطمینان کا سانس لیا۔

''بچ تو گئے مگر اندھیرے میں جائیں گے کہاں؟ راستہ تک معلوم نہیں۔''

ریکھا بولی۔ ''جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکو ایسے بے وقوف نہیں۔ اُنہوں نے کسی ایک ساتھی کو پیچھے بھیجا ہوگا۔''

ریکھا بولی۔ ''تو رات بھر اسی پیڑ پر بیٹھے رہیں گے۔'' صبح نیچے اتر کر راستہ تلاش کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''صبح ان لوگوں کو بھی ہمیں ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔''

ریکھا چپ ہوگئی۔

قدرے توقف کے بعد بولی۔ ''تو تم کیا چاہتے ہو؟''

ہم دونوں دو قریب کی شاخوں پر بیٹھے بہت دھیرے دھیرے گفتگو کر رہے تھے۔

اس کا سوال سن کر میں نے سوچ کر کہا۔

''ابھی تو میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ ہم دونوں اس گاڑی سے سفر کر رہے ہیں؟ ان لوگوں کو بتانے والا کون تھا؟''

ریکھا بولی۔ ''ہو نہ ہو یہ ساری کارستانی ان دونوں کارندوں کی ہے۔ ممکن ہے ان کا کوئی مخبر شیارا کی سرائے میں بیٹھا ہو اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو اور اس نے ہمارا پیچھا کیا ہو اور اس نے ممکن ہے ڈاکوؤں کو بتایا ہو ورنہ اور کون ہو سکتا ہے؟''

مگر اُنہوں نے ایسا کیوں کیا۔''

''ہو سکتا ہے راوت آزاد ہو چکا ہو۔ ہو سکتا ہے راوت کے کہنے پر ایسا کیا ہو۔ ہو سکتا ہے راوت ابھی تک قید میں ہو مگر اس کی نظر بندی کارندوں کو بری لگی ہو اور اُنہوں نے انتقام لینے کے لیے ایسا کیا ہو۔''

میں سوچتا رہا۔ ریکھا کی دلیل میں وزن تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی معقول وجہ مجھے بھی نہیں سوجھی مگر جو کچھ بھی ہو معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔ پیچھے وہاں سربھنگی کی وادی میں کیا ہو رہا تھا؟ عجیب سے وسوسے میرے دل میں اٹھنے لگے۔ شاید ہم دونوں کو اتنی جلدی وہاں سے نہیں آنا چاہیے تھا۔ سرو جا دیوی خطرے میں تھی۔

جب میں نے ریکھا سے اپنے وسوسوں کا اظہار کیا تو وہ گہری اداسی سے بولی۔ ''تم چاہتے تو وہیں رہ سکتے تھے مگر میرے لیے مزید رکنا ممکن نہیں تھا تم میرے خاوند کو نہیں جانتے۔ اس نے مجھے واپس آنے کی جو تاریخ دے رکھی تھی۔ اس تاریخ کو میرا واپس پہنچنا ضروری تھا ورنہ وہ میری کھال ادھیڑ دیتا۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں رکھا بھی کیا ہے۔ کھال ہی تو وہ ادھیڑتا ہے تمہاری اور کرتا کیا ہے؟

ایک کھٹکا سا ہوا۔ کوئی جنگلی جانور نیچے جھاڑیوں سے گزرتا ہوا بھاگا۔ پھر خاموشی۔ پھر اس خاموشی میں یکا یک کسی گھونسلے میں کسی پرندے کے پھڑ پھڑانے کی آواز۔ دور کہیں کوئی گیدڑ بولا۔ پھر اس کے ساتھ دو چار اور گیدڑ مخالف سمت سے آوازیں دینے لگے۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں جھاڑیوں میں چھپے بینڈوں کی آواز تیز ہو گئی مگر اس آواز کا ردم خاموشی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا جیسے خاموشی اس آواز کی لے پر دھیرے دھیرے سانس لے رہی ہو۔

سوچ سوچ کر میں نے ریکھا سے کہا۔ ''دن چڑھنے سے پہلے ہمیں واپس شپارا پہنچ جانا چاہیے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں کا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ دن کی روشنی کے بجائے رات کا اندھیرا ہمارے لیے زیادہ محفوظ رہے گا اس لیے ہمیں جتنا بھی سفر کرنا ہے رات کے اندھیرے میں طے کر لینا چاہیے ورنہ دن کی روشنی میں ہم پکڑے جائیں گے۔''

ریکھا بولی۔ سب سے اچھی بات یہ ہوتی کہ اگر تمہیں جیرا آباد جانے کا راستہ معلوم ہوتا۔ اونٹوں کا راستہ تو مجھے معلوم ہے مگر اس وقت ہم کہاں ہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''تو پھر تو یہی بہتر ہے کہ واپس شپارا چلا جائے۔ دھیرے دھیرے دیکھتے ہوئے سنبھل کر جائیں گے ریکھا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

''تو پھر نیچے اترو واپس جانے کا ڈھنگ سوچتے ہیں۔''

ریکھا احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ نیچے جا کر دھم سے پتوں پر اترنے کی آواز آئی۔ پھر میں اُس کے پیچھے پیچھے اترا۔

نیچے اتر کر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ڈاکو ریکھا کے منہ پر ہاتھ رکھے اُس کے دونوں بازوؤں کو اپنے ایک ہاتھ میں جکڑے کھڑا ہے اور ریکھا جدوجہد کر رہی ہے۔ جب میں اترا تو اسی لمحے دوسرے ڈاکو نے رائفل کی نالی میرے سینے پر رکھ دی۔

☆☆☆

اس کے خشونت آمیز چہرے پر گھنی بھنویں تھیں اور ان کے نیچے لال لال ڈورے والی آنکھیں، تنگ پیشانی، موٹے ہونٹ اور مضبوط فراخ سینہ اور کانوں سے نیچے رخساروں تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے گل مچھے اور رسی کی طرح بٹی ہوئی گھنی مونچھ۔ وہ سر سے پیر تک پیشہ ور ڈاکو دکھائی دیتا تھا۔ اس کے جسم کو دیکھ کر لگتا تھا کہ پانچ آدمیوں کی طاقت اس اکیلے کے جسم میں ہے۔ دائیں بائیں اس کے دو لیفٹیننٹ تھے اور وہ اس سے زیادہ ظالم اور تیز مزاج کے معلوم ہوتے تھے۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے، تم جا سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں اس لڑکی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

وہ بولا۔ ”یہ لڑکی بیاہتا ہے۔ جیرا آباد کے ٹھاکر شیون چرن سنگھ سے بیاہی ہے۔ ٹھاکر اس کو چھڑا سکتا ہے۔ تم اس کے پاس میرا سندیسہ لے کر جا سکتے ہو۔“

”کیسا سندیسہ؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے پچیس ہزار روپے چاہئیں۔ ان روپوں کے عوض میں اسے آزاد کر سکتا ہوں۔ تم میرا سندیسہ لے کر جا سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے جیرا آباد کا راستہ معلوم نہیں ہے۔“

وہ بولا۔ ”میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ لے جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ممکن ہے ٹھاکر میری بات کا بھروسہ نہ کرے۔“

وہ بولا۔ ”اسے کرنا ہوگا۔ وہ تمہارے ساتھ بے ہتھیار یہاں تک آ سکتا ہے پچیس ہزار روپے دے کر وہ اپنی بیوی کو چھڑا کر لے جا سکتا ہے۔ ان دونوں کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر جیرا آباد تک جانے دیا جائے گا اور تم چاہو تو آج ہی واپس جا سکتے ہو۔ اس معاملے میں

مت پڑو۔ میں خود ٹھا کر اطلاع کر دوں گا۔"

میں نے ریکھا کی طرف دیکھا۔ ریکھا کی آنکھوں میں ایک پل کے لیے بجلی سی چمکی، پھر بجھ گئی۔ اس نے آنکھیں جھکا لیں مگر اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی، اور لگتا تھا کہ بہت مضطرب ہے۔

میں نے اُس سے کہا۔ "میں اکیلے میں ریکھا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کر لو۔" وہ بڑی نرمی سے بولا۔ "میں آدھے گھنٹے بعد آ جاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ غار سے باہر چلا گیا۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ باہر نکلنے کی ہر کوشش بے کار ہوگی۔ غار کے باہر کڑا پہرہ تھا اور ہمارے فرار کی پہلی کوشش کے بعد وہ لوگ ہم پر ایک منٹ کے لیے بھروسہ نہیں کریں گے۔

جب وہ تینوں ڈاکو باہر چلے گئے۔ تو میں نے ریکھا سے پوچھنا چاہا مگر میرے پوچھنے سے پہلے وہ بڑی سختی سے سر ہلا کر بولی۔

"تمہارا جانا بے کار ہوگا۔ میرا پتی میرے لیے ایک پیسہ خرچ نہیں کرے گا۔"

"کیوں نہیں کرے گا؟"

وہ دیر تک خاموش رہی پھر جھجک کر بولی۔ "ایک اور عورت ہے۔ وہ بھی چابک کھاتی ہوگی۔"

"کیا معلوم چابک کھاتی ہے یا مارتی ہے۔ مگر ایک خونخوار ناگنی ہے اور میرا پتی اُس کے پنجے میں ہے۔ وہ ناگنی اس موقعے کو غنیمت جانے گی۔"

"کوشش کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟"

"کوشش بے کار ہوگی۔" ریکھا گہری افسردگی سے بولی۔ "وہ مجھ پر ایک دھیلہ نہیں خرچ کرے گا۔ الٹا تم پر شبہ کرے گا۔ میں اپنے پتی کو جانتی ہوں۔"

"پھر بھی اس کے ساتھ رہتی ہو۔"

"مجبوری ہے مگر ان باتوں کا اس وقت ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟" اب سب کچھ ختم ہے۔" وہ سسکی لینے لگی۔

"کچھ ختم نہیں ہے۔" میں نے اُسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری اماں

کے پاس جاسکتا ہوں۔''

وہ بولی۔''میری اماں کے پاس اب کیا رکھا ہے۔ایک پرانی حویلی ہے اور زمین۔ تھوڑے سے زیور گھر میں مشکل سے تین چار روپے ہوں گے اس کے پاس۔ پچیس ہزار روپے کہاں سے آئیں گے؟ نہیں نہیں اب کچھ نہیں ہوسکتا۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔''حویلی بیچی جاسکتی ہے۔ زیور بیچے جاسکتے ہیں۔ زمینیں فروخت کی جاسکتی ہیں۔کیا ماں اپنی بیٹی کے لیے اتنا بھی نہیں کرے گی؟''

ریکھا بولی۔''زیور بے شک بیچے جاسکتے ہیں۔انہیں شپارا کا کوئی ساہوکار خرید لے گا مگر وہ بھی مشکل سے تین چار ہزار کے ہوں گے۔ رہ گئی حویلی تو جنگل میں کھڑی حویلی کون خریدے گا۔ وہی خریدے گا جو زمین خریدنا چاہے گا مگر اس کا گاہک۔'' وہ یکا یک چپ ہوگئی۔

میں نے کہا۔''اگر تمہارا پتی یہ رقم نہیں بھرے گا اور تمہاری ماں بھی نہیں بھر سکتی تو میں یہ رقم بھر دوں گا۔''

''تم کہاں سے بھرو گے؟''

میرے سوٹ کیس میں جو شپارا اسٹیشن پر پڑا ہے، تیس ہزار روپے بند ہیں وہی رقم میں فارم خریدنے کے لیے لایا تھا۔ وہی رقم میں یہاں بھر دوں گا۔''

''تم ایسا کرو گے۔'' ریکھا کی آواز بھرا گئی۔

''ہاں۔''

''تم ایسا کیوں کرو گے؟'' ریکھا کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ وہ بڑی کمزور آواز میں بولی۔

میں نے بڑی حسرت ناک نگاہوں سے اُسے دیکھا اُس نے بڑی گہری نگاہوں سے مجھے ایک پل کے لیے دیکھا۔ دوسرے لمحے میں اُس کی پلکیں رخساروں پر گر گئیں۔

پھر بہت دیر تک ہم دونوں میں سے کوئی نہیں بولا۔

ریکھا نے میری طرف نہ دیکھتے ہوئے زمین پر نگاہیں ڈالتے ہوئے اور اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدتے ہوئے کہا۔''مگر میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔''

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"پھر بھی تم۔" وہ گھٹ کر رہ گئی۔ فقرہ بھی مکمل نہیں کر پائی۔

"ہاں پھر بھی میں وہی کروں گا جو اس وقت تم سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ دیر تک انگوٹھے سے مٹی کریدتی رہی۔ جیسے انجانے جذبوں کے ڈھیر میں کسی روشن انگارے کو ڈھونڈھ رہی ہو، مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ڈاکو غار میں آ گئے۔

بڑے ڈاکو نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ "میرے ساتھ کسی ڈاکو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ راستہ میں نے اس لڑکی سے پوچھ لیا ہے۔ میں اس کے پتی سے پچیس ہزار روپے لے کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" بڑا ڈاکو سر ہلا کر بولا۔ "تم چاہو آج ہی رخصت ہو سکتے ہو۔ میں ٹھیک سات دن تک تمہارا انتظار کروں گا، اور یہ لڑکی ہمارے پاس رہے گی۔"

مگر اس کا کیا بھروسہ ہے کہ اس کی عزت محفوظ رہے گی۔" میں نے بے دھڑک اُس سے پوچھا۔

"یہ ڈاکو شان سنگھ کا وچن ہے۔" بڑا ڈاکو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اس کی جان محفوظ نہیں ہے مگر اس کی عزت محفوظ ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں پریشان ہو کر بولا۔ "جان محفوظ نہ ہونے کا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے؟" ڈاکو شان سنگھ مجھے سمجھانے لگا۔ "اگر تم سات دن کے اندر اندر رقم لے کر واپس نہ آئے تو میں سات تک تمہاری راہ دیکھوں گا اس کے بعد اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔"

"نہیں، نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

شان سنگھ ہنس کر بولا۔ "اگر ہم ایسا نہ کریں تو کوئی ہمیں ایک پیسہ نہ دے اپنے پیشے کا پابند ہونا پڑتا ہے۔"

میں کچھ کہنے والا تھا کہ یکایک ایک آدمی غار کے اندر آیا۔ اسے داخل ہوتے دیکھ

کر میں چونک گیا۔

یہ رونق سنگھ تھا۔

داڑھی بڑھی ہوئی۔ ڈاکوؤں کے سے خاکی کپڑے مگر میلے اور سلوٹوں سے بھرے ہوئے چہرہ مضطرب اور پریشان۔ اس نے میری طرف دیکھا نہیں۔ وہ اس قدر اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا کہ شاید وہ اس دنیا میں موجود نہ تھا۔

''کیوں۔'' شان سنگھ نے اسے پوچھا۔ تمہاری بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا؟''

''لڑکا تو مانتا ہے مگر ساوتری نہیں مانتی۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر جیسا آپ کہیں۔''

''میں کیا کہوں۔'' شان سنگھ بولا۔ ''تم نے مجھ سے مدد مانگی میں نے ان دونوں کو ڈھونڈ کر تمہارے حوالے کر دیا۔ اب ان دونوں کی زندگی کے تم مالک ہو، جیسا چاہے کرو۔''

''دونوں جان سے جائیں گے۔'' یکایک رونق سنگھ بپھر کر بولا۔

پھر اس کی نظر مجھ پڑی۔ پھر ریکھا پر ایک دم چونکا سا رہ گیا۔ اس کے منہ سے نکلا ''ارے۔''

میں نے کہا۔ ''تسلی رکھو۔ یہ لڑکی تمہاری ساوتری نہیں ہے۔ ریکھا ہے۔''

رونق سنگھ بولا۔ ''اگر میں ابھی ساوتری سے بات کر کے نہ آرہا ہوتا تو مجھے پورا یقین ہو جاتا کہ یہ لڑکی ساوتری ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے پہل مجھے بھی دھوکا ہوا تھا۔''

''مگر کس قدر ان دونوں کی صورتیں ملتی ہیں۔''

''مگر یہ مشابہت سطحی ہے۔'' میں نے کہا۔

شان سنگھ نے رونق سنگھ سے پوچھا۔ ''تم نے کیا فیصلہ کیا؟''

رونق سنگھ بولا۔ ''لڑکے کو باہر ایک پیڑ سے باندھ دیا ہے۔'' ساوتری کے سامنے اسے گولی مار دوں گا۔''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' مجھ سے شان سنگھ نے کہا۔ ''تم بھی چلو تاکہ تمہیں یقین

ہو جائے جو ہم کہتے ہیں وہ کر گزرتے ہیں۔"

غار کے جنوب میں تھوڑا ہموار علاقہ تھا۔ چھدرے چھدرے ڈھاک کے پیڑ تھے۔ ایک پیڑ سے میں نے ایک نوجوان کو بندھے دیکھا۔ اونچی کھڑی گردن پر فراخ پیشانی والا چہرہ، رنگت سرخ و سپید۔ بالوں میں سنہرے پن کی جھلک، ہاتھ پاؤں صاف ستھرے مگر شہری لڑکا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں والوں کی سی معصومیت اُس کے چہرے پر تھی اور آنکھوں میں محبت کا غرور۔ رونق سنگھ نے کہا۔ "ساوتری کو بلواؤ۔"

مگر اس سے پہلے ہی دو ڈاکو ساوتری کو پکڑے چلے آ رہے تھے۔ ساوتری کا چہرہ فق تھا اور نگاہیں دھواں دھواں۔ وہ نگاہیں کسی ایک جگہ نہیں پڑتی تھی۔

پیڑ سے بندھے ہوئے نوجوان کے چہرے پر پٹی بندھی تھی۔

رونق سنگھ نے رائفل سیدھی کی اور بولا۔ "درشن سنگھ اپنے بھگوان کو یاد کر لو۔"

درشن سنگھ بولا۔ "رائفل چلاؤ، زیادہ باتیں مت کرو۔"

رونق سنگھ نے کہا۔ "اگر تم ساوتری سے دست بردار ہوتے ہو تو میں تمہاری جان بخشی کر سکتا ہوں۔"

درشن سنگھ کہنے لگا۔ "میں ساوتری سے تو دست بردار ہو سکتا ہوں مگر اس کی محبت سے نہیں۔ وہ تو آخری دم تک میرے دل میں رہے گی۔"

رونق سنگھ نے دانت پیس کر رائفل سیدھی کر کے نشانہ باندھ کر کہا۔ "تو پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

یکا یک ساوتری ایک ڈاکو سے ہاتھ چھڑا کر بھاگی اور دوڑتی ہوئی پیڑ سے بندھے نوجوان کے سینے سے لگ گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

رونق سنگھ نے گرج کر کہا۔ "ساوتری سامنے سے ہٹ جا۔"

وہ تو اور بھی زور سے اس نوجوان سے چمٹ گئی۔ شرربار نگاہوں سے رونق سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "مارنا ہے تو ہم دونوں کو اکھٹے مار ڈال۔ چلا گولی۔

رونق سنگھ کی شست بندھی رہی۔

کئی لمحے گزر گئے۔

''چلا گولی دیکھتا کیا ہے؟'' ساوتری چلا کر بولی۔

رونق سنگھ نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دو گے تو میں تم دونوں کی جان بخش دوں گا۔''

''ایسے جینے سے موت اچھی ہے چلا گولی۔'' ساوتری کے لہجے میں بڑی حقارت تھی۔

''آخری دفعہ تم سے پوچھتا ہوں، کیا تم اس لڑکے کو چھوڑ کر مجھ سے شادی کرو گی؟''

''کبھی نہیں۔'' ساوتری نے گہری شدت سے کہا۔

ہم دونوں سانس روکے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ رونق سنگھ کے چہرے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی لڑائی چل رہی ہے۔ یکا یک اس کے ہونٹ بھینچ گئے اور جبڑا تن گیا۔

گلوگیر لہجے میں بولا۔

''تو پھر تم دونوں مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''بس مرنے سے پہلے ایک بات پوری کر دو۔'' نوجوان نے کہا۔

''کیا ہے؟''

''میری آنکھوں سے پٹی اُتار دو۔''

''پٹی اُتارنے سے تمہارا بھلا کیا ہو گا؟'' رونق سنگھ نے اُس سے پوچھا۔

''میں ساوتری کو آخری دم تک دیکھ سکوں گا۔''

''چپ رہو بدمعاش۔'' رونق سنگھ نے گرج کر کہا۔

دھیرے دھیرے اُس نے رائفل اونچی کی ساوتری بالکل درشن سنگھ کے آگے آ چکی تھی۔

شان سنگھ نے ہنس کر کہا۔ ''آج تمہارا امتحان ہے رونق ایسا نشانہ باندھو کہ گولی اس لڑکی کے سینے سے نکل کر لڑکے کے سینے سے پار ہو جائے ایک ہی گولی دونوں کی جان لے لے۔''

رونق نے ٹھیک رائفل برابر سطح پر اُٹھائی نشانہ باندھا۔ اُس کا سارا چہرہ پسینے میں ڈوب چکا تھا ہونٹ کانپ رہے تھے۔

شان سنگھ بولا۔

"ایک......

دو......

تین......

چار......

مگر گولی نہیں چلی۔ دھیرے دھیرے رائفل نیچے آتی گئی۔ اس کے پاؤں پر گر گئی۔

رونق سنگھ نے مڑ کر گلوگیر لہجے میں کہا۔

"شان سنگھ ان دونوں کو جانے دو۔"

یکا یک رونق سنگھ اپنی رائفل اُٹھا کر اسے گلے سے لگا کر رونے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، جیسے ساری دنیا میں اس رائفل کے سوا اس کا اور کوئی رشتے دار ساتھی، سمبندھی نہ رہ گیا ہو۔

☆☆☆

"تم نے ان دونوں کو مارا کیوں نہیں؟"

اب ہم دونوں ڈاکوؤں کے علاقے سے نکل کر شپارا کی طرف جا رہے تھے۔ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے میں اور رونق سنگھ۔

رونق سنگھ دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ "کچھ تصویروں نے روک دیا۔"

"وہ کون سی تصویریں تھیں۔"

بڑی بڑی آنکھیں کاجل لگاتی ہوئیں۔ میلے کے سٹال پر کسی کے سڈول ہاتھ چوڑیاں پہنے ہوئے، وہ آئینوں والا سرخ لہنگا ہوا میں اڑتا ہوا اور کسی بے باک پرندے کی طرح، وہ ہنستی ہوئی ہوا میں اڑتی ہوئی، عجیب سی تصویریں تھیں۔ جب بھی میں شست باندھتا وہ تصویریں میرے سامنے آجاتیں۔ ان تصویروں نے مجھے ہرا دیا۔

رونق سنگھ نے رائفل سے ایک پتھر کو ٹھوکا دیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

"مگر تم شان کے پاس پہنچے کیسے؟"

"شان سنگھ میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم دونوں آٹھ جماعت تک اکٹھے پڑھے۔ پھر بڑا ہو کر میں فوج میں بھرتی ہو گیا۔ شان سنگھ ڈاکو بن گیا۔ میں غصے میں تو بھرا ہوا تھا۔

اپنے گاؤں سے آ کر سیدھے اپنے دوست کے پاس گیا۔ اس سے کہا۔ ''میں ڈاکو بننا چاہتا ہوں۔ وہ بولا کیوں؟ میں نے اسے پوری بات بتا دی وہ بولا۔ ''ہمارے یہاں جو آدمی گینگ میں داخل ہوتا ہے اسے ایک خون کرنا پڑتا ہے۔ میں بولا۔ میں ایک نہیں دو خون کرنے پر تیار ہوں۔''

شان سنگھ نے پوچھا۔ ''دو خون کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''اگر تم ساوتری اور اُس کے ساتھ بھاگے ہوئے درشن سنگھ کو ڈھونڈ دو گے تو میں تمہارے سامنے ان دونوں کا خون کر کے تمہارے گینگ میں شامل ہو جاؤں گا۔''

اس بے چارے نے دن رات کر کے درشن اور ساوتری کو ڈھونڈ نکالا میں ساوتری سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس بے وفائی کے بعد بھی اس سے شادی کے لیے تیار تھا۔ مگر وہ دونوں کسی طرح ایک دوسرے کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے۔ آخر میں مَیں نے اپنی بندوق اُٹھائی مگر۔ ان تصویروں سے ہار گیا۔ کبھی کبھی آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہار جاتا ہے۔''

''مگر تم سپاہی ہو اور سپاہی کے لیے بندوق چلانا کیا مشکل ہے۔''

''سپاہی صرف دشمن پر بندوق چلا سکتا ہے اور وہ لوگ میرے دشمن نہ تھے۔ وہ لوگ...... وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ اُن کے سامنے کوئی تیسرا نہ تھا۔ نہ دوست نہ دشمن میں خود اُن کی نگاہوں میں مکمل اجنبی تھا۔ اتنا اجنبی جتنا کسی ویران سنسان جگہ پر اُگا ہوا کوئی اجنبی پیڑ۔ پتا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جو تم کہہ رہے ہو۔ وہ میں سب سمجھ رہا ہوں۔''

''سنو۔'' یکا یک وہ رک گیا اور مجھے پکڑ کر اُس نے روک دیا۔

''سنو۔ وہ چلا کر بولا۔ ''ایک سپاہی ایک مکمل اجنبی پر کیسے گولی چلا سکتا ہے شان سنگھ مجھ پر ہنس رہا تھا میں اسے گولی سے اڑا سکتا تھا مگر وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ اس نے مجھ سے بڑی حقارت سے کہا۔ تم ڈاکو بننے کے لائق نہیں ہو مگر میں جانتا ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ بدقسمت ضرور ہوں۔''

میں نے پوچھا...... ''اب تم کیا کرو گے؟''

وہ بولا۔ ''سپاہی ہوں۔ واپس اپنی رجمنٹ میں چلا جاؤں گا۔ اگلی لڑائی میں تم کبھی

پڑھ لو گے۔ صوبیدار میجر رونق سنگھ فرنٹ پر بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔"

وہ ایک تلخ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ حالانکہ اس ہنسی میں مجھے آنسو نظر آئے۔ مگر میں نے بات کا رخ پلٹنے کی خاطر اُس سے کہا۔ "نہیں تم زندہ رہو گے اور پھر محبت کرو گے۔"

وہ بولا۔ "محبت تو بس ایک دفعہ ہوتی ہے۔ باقی سب سمجھوتے ہوتے ہیں۔"

باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ وہ شاید اب میرے قریب سے جا چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ نہیں چل رہا تھا۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ کبھی کبھی آدمی ہوتے ہوئے موجود نہیں ہوتا ہے اور قدم اُٹھاتے ہوئے غائب رہتا ہے اور سانس کی آمدورفت کے باوجود زندگی سے آگے بڑھ جاتا ہے اب میں نے اس سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ وہاں موجود نہ تھا۔

☆☆☆

میں لکیج آفس میں اپنا سوٹ کیس کھولا۔ کپڑوں کی تہوں کے نیچے ایک بھورے رنگ کا لفافہ رکھا تھا۔ اس میں تین ہزار روپے تھے۔ وہ لفافہ موڑ کر جیب میں رکھا۔ سوٹ کیس بند کیا لکیج آفس کے کلرک کو پانچ روپے کا نوٹ دے کر ہدایت کی ممکن ہے مجھے واپس آنے میں کئی دن لگ جائیں۔

اسے میرے سوٹ کیس کو سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ اس نے احتیاط کا وعدہ کیا۔ چہرے پر پانچ روپے والی مسکراہٹ تھی۔

پھر میں واپس چلا۔ رونق سنگھ کی مہربانی سے مجھے واپس جانے کا راستہ تو معلوم ہو چکا تھا۔ پھر ایک دن شپارا میں رہنے سے مجھے یہ احساس بھی ہو چلا تھا جیسے کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے کسی کو دیکھا تو نہیں لیکن ایک سائے کی طرح یا چھلاوے کی طرح اس کا احساس رہا۔

واپس جنگل میں پہنچ کر انکل سے ایک طرف چلنے لگا۔ مشکل سے سو گز اندر چلا تھا کہ قدموں کی چاپ محسوس کی۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک ڈاکو سٹین گن ہاتھ میں لیے میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ گمان یقین میں بدل گیا۔ ضرور کسی نے میرا پیچھا کیا ہے۔

وہ ڈاکو کو میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا مگر کچھ بولا نہیں۔ راستے میں اگر میں کہیں

بھٹک جاتا وہ فوراً آگے چل کر میری رہنمائی کر دیتا۔ کچھ دور جانے کے بعد اُس نے مجھ سے کہا۔ ''اب یہاں سے تمہاری آنکھ پر پٹی بندھے گی۔''

میں نے انکار نہیں کیا۔ اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ باقی راستہ اسی طرح ہم دونوں نے طے کیا۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ جب پٹی کھلی تو شان سنگھ کے سامنے تھا۔

''رقم لائے ہو۔'' شان سنگھ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پچیس ہزار کے نوٹ اسے گن کر دیئے۔ جب اُس کی تشفی ہوگئی تو اُس نے میرے ساتھ آنے والے ڈاکو سے کہا۔ ''ریکھا کو رہا کر کے اس کے حوالے کر دو۔ اور ان دونوں کو احتیاط اور حفاظت سے جنگل کی آخری حد تک چھوڑ آؤ۔''

☆☆☆

ڈاکو واپس چلے گئے تھے اور اب ہم دونوں اکیلے ایک پہاڑی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ راستے بھر ریکھا نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

جب ڈاکو چلے گئے تو میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ میرے ساتھ چلتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ہے۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کوئی جوابی رو نہیں ہے، جیسے کچھ عرصے کے لیے اس نے جذبے کو واپس کھینچ لیا تھا۔

ایک پتلی ندی، چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں پر بہنے والی سست رفتار ندی کو پار کر کے ہم نے کھانا کھایا...... پانی پیا۔ وہ دیر تک ندی کنارے ہاتھ منہ دھوتی رہی اور آنکھوں پر چھینٹے مارتی رہی جیسے آنکھوں کے آگے کوئی غبار چھا گیا ہو جسے وہ دھونے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ ندی کے قریب ایک ٹیلے پر املتاس کا ایک درخت کھڑا تھا اس کی چھاؤں میں آ کر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی آئی اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔

میں اس کے بالوں سے کھیلنے لگا۔
تھوڑی دیر کے بعد اُس نے گھٹے لہجے کا۔ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لو۔

☆☆☆

پہاڑی سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور گھنا جنگل بھی اب ہم اونچے اونچے ٹیلوں کی وادی میں تھے جو خشک خاردار جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھی۔ کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے ریگزاروں میں اونٹ کے قدموں کے نشان دکھائی دے جاتے۔

ریکھا بولی۔ ''اونٹوں کا راستہ آ گیا۔ اب راستے میں کوئی اونٹ والا مل گیا تو میں اس کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی۔''

''کیا یہ راستہ جیرا آباد کو جاتا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

اُس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جیرا آباد ابھی دور ہے۔ اس ریتلے علاقے کو پار کر کے وہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں والا جنگل آئے گا۔ وہ دیکھتے ہو نا۔''

''ہاں۔''

اس کا پار کر کے دوسری طرف کی وادی میں جیرا آباد کا قصبہ ہے۔ مگر میں تمہیں وہاں تک نہ لے جاؤں گی۔ کسی اونٹ والے کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ کوئی اونٹ والا نہ ملا تو اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ پہاڑوں کے اِدھر کی وادی تو میری اپنی وادی ہے۔ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر گھر بھی قریب ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں میں تمہیں قصبے کے باہر تک چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں، نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''ممکن ہے وہ باہر کھیتوں تک آیا ہو۔ میرے ساتھ وہاں تک نہ جانا۔ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ بڑا ظالم ہے۔ سارے علاقے کے لوگ اس سے تھر تھر کانپتے ہیں۔''

''نہیں میں ساتھ چلوں گا۔'' میں نے بڑی سختی سے کہا۔

وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ ''نہیں، یہ میری عزت کا سوال ہے۔''

مجھے یاد آیا۔ دو گھنٹے پہلے اس ندی کے کنارے وہ میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی اور میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر اپنا گال اُس کے گال پر رکھ دیا تھا۔ پھر میرے ہونٹ

اُس کے ہونٹوں میں گھل گئے تھے اور جب بے قرار ہاتھ اُس کے سینے کو چھونے لگے اور اُس کی کرتی کے بٹن کھولنے لگے تو اُس نے ایک دم میرے ہاتھوں کو پرے کر کے سسکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''بابو مجھے کلنک مت لگانا۔''

اور میں نے اُسے چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں اُس کی کشمکش سمجھ چکا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی میری بانہوں کی گرفت سے آزاد ہو کر کوئی فیصلہ کرے پھر بھی میں نے اُس سے کہا تھا۔

''کیا تم محبت کو کلنک سمجھتی ہو؟''

اُس کی کرتی کا ایک بٹن کھل گیا تھا اور اُس کے سینے کے اُبھار تو گرفتار طائر کی طرح چولی میں مچل رہے تھے۔ میری نگاہوں کا رخ دیکھ کر اُس نے جلدی سے اپنی اوڑھنی سینے پر لے لی اور بولی۔ ''چلو دیر ہو رہی ہے۔''

راستے بھر عجیب سی بے چینی رہی۔ ادھ کہی باتیں، ادھ سنے نغمے، نامکمل ملن، ٹوٹتی تصویریں، ریزہ ریزہ جذبے، جانے زندگی کس خطرناک موڑ پر آ پہنچی ہے۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ سفر کدھر لے جائے گا۔ یہ لڑکی کیا چاہتی ہے۔ اس کی زندگی کے دھارے کا رخ کدھر ہے۔ کیا میں اس دھارے میں بہہ کر پار اتر جاؤں گا؟ منجدھار میں ڈوب جاؤں گا۔ ریکھا اب میری زندگی کی ریکھا بن چکی تھی۔

ٹیلوں والے ریگزاروں میں گھومتے راستے پر کوئی اونٹنی سوار نہ ملا۔ گلہریاں، سٹلے، سانپ، جنگلی خرگوش تو ملے مگر اونٹ والا کوئی نہ ملا اور ہم تپتے راستے پر سفر کرتے رہے۔ پھر پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور درختوں کے گھنے سایوں میں گرمی سے کسی قدر نجات ملی۔ کوئی ایک گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ایک دوراہا ملا۔ ایک راستہ اندرونی علاقے کو جاتا تھا جہاں دور تک چھوٹی لائن کی پٹری چمک رہی تھی۔ دوسرا راستہ ایک اونچے پہاڑ کے اوپر ہو کر جاتا ہے۔

یہاں آ کر ریکھا رک گئی۔ ''اب میں یہاں سے اکیلی چلی جاؤں گی۔''

''کیوں؟''

''یہاں سے گھر بہت قریب ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ موڑ کاٹ کر میں اس پہاڑی کے اوپر پہنچ جاؤں گی۔ دوسری طرف کھلی وادی ہے اور جیرا آباد کا قصبہ۔ بس تم یہاں تک آسکتے ہو۔ اس کے آگے نہیں۔ تمہارا راستہ یہ میدانی علاقے کا راستہ ہے۔ سیدھا شپارا کو جاتا ہے۔ میں اپنے راستے پر جاؤں گی، تم اپنے راستے پر وعدہ کرو۔'' اس نے مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''وعدہ کرتا ہوں مگر میرا کیا ہوگا؟''

وہ بولی۔ ''تم شپارا سے سیدھے میری اماں کے گھر چلے جانا۔ میں تین دن کے بعد واپس آجاؤں گی۔ پھر تم جہاں کہو گے تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔''

میرے دل میں خوشی کی ایک لہر اُٹھی، اور رگ رگ میں سما گئی۔

''سچ کہتی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

میں نے اسے گلے لگالیا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ایک دوسرے کی بانہوں میں رہے۔ پھر بہ دقت تمام وہ مجھ سے الگ ہو کر بولی۔

''اچھا اب جاؤ...... جاؤ۔''

''پہلے تم جاؤ۔''

اس نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ محبت سے چھڑایا اور اپنے راستے پر چلی۔ ڈگمگاتی چلی۔ میں نے دوڑ کر اسے پیچھے سے جالیا اور اسے اپنی بانہوں میں اُٹھالیا...... اور بھینچ لیا۔

وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ ''اب کیا مار ہی ڈالو گے۔ دم رک رہا ہے۔''

یکا یک میری گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے اپنے آپ سے الگ کیا اور اُس سے منہ پھیر کر بولا۔

''تمہیں دیکھتا رہوں گا تو پھر دوڑ کر اُٹھالوں گا۔ اس لیے میں منہ پھیر کر کھڑا رہتا ہوں، تم جلدی سے چلی جاؤ۔''

''اچھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

وہ سانس جیسے پھیل کر پہاڑوں، جنگلوں، ریگزاروں، ٹیلوں، ندیوں، ساری

کائنات میں پھیل گئی۔ چند منٹ کے بعد جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو ریکھا وہاں سے جا چکی تھی۔ صرف اُس کی ٹھنڈی سانس میرے چاروں طرف پھیل پھیل کر مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی، جیسے ریکھا کائنات میں گھل کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہو۔

''ریکھا۔'' میں ایک دم چلا اُٹھا، مایوسی سے، اور اس کے راستے پر دوڑا۔ دور تک اس راستے پر دوڑا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ دوڑتے دوڑتے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ دوسری طرف کی وادی گھنے جنگلوں اور اونچے اونچے ٹیلوں سے بھری پڑی تھی مگر مجھے نہ ریکھا نظر آئی نہ جیرا آباد کا قصبہ۔ شاید ریکھا کسی چھوٹی پگڈنڈی سے آگے نکل گئی تھی۔ شاید جیرا آباد کا قصبہ اس گھنے جنگل کا اوٹ میں ہوگا۔

میں مایوس ہو کر واپس لوٹا۔ واپس دوارہے پر پہنچ کر اترائی کا راستہ لیا۔ چلتے چلتے راستے میں ایک اونٹ والا ملا۔ اس سے شپارا جانے کا کرایہ طے کر کے اونٹ پر بیٹھ گیا، کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اگر کوئی ریت کا ٹیلہ چلنے لگے تو بالکل اونٹ کی چال چلے گا۔ میرے سامنے اونٹ کا کوہان تھا۔ کچھ ایسا لگا جیسے انسان کی ساری زندگی ہی ایک کوہان ہے۔ ٹیڑھی میڑھی پیچیدہ، محبت سے بھاگ کر آیا تھا۔ محبت میں گرفتار ہو بیٹھا، زندگی تیری کون سی کل سیدھی؟

☆☆☆

شپارا پہنچ کر میں دو دن سرائے میں پڑا رہا۔ سوچا وہ تو تیسرے دن آئے گی۔ میں دو دن پہلے سربھنی جا کر کیا کروں گا؟ اس وادی میں جا کر ایک عجیب سی وحشت کا احساس ہوتا تھا۔ جی ڈولنے لگتا تھا۔ ٹھیک ہے جس دن ریکھا آئے گی اس دن جاؤں گا۔

دو دن سرائے میں پڑا رہا۔ صبح شام لمبی لمبی سیروں نکل جاتا تھا کہ شپارا میں دیکھنے کی کون سی چیز تھی ایک سڑا بُسا پسماندہ سا قصبہ۔ سینکڑوں برس پرانے ماحول میں ڈوبا رہا۔ اپلے، ننگے بچے اور خاک میں لوٹتے ہوئے گدھے۔

تیسرے دن ابھی پو پھٹی نہ تھی کہ رات کے تیسرے پہر سربھنی کی طرف چل پڑا۔ تیسرے پہر کی خنکی میں سفر کرنا آسان رہتا ہے خصوصاً جبکہ پیدل سفر کیا جائے۔ راستے پیڑ، چھپر، ٹیلے سب شبنم میں ڈوبے ہوئے ایک تاریکی میں دھندلے دھندلے سے، سانس روکے ہوئے دھبوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

چلتے چلتے راستہ بھول گیا۔ تیسرے پہر کی نیم تاریکی میں راستہ کچھ ٹھیک سے یاد نہ رہا۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ دھولیا گاؤں کب راستے میں آتا ہے اور کہاں؟ دھولیا گاؤں بھی راستے میں کہیں نظر نہ آیا۔ نہ وہ ندی جو اس دن کسی بپھرے ہوئے جذبے کی طرح چڑھی ہوئی تھی۔

ہاں جب پو پھٹی اور سورج نکلا تو میں نے دیکھا کہ میں سربھنی کے پلاٹو پر ہوں۔ چاروں طرف جھاڑیاں اگی تھیں۔ کہیں کہیں پر درختوں کے جھنڈ اور پلاٹو سے پرے سربھنی کا پہاڑی سلسلہ۔ دھیرے دھیرے انکل سے ادھر چلتا گیا، جدھر درختوں کے ایک گھنے جھنڈ کے ادھر سروجا دیوی کی حویلی تھی۔

گھنٹے بھر کے سفر کے بعد میں نے اس گھنے جھنڈ کو پہچان لیا جو اب میری نگاہوں کے اُفق پر تھا جس کے دوسری طرف وہ حویلی تھی۔ وہاں سروجا دیوی ہوں گی۔ جانے اُنہوں نے راوت کی کیا درگت بنائی ہوگی۔ جانے راوت نے کیا چال چلی ہوگی۔ سروجا کا پختہ مخمور حُسن یاد آنے لگا۔

کچھ بھی ہو آج ریکھا اس وادی میں آئے گی، گویا میرے دل میں آجائے گی۔ میں آج ہی اسے لے کر اس وادی سے نکل جاؤں گا۔

ریکھا کا خیال آتے ہی میرے دل میں خوشی کی پھریریاں سی آنے لگیں اور میرے قدم خود بخود مست ہوتے گئے۔

چند منٹ کے بعد میں اس پیڑوں کے کنج میں جھنڈ پار کر کے جب میں دوسری طرف نکلا تو چند ثانیے کے لیے سکتے میں رہ گیا۔

وہاں کوئی حویلی نہیں تھی۔

☆☆☆

آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ جس جیتی جاگتی، صحیح وثابت حویلی کو چند دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا، وہاں اب ایک کھنڈر تھا۔ برسوں پرانا اور شکستہ اور آدھا جلا ہوا۔ آدھی دیواریں ڈھے چکی تھیں اور ان میں جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ ایک دیوار کو توڑ کر وہ پیپل کا ایک بڑا درخت اُگ آیا تھا جس کا تنا چند دن میں تو اتنا موٹا نہیں ہوسکتا تھا۔ کیا میں کہیں اور تو نہیں آ گیا۔

نہیں۔ مگر یہ تو وہی درختوں کا جھنڈ ہے، وہی جگہ ہے آس پاس کے ٹیلے، ڈھلوانیں وہی ہیں جو میں چند روز پہلے اپنی آنکھوں سے دیکھ گیا تھا۔ پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ دیر تک اس دو منزلہ حویلی کو تلاش کرتا رہا۔ سربھنی کے پلاٹو میں بہنے والی ندی تو مل گئی۔ ہاں وہی ندی ہے مگر وہ حویلی کہاں چلی گئی۔ وہ کھیت کدھر گئے۔ لگتا تھا برسوں سے اس پلاٹو پر کاشت نہیں ہوئی ہے۔

گھوم گھام کر پھر اسی جلے ہوئے کھنڈروں میں پہنچا۔ دیر تک سر پکڑ کے بیٹھا رہا مگر یہ گتھی کسی طرح نہ سلجھی، پھر وہاں سے اٹھا اور شکار گاہ کی جانب چل دیا۔

مگر جہاں پر شکار گاہ ہونی چاہیے تھی وہاں پر کوئی شکار گاہ نہیں تھی۔ کوئی باغ یا باغیچہ نہ تھا۔ کوئی باؤلی نہیں تھی۔ چاروں طرف ویرانہ، جھاڑ جھنکار اور جنگل میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ دل میں ایک عجیب سی دہشت سی بیٹھنے لگی۔

میں واپس کھنڈروں میں گیا اور وہاں سے سمت کا اندازہ کرکے کواڑی کے قلعے کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے کواڑی قلعے میں پہنچ گیا۔ قلعے کو پہچان کر سکون سا ہو گیا ہاں تو میں یہاں آیا تھا۔ یہی قلعہ ہے۔ وہی اس کے کھنڈر مگر جیسے کھنڈر میں نے دیکھے تھے اس پر بہت پرانے اور بہت ہی شگفتہ نقش و نگار تھے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں ریکھا کھڑی تھی مگر وہاں کوئی بیری کا جھاڑ نہ تھا، چند سوکھی جھاڑیاں خشک پتوں کی جٹائیں پھیلائے کھڑی تھیں۔

یکا یک میں بے اختیار زور سے چلایا۔ ”ریکھا، ریکھا۔“

میری آواز قلعے کی شکستہ فصیلوں سے ٹکرا کر اور گونج کر واپس لوٹ آئی۔۔ میرا دل بھر آیا۔ پھر ایک گہرے سناٹے میں جیسے کوئی میرے دل میں کہنے لگا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی نہیں ہے۔“

میں اُٹھ کر بھاگا۔ دور تک بھاگتا چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میں کہاں بھاگ رہا ہوں اور کدھر؟ کون سی میری منزل ہے اور کدھر کو میرا سفر ہے میں دیر تک بھاگتا رہا۔ دوڑتا رہا چٹانوں سے میرے گھٹنے چھل گئے اور خاردار جھاڑیوں کے کانٹے میرے تلووں میں اتر گئے۔ میرا سارا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا مگر میں دوڑتا ہی رہا۔

سہ پہر کے بعد میں سربھنی کے پلاٹو کی اترائی اتر کر اس ندی کے کنارے پہنچ چکا

تھا۔ جو میں نے اور ریکھا نے اس خطرناک حالت میں پار کی تھی مگر اب یہ ندی قریباً سوکھی پڑی تھی اور اس کے سوکھے پتھروں میں پانی کی ایک پتلی دھار بہتی تھی۔

ندی پار کر کے کھجوروں کے ایک گھنے کنج کے پار اِدھر دھولیا گاؤں تھا مگر کدھر تھا وہ دھولیا گاؤں۔

یہاں کوئی چوحدی نہیں تھی۔ کوئی گاؤں نہیں تھا، کوئی زمین کاشت کے قابل نہیں تھی۔ یہاں پر صرف ایک چرواہا تھا جو پیڑوں سے گھری ڈھلوان پر بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا، بڈھا چرواہا۔ ٹھیک سفید داڑھی اور گہری اداس آنکھیں جنہوں نے زندگی کی ہر سلوٹ دیکھی تھی۔ میں نے اس چرواہے سے کہا۔

''رام رام بابا۔''

''رام رام۔'' وہ صدیوں کے سوئے ہوئے لہجے میں بولا۔ آواز میں گہرا سکون تھا اور ابدی طمانیت اور وہ اپنی سفید داڑھی اور ہاتھ میں لاٹھی لیے ہوئے چرواہے سے زیادہ کوئی فرشتہ معلوم ہوتا تھا۔

''بابا۔'' میں نے پوچھا۔ ''ادھر سر بھنی میں ایک دو منزلہ حویلی تھی۔ سروجا دیوی کی۔ وہ کیا ہوئی؟''

''کب کی بات کرتے ہو؟'' چرواہے نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

''چند دنوں کی بات ہے، میں وہاں ٹھہرا تھا۔''

''پگلے ہوئے ہو۔ وہ حویلی تو ستر اسی برس ہوئے ایک رات جل گئی اور اس میں رہنے والے بھی سب جل کر مر گئے۔ ایک بھی نہیں بچا۔ یہ کوئی ستر اسی برس پہلے کی بات ہے۔ جب میں لڑکا تھا۔''

کھڑے کھڑے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہوں میں زمین آسمان گھومنے لگے۔

جب میں نے اپنے احساس پر قابو پا لیا تو سورج مغرب میں جا رہا تھا اور چرواہا اپنے ریوڑ کو سمیٹ رہا تھا۔

میں نے بڑی منت وسماجت کے لہجے میں اس بوڑھے چرواہے سے کہا۔ ''بابا

تمہیں کچھ یاد ہے، اس سروجا دیوی کی ایک لڑکی ہوتی تھی؟''

''ہاں وہ بڈھا لاٹھی ٹیکتا ہوا بولا'' ریکھا اُس کا نام تھا۔ وہ ادھر تمہاری پیٹھ کے پیچھے اُس کی سمادی ہے۔''

''سمادھی؟'' یکا یک میں نے مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔

بڈھا، میرے ساتھ سمادھی تک گیا، بہت پرانی سمادھی تھی، شکستہ اور کائی لگی۔ ذرا فاصلے پر برگد کا ایک پیڑ تھا ورنہ اس سمادھی کے دور دور تک کوئی جھاڑی نہ تھی چاروں طرف ریت اڑتی تھی۔

''سمادھی؟'' جیسے یہ لفظ میرے گلے میں اٹک گیا ہو۔

''ہاں بیٹا۔'' وہ بڈھا بڑی افسردگی سے بولا۔'' وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی مگر وہ عین جوانی میں ستی ہوگئی۔''

''ستی؟''

''ہاں زبردستی ستی کرادی گئی۔ اس کے خاوند کو شبہ ہوا۔ ریکھا پر کلنک لگنے کا شبہ تھا۔ وہ ڈاکوؤں کے پنجے سے آزاد ہوئی اور جس نے اُسے آزاد کرایا تھا، وہ کوئی اجنبی تھا جس نے ڈاکوؤں کو پچیس ہزار روپے دے کر اُسے چھڑایا تھا اس لیے اس پر کلنک لگایا گیا۔''

بڈھا چپ ہوگیا۔

''پھر کیا ہوا۔''

''ایک رات وہ اپنی پتی کے گھر سے نکل بھاگی۔ اپنے میکے جا رہی تھی کہ اس کے پتی نے اُس کا تعاقب کیا اور اُسے اس جگہ پر آلیا اور اسی جگہ پر اُسے زندہ جلا کر ستی کر دیا گیا؟''

''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''ہو گئے کوئی ستر اسی برس۔ ان دنوں میں لڑکا سا تھا مجھے سب یاد ہے۔''

''یہ کیسے ہوا؟'' یہ کیسے ہوا؟ میرا سر چکرانے لگا، کیا یہ سب کچھ میرے سامنے نہ ہوا تھا۔ کیا چشم غیب نے مجھے یہ تماشہ دکھایا تھا۔ وہ وقت الٹا بھی بہہ سکتا ہے۔ علم نجوم ہمیں بتاتا ہے کہ اگر کوئی راکٹ میں بیٹھ کر روشنی کی رفتار سے اڑے اور اس زمین سے دو ہزار نوری سال کے فاصلے پر چلا جائے تو وہ آج سے دو ہزار سال پہلے کے واقعات دیکھ سکے گا۔ وہ

دیکھ سکے گا مسیح کو دار چڑھتے۔ وکرما کو اپنے نورتنوں کے ساتھ دربار لگاتے، کالیداس کو شکنتلا لکھتے۔ کیا یہی سب تو میرے ساتھ نہیں ہوا تھا مگر میں کس راکٹ پر اڑ کر کہاں گیا تھا۔ میں تو اسی زمین پر موجود تھا۔

تو شاید یہ سب کچھ عالم خواب میں مجھ پر گزرا تھا۔ شاید میں چلتے چلتے دم لینے کی خاطر کواڑی قلعے کی کسی دیوار سے لگ کر سو گیا تھا اور چشم غیب نے مجھے یہ تماشہ دکھایا۔ شاید انسانی دماغ میں کچھ ایسے خلیے موجود ہیں جو نہ صرف آنے والے مستقبل کو پکڑ سکتے ہیں بلکہ گزرے ہوئے واقعات کی ذہنی تصویر بھی اتار سکتے ہیں۔ شاید جو کچھ گزرتا ہے وہ مرتا نہیں ہے۔ ہمارے آس پاس دھندلے دھندلے نقوش کی صورت میں خواب جیسی لطیف حالت میں موجود رہتا ہے۔ وہ واقعات ابھی ابھی خلا میں گھوم رہے ہیں۔ وہ تصویریں ابھی بھی کہیں چل رہی ہیں۔ وہ آوازیں ابھی بھی فضا میں بکھری ہیں اور چکر لگا رہی ہیں۔ شاید کوئی چھٹی حس رکھنے والا احساس دماغ کا اینٹینا، ٹی وی کی لہروں کی طرح اُنہیں گرفت میں لے کر دماغ کی سکرین پر لا سکتا ہے۔

ہائے مگر میں کیسے مانوں۔ ابھی تک میری بانہوں میں اس کے بدن کا لوچ، میرے سانس میں اس کے سانس کی گرمی اور میرے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کا شہد باقی ہے۔

میں دیوانہ وار اُس کی سمادھی سے لپٹ گیا اور چلا چلا کر اُسے بلانے لگا۔

"ریکھا...... ریکھا۔ !"

آنسو میری آنکھوں سے اُبل پڑے اور میری مضطرب بانہیں اس کی سمادھی کو ٹٹولنے لگیں۔

بڈھے چرواہے نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت سے بولا۔

"بیٹا۔ اُٹھو۔ چلو۔ رات کو یہاں کوئی نہیں رہتا۔"

میں آنسو پونچھ کر اُٹھ بیٹھا۔ سورج اُفق کے آخری دہانے پر تھا۔ یکا یک شفق کی سرخ کرنوں میں سمادھی کا رنگ لال ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ریکھا کی چتا پھر سے جل رہی ہے۔

پھر سورج ڈوب گیا ہوا کا ایک مرغولہ آیا اور سمادھی پر ریت ہی ریت بکھیرتا چلا گیا۔

''چلو اب یہاں سے چلو، رات آنے والی ہے۔ رات کو یہاں کوئی نہیں رہتا۔''

میں نے آخری بار ایک حسرت ناک نگاہ ریکھا کی سمادھی پر ڈالی اور بڈھے کے ساتھ چل پڑا۔ بار بار مڑ کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ وہ سمادھی بھی ایک موڑ پر آ کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شاید چشم غیب نے مجھے بتایا تھا کہ شہروں سے جنگل کی طرف بھاگ نکلنے سے بھی زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ جنگلوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں بھی زندگی کے وہی پرابلم ہیں۔ وہی سازشیں، خون، قتل، غارت گری، دولت اور زمین کا لالچ، محبت اور نفرت، زندگی ہر جہت سے جیتی ہے، اس سے فرار ممکن نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ تجھے جنگل میں کوئی انسان نہ ملے۔ ایک بھالو تو ملے گا اور بھالو کی بھی اپنی ایک زندگی ہوتی ہے۔ انہیں سمجھے بغیر تو جنگل میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی ہر آن تیرا پیچھا کرے گی۔ تو زندگی سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

اس لیے میں نے شپارا جنکشن پہنچ کر کلکتے کی ٹکٹ کٹالی اور آبھا سے ملنے کے لیے روانہ ہوگیا۔